الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت وطباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱۔۵۰

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار وحقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت وطباعت جاذب نظر۔ کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۳ صفحے قیمت: ۸۰

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی [illegible] کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت طباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ حجم ۴۲ صفحے قیمت ۶

منیجر

جلد ۳ | ماہ شوال المکرم تا ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۸ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

شذرات

دو بزرگ مہمان

جنوری کے پہلے ہفتہ میں، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد صاحب بی۔ اے ایڈیٹر صدق، دارالمصنفین کے جلسہ انتظامی کی شرکت کے لئے اعظم گڈھ تشریف لائے تھے۔ ناظم صاحب مدرسۃ الاصلاح کی دعوت پر ان بزرگوں نے ۸ جنوری ۱۹۳۸ء کی سہ پہر میں مدرسۃ الاصلاح کو بھی اپنے قدوم سے عزت بخشی۔ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگ مہمانوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ راقم سطور نے ایک مختصر تقریر کی، ہمارے دوست مولوی محمد یحییٰ صاحب نے اس موقع کے لئے ایک نظم لکھی تھی وہ نظم پڑھی گئی اس کے بعد مولانا شروانی نے ایک وعظ فرمایا۔ مولانا نے پہلے اس مدرسہ اور اس کے مقدس بانیوں کے ساتھ اپنے قدیم تعلقات کو یاد دلایا۔ اس کے بعد طلبہ و اساتذہ کو مخاطب کرکے ایک دلنشین اور موثر وعظ فرمایا۔ اس وعظ میں حضرت جنید و حضرت شبلی کے واقعات فقر و تصوف کے ساتھ ساتھ انھوں نے مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ کی عزیمت، استغنا، اور شغف قرآن کے بعض ایسے سبق آموز واقعات سنائے جن سے وہ ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ ان واقعات کا حاضرین پر نہایت اچھا اثر پڑا۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے کسی تحریر یا تقریر سے پہلے ہی معذرت فرما دی تھی، اس لئے ان کو زحمت نہیں دی گئی، البتہ طلبہ نے ان کے سامنے اپنے دارالمعلومات کے معائنہ کا رجسٹر دستخط کے لئے پیش کیا۔ موصوف نے مثنوی کا مشہور شعر "صد کتاب و صد ورق در نار کن" الخ لکھکر اس کو اپنے دستخط سے زینت بخشی۔

مدرسہ اور دائرہ کا ایک خاموش خادم

مدرسہ اور دائرہ حمیدیہ دونوں نہایت غریب ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کا بھروسہ اور کچھ مخلصین کی خاموش اعانت

ان کا اصل سرمایہ ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے شکرگذار ہیں کہ انہی خاموش خادموں کی مدد سے یہ چل رہے ہیں اور انشاء اللہ چلتے رہیں گے۔ ان ہمدردوں کا ذکر ان صفحات میں محض اس لئے بہت کم ہوتا ہے کہ ممکن ہے انکا اخلاص اس چرچے کو پسند نہ کرے لیکن آج بہ قصد اظہار و مدحت نہیں بلکہ محض بطور تحدیث نعمت الٰہی ہم اپنے مخدوم جناب شیخ سلیمان صاحب مرزاپوری (حال مقیم رنگون) کا ذکر ضرور کریں گے جنھوں نے مدرسۃ الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت کو اپنی زندگی کا اصلی مقصد قرار دے لیا ہے۔ گذشتہ سالوں میں انھوں نے مدرسہ اور دائرہ کی جو امدادیں کی ہیں ان کا ذکر کبھی کبھی اشارۃً ان صفحات میں ہوا ہے۔ اس سال انھوں نے دائرہ اور مدرسہ کے مختلف شعبوں کو جو رقمیں دی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

دائرہ حمیدیہ کے لئے	۱۰۰
تعمیر دار الاقامہ جدید کے لئے	۲۴۰
مد عام اغراض	۲۰۰

موصوف کوئی لکھ پتی سیٹھ نہیں ہیں۔ صرف دل غنی رکھتے ہیں اور اپنی محنت کی کمائی کے پیسے قرآن کی خدمت اور اپنی قوم کی تعلیم پر خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسے مخلص ہمدرد [illegible] رفاقت کے لئے بخشے ہیں تو اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ اس خدمت پر ثابت قدم رہنے کی توفیق بھی بخشے۔ سب کچھ اسی کے خزانے سے ملتا ہے۔ اس پر ہمارا یقین ہے اور یہ یقین بھی اسی نے بخشا ہے۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ سطریں لکھ کر ایک خاموش نیکی کا چرچا کیا جائے لیکن اس زمانہ میں جب کہ علم دین کی خدمت کے لئے لوگوں کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں، آدمی کن چیزوں سے تسلی حاصل کرے؟ اسی جذبہ سے مجبور ہو کر یہ سطریں قلم سے نکل گئی ہیں۔ اگر شیخ صاحب نے اس کو برا نہ مانا تو یہ بھی ان کی فیاضیوں میں سے ایک فیاضی ہوگی جو ان کی شریف ذات سے بعید نہیں۔

دائرہ کے معاونین میں دو ناموں کا اضافہ ہوا ہے، ہم ان دونوں دوستوں کے دل سے شکرگذار ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالرزاق صاحب اصلاحی مدرس مدرسہ اسلامیہ ضلع بلیا۔ ۲۔ مولوی حکیم محمد عزیر صاحب اصلاحی۔

ایک نعمتِ عظیم

یہ ایک عجیب بدقسمتی ہے کہ دنیا میں جب کبھی کوئی اصلاحی انقلاب رونما ہوا تو مذہبی جماعتوں نے عموماً طاقت و اقتدار کا ساتھ دیا، انقلاب کی رہنمائی اور غور و پرداخت کیلئے قدم عزیمت نہیں اٹھایا، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف طاقت و اقتدار کے ساتھ انقلاب کی رو میں وہ خود بھی بہہ گئیں اور ان کے ساتھ ساتھ مذہب بھی غائب ہوگیا۔ دوسری طرف خود انقلاب بھی چونکہ اس کو کوئی صحیح جماعت تربیت کیلئے نہیں ملی، بدمزاج اور چڑچڑا ہوگیا اور آہستہ آہستہ اس نے پرانی برائی کی جگہ ایک نئے فتنہ کی شکل اختیار کرلی جن لوگوں نے انگلستان، نیدرلینڈ، فرانس، اور روس وغیرہ کے انقلابات کی تاریخ پڑھی ہے وہ اس بات سے واقف ہیں۔ جدید انقلابات میں سے ترکی اور ایران کی مثالیں بھی اس ذیل میں پیش کیجا سکتی ہیں۔ روسی پادریوں نے انقلاب کا مقابلہ کرنے کیلئے نظام جاگیرداری (فیوڈل سسٹم) اور کنیسہ کے اتحاد کا ایک سد سکندری قائم کیا تھا۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ کنیسہ کے قدیم روحانی اثرات نے کچھ دنوں کیلئے اصلاح پسندوں کے عام ملک کو دبا دیا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یسوع مسیح جو غریبوں کے لئے آسمانی بادشاہت کا پیام لیکر آیا تھا آج اس کے جانشین غریبوں کو برباد کرنیوالوں کے ہاتھوں میں ہتھیار کا کام دے رہے ہیں تو ان کی آنکھیں کھلیں اور پھر جو انقلاب کا طوفان اٹھا تو کنیسہ، نظام جاگیرداری، اور حکومت سب اسکے زور میں پارہ پارہ ہوگئے۔ ع نہ نادر بجا ماند و نے نادری۔
یہ دنیا کی پھیلی ہوئی تاریخ میں سے چند اشارات ہیں۔ ان کو خوب سمجھ لیجیے اور حافظہ کی مدد سے ان کو نگاہوں کے سامنے پوری طرح پھیلا لیجیے۔

اس عموم میں صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان میں جو بیداری پیدا ہوئی، اسمیں ہماری مذہبی جماعت برابر پیش پیش رہی، اور اس باب میں ہم کو یقیناً حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے اکابر (اللہ تعالیٰ سب کی قبر ٹھنڈی رکھے) کا ممنون ہونا چاہیے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ مستثنیٰ حالت صرف انہی بیدار مغز اکابر کے صدقہ سے ہمارے حصہ میں آئی اور پھر ہم کو شکرگذار ہونا چاہیے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد اور ان کے رفقاء کا (اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ انکی قدر پہچانیں) جنھوں نے نہ صرف انقلاب کا ساتھ دیا بلکہ انقلاب کو دعوت دی اور پورے عزم و استقلال

کے ساتھ انکی قیادت اور تربیت ... کر رہے ہیں۔ ہم کو نہیں معلوم کہ ان اکابر اور ان کے نقش قدم کے پیروؤں کو سیاست آتی ہے یا نہیں لیکن ان کے طرز عمل سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور واقف ہیں کہ انھوں نے ہندوستان میں کوئی ایسا انقلاب دیکھنا پسند نہ کیا جو شر سے دوچار ہو بلکہ چاہا کہ اسکی زمام قیادت خود اپنے ہاتھوں میں لیں تاکہ انقلاب کے معنی یہ نہ ہوں کہ ایک برائی کی جگہ دوسری برائی نمودار ہو گئی بلکہ ایسا انقلاب ہو جو باطل کی جگہ حق کو دیدے، ظلم و ناانصافی کی جگہ عدل و انصاف کو قائم کرے اور طاقت و اقتدار کا تخت مذہب کو بخشدے۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ہندوستان کے تمام مذہبی پیشواؤں نے اس راز کو سمجھ لیا ہوتا تو یہ انقلاب جو ہوا ہے بہت سے زیادہ بہتر حالت میں ابھرتا اور پھیلتا۔ اور یہ جو آج الحاد و بیدینی کی بعض نامانوس صدائیں، ورکمیونزم اور سوشلزم کی بعض بے اعتدالیاں اور وحدت دین کی بعض غلط فہمیاں ہم سنتے اور دیکھتے ہیں یہ پیدا نہ ہوتیں۔ یہ تو درحقیقت ان نابجا دینداروں کے جواب (Reaction) کے طور پر ظہور میں آتی ہیں جنھوں نے آزادی کے مطالبہ کو مذہب کے خلاف سمجھا انگریزی راج کو سایہ خدا قرار دیا اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کو ارتداد بتلایا۔ ان غلط باتوں کا جواب لوگوں نے غلطیوں سے دیا اور دنیا میں ہمیشہ غلطیاں غلطیوں ہی سے پیدا ہوئی ہیں سچ کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔ یقیناً اگر ہندوستان کے بیدار مغز علما، و مصلحین کی دعوت قبول کر لی گئی ہوتی، اور آج ہماری پوری مذہبی جماعت انقلاب کی صف اول میں ہوتی تو کم از کم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ تمام نامانوس صدائیں دب گئی ہوتیں اور جب یہ انقلاب اپنی آخری منزل پر پہنچتا تو ہم دیکھتے کہ ہم نے نہ صرف ہندوستان کی تاریخ بدل دی ہے بلکہ دنیا کی تاریخ بھی بدل ڈالی ہے۔ یعنی دنیا کی جدید بیداری کے بعد صرف ہم کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے کہ ہم نے وہ انقلاب پیدا کیا جو ہمارے لئے صرف زمین کی برکتیں ہی نہیں لایا بلکہ اپنے ساتھ آسمان کی رحمتیں بھی لایا۔

لیکن اگر خدا کے فرشتے ہمارے آگے ہیں تو شیطان نے بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی جماعت حق کی خدمت میں مشغول ہے تو دوسری طرف ایک بہت بڑی جماعت مذہب کی عبائیں ڈالکر حکومت کی مدد کے لئے دنیا میں کنیسہ اور جاگیرداری کے اتحاد کو پھر دہرانا چاہتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے [illegible] کو

مہینے کی مہلت دیدی تو خدانخواستہ ہندوستان میں بھی مذہب کی بربادی کی وہ ٹریجڈی پھر ہم کو دیکھنی پڑے گی جو آپ ترکی کے اسٹیج پر ہم دیکھ چکے ہیں کیونکہ ہمیشہ اسی اتحاد کے ناجائز رشتہ سے وہ جماعتیں وجود میں آتی ہیں جو بیدینی اور ان دیکھا دعظ کہتی ہیں جو کمیونزم اور سوشلزم کی تبلیغ کرتی ہیں جو اکبر کے دین الہی اور وطنیت کے صنم کدہ کا سنگ بنیاد رکھتی ہیں کیونکہ یہ ایک عظیم الشان غلطی ہے اور غلطیوں کا جواب دنیا ہمیشہ غلطیوں ہی سے دیتی ہے۔ آج تم جسکی بیدینی کو حق کی مخالفت کا بہانہ بناتے ہو اگر غور کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ اسکی پرورش اور رضاعت کا بار تمھیں نے اٹھایا ہے اور یقیناً تمھاری غلط دینداری ہی تھی جس نے مصطفیٰ کمال کو دعوت دی کہ اسکی تلوار صرف یونان کی نوجوان کا نہیں بلکہ ترکی کے مذہب کا بھی خاتمہ کردے۔

یہ جماعت دو قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔ ایک جماعت ملی مذہب ہے جو فتوی لکھتی ہے، دعظ کہتی ہے اور آزادی کے تمام مطالبات کے خلاف قرآن و حدیث سے بزعم خویش دلائل فراہم کرتی ہے اور موجودہ نظام میں کوئی تبدیلی خدا کے آئین و قانون کی تبدیلی قرار دیتی ہے۔ اور اس طرح بیچین اور مضطرب اور مذہب بیزار دنیا کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اس سے انتقام کیلئے نفس مذہب ہی کا خاتمہ کر دے۔ اور دوسری جماعت وہ ہے جس کی ساری زندگی کا ایک ایک لمحہ، اسکی تمام معلومات کا ایک ایک حرف، اسکی خانگی اور بیرونی زندگی کا ایک ایک عکس، اس کے شب و روز کے اعمال و افعال کا ایک ایک گوشہ، مذہب، اسکی روایات، اسکے دعیات اسکی اسپرٹ، اسکے ظاہر اسکے باطن کے خلاف بغاوت ہے۔ مگر وہ انگریزی جانتی ہے یا جاگیروں کی مالک ہے، اس کو دعویٰ ہے کہ علما سیاست نہیں جانتے۔ مگر کون علما، وہ علما نہیں جو اس کی حمایت میں دعظ کہتے ہیں، صرف وہ علما، جو آزادی اور انقلاب کے داعی ہیں۔ اس لئے کہ یہ انگریزی نہیں جانتے اور انگریزوں کے بنائے ہوئے کانسٹی ٹیوشن کو نہیں سمجھ سکتے۔ پس انکو حق نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ انکا کام صرف یہ ہے کہ وہ غسل و وضو کے مسئلے بتائیں۔ انھیں مسلمانوں کی عملی زندگی اور سیاست سے کیا تعلق؟

اس بات کا آج اس زور سے وعظ کہا جا رہا ہے کہ عوام اور خواص دونوں پر اس کا جادو چل گیا ہے یہاں تک کہ بعض ایسے لوگ بھی یہ کلمہ دہرانے لگے ہیں جو اگر اس کو سمجھ جائیں تو اس کو بدتراز کفر سمجھیں لیکن پروپیگنڈے کے جادو نے ان کو بالکل کور کر دیا ہے، وہ دوسروں کے بولے ہوئے جملوں کو دہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ مذہب کے خلاف ایک زبردست سازش ہے جس کا آغاز مذہب کے دشمنوں نے کیا ہے۔ اس کے باریک و دور رس نتائج کو ابھی چھوڑ دو صرف ایک موٹی سی بات پر غور کرو۔ اگر یہ کہنا کوئی جرم نہیں ہے کہ علماء کو مسلمانوں کی عملی زندگی کے اصول و معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے تو بتاؤ آج ان لوگوں کو تم کیوں برا کہتے ہو جو مذہب کے مخالف ہیں؟ دنیا کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ اور دوسرے آزاد دماغ انقلابی کیوں قابل گردن زدنی ہیں؟ جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے محرک ہوئے اور جن کی تحریکات کی لمبی فہرست میرے حافظہ میں اور ان کی منکرانہ صدائیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ تمہارے اپنے لوگوں میں ڈاکٹر اشرف اور جواہر لال اس سے زیادہ کیا کہتے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ وہ مذہب کو برا کہتے ہیں اور اس کو عملی زندگی کے مسائل سے الگ کرنا چاہتے ہیں اور تم اصحاب مذہب کو برا کہتے ہو اور ان کو عملی زندگی سے نکال کر غسل و وضو کے گڑھے میں دھکیل دینا چاہتے ہو۔ یہ تو محض لفظوں کا فرق ہوا، حقیقت کے اعتبار سے تو بات ایک ہی رہی۔ پھر تم تو دونوں جرموں کے مرتکب ہوئے، تم حاملین مذہب کو برا بھی کہتے ہو اور وہ جماعت جو تمہاری رجعت پسندی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، مذہب اور خدا کو گالیاں دیتی ہے پھر اس کے باور کرنے میں تمہیں کیوں شک ہے کہ آج جو ہندوستان کا مصطفیٰ کمال بننے کا آرزومند ہے اگر کل خدانخواستہ اس کے ہاتھ میں تلوار آگئی تو انگریز تو اس تلوار سے کیا گھائل ہوگا، یہ اسی کی بخشی ہوئی ہو گی البتہ علماء اور حاملین مذہب کو وہ ضرور قتل کرا دے گا کیونکہ تمہارے اس مصطفیٰ کمال کو غسل و وضو کے مسائل کی ضرورت ہو گی۔ پھر ذرا بتاؤ کہ آج اسلامی کلچر اور اسلامی تمدن کی حفاظت کے لئے کیا یہی مقدس جہاد ہے جو تم نے وقت کے صلاح الدین کی قیادت میں شروع کیا ہے؟

یہ مذاق بھی خوب رہا کہ علماء سیاست نہیں جانتے اور انگریزوں کے بخشے ہوئے ملعون کانسٹی ٹیوشن کو

نہیں سمجھتے کہ اب تک وہ انگریزی نہ جانتے تھے، آج معلوم ہوا کہ انگریزی جاننا کتنی بڑی سعادت دارین ہے اور مسلمانوں کی سیاست کا سرچشمہ درحقیقت کہاں ہے؟ ہم بیوقوف مسلمان ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی زندگی کا دستور العمل، قرآن نامی ایک کتاب ہے اور وہ عربی زبان میں اتری ہے، لیکن دیکھو، وقت کا بڑا دانا اسلامی کلچر اور تمدن کا وارث و مورث کیا کہتا ہے۔ ؟ کہتا ہے کہ تمہاری تمام سیاست کا سرچشمہ انگریزوں کا بخشا ہوا کوئی مسودہ ہے جس کے سمجھنے کے لئے انگریزی زبان ضروری ہے پس جنھوں نے اپنی زندگیاں قرآن وحدیث، مسلم و بخاری اور ہدایہ و شامی کے شروح و حواشی کے حل کرنے میں برباد کی ہیں وہ صرف غسل و وضو کے مسائل بتائیں مسلمانوں کی سیاست میں دخل نہ دیں۔

مسٹر جناح بہت قابل آدمی ہیں، وہ انگریزی ادب اور قانون و سیاست میں امام ہیں، ان کو ناحق دعویٰ کی ضرورت پیش آئی، یہ چیز مسلّم ہے۔ سنتے ہیں بسمارک نے ۵ گھنٹوں کے اندر جرمنی کا کانسٹیٹیوشن املا کرا دیا تھا، وہ اگر راضی ہوں تو ہم ان کو ہندوستان کا بسمارک کہیں، لیکن ہم افسوس کے ساتھ انکی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ صرف سیاست اور قانون جانتے ہیں مسلمانوں کی سیاست اور مسلمانوں کا قانون نہیں جانتے۔ مسلمانوں میں مقدس اور قیصر کا کوئی علیحدہ علیحدہ نظام نہیں ہے۔ یہاں تو بس ایک ہی قانون ہے جو غسل طہارت کے مسئلوں سے لیکر ہماری تمام ملی و بین الاقوامی سیاست پر حاوی ہے۔ عمر فاروقؓ وضو و طہارت کے مسئلے بھی بتاتے تھے اور دنیا کی قوموں کے فیصلے بھی لکھتے تھے اور ان کے سامنے صرف دو ہی چیزیں ہوتی تھیں کتاب اور سنت۔ اور یہ دونوں صرف باعتبار ظاہر دو ہیں، حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ ہم مسٹر جناح کی سیاست دانی پر ایمان لاتے ہیں، اور مانتے ہیں کہ وہ بہت سی چیزیں جانتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں ان بہت سی چیزوں کے ساتھ وہ یہ "ایک" چیز بھی جانتے ہیں یا نہیں۔؟ اور صرف جاننے ہی کا سوال نہیں ہے اس کا ایمان بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟

یہ چند اجمالی اشارات ہیں، انشاء اللہ آئندہ ہم ان کی تفصیل کریں گے اور چند معروضات حضرات علمائے کرام کی خدمت میں بھی پیش کریں گے۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ مرسلات

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ امین احسن اصلاحی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (۱) فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (۲) وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۳) فَالْفٰرِقٰتِ
فَرْقًا (۴) فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا (۵) عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (۶) اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (۷)
فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (۸) وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (۹) وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۱۰) وَاِذَا الرُّسُلُ
اُقِّتَتْ (۱۱) لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ (۱۲) لِیَوْمِ الْفَصْلِ (۱۳) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (۱۴)
وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۱۵)

قسم ہے ان کی کہ چھوڑی جاتی ہیں، پھر زور کر اٹھتی ہیں اور پھیلاتی ہیں، پھر پھاڑتی ہیں، پھر یاد دلاتی ہیں، الزام اتارنے کو یا ڈر سنانے کو۔ کہ جو تم سے وعدہ کیا گیا سب ضرور ہوگا۔ جبکہ ستارے چھپ جائیں گے، اور آسمان پھٹ جائے گا۔ اور پہاڑ اڑیں گے، اور رسولوں کے لئے وقت مقرر ہوگا، کس دن پر ٹالے گئے تھے، فیصلہ کے دن پر، اور فیصلہ کے دن کو تو کیا سمجھا، اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

(۱) سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے اس کا تعلق

آخر قرآن کی سورتوں میں بیشتر ابتدائے دعوت کے بنیادی مسائل کا بیان ہے یعنی قیامت خشیت اور احسان۔ چنانچہ اس سورہ کا عمود بھی یہی تین چیزیں ہیں اور یہی تین ابتدائی نقطے ہیں جو پھیل کر دین کے تمام عناصر کو اپنے دائرہ میں لیتے ہیں۔ قیامت کا ڈر ایمان بالقرآن کی اصل ہے کیونکہ قرآن کی پہلی صدا یہی ہے کہ وہ عدل و جزا اور ایک خوفناک دن کے ظہور کی منادی ہے۔ خشیت نماز اور توحید کی اصل ہے۔ اور تیسری چیز یعنی احسان الی الخلق، تمام قوانین اور شرائع کی بنیاد ہے۔

یہ تمام باتیں قرآن مجید میں اپنے اپنے موقع سے نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اور اس سورہ میں بھی حسب اقتضائے موقع مختلف اسلوبوں سے ان کا ذکر آیا ہے اور موقع کے اختلاف سے اسلوب کا اختلاف قرآن مجید کی ایک خاص خصوصیت ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں۔ قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا!

اسی اصول پر اس عام عمود کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی میں کوئی پہلو نمایاں ہو آیا ہے، کسی میں کوئی۔ اور اسی لحاظ سے طرز خطاب بھی بدل بدل گیا ہے۔ کہیں فکر و احساس کو بیدار کیا گیا ہے اور کہیں عقل و دل کو دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں میں دلائل کے ساتھ ترغیب و ترہیب بھی حسب اقتضائے بلاغت مختلف شکلوں اور ہیئتوں میں نظر آتی ہے۔

اس معاملہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس سورہ کو سابق سورہ کے ساتھ ملا کر پڑھو۔ سابق سورہ (سورہ دہر) میں معاد، قرآن، اور نماز کا ذکر ہوا تھا۔ غور سے دیکھو تو اس سورہ میں بھی ان چیزوں کا بیان ہوا ہے لیکن اسلوب بیان بدل گیا ہے۔ سابق سورہ میں جو پہلو مجمل رہ گئے تھے اس سورہ میں وہ پہلو تفصیل کی روشنی میں آگئے ہیں، سابق سورہ میں معاد پر جو استدلال تھا، چند لفظوں میں تھا، اس سورہ میں وہ بسط کے ساتھ ہے۔ سابق سورہ میں معاد کی تصویر کے لئے ترغیب

کا پہلو زیادہ نمایاں کیا گیا تھا۔ اس سورہ میں زیادہ زور ترہیب کے پہلو پر ہے۔ اور انذار و تبشیر دونوں کو ساتھ ساتھ اور متوازی رکھنے کے لئے ایسا کرنا مقتضائے بلاغت و مصلحت دعوت کے عین مطابق تھا۔ خدا کے انبیاء ایک ہی ساتھ بشیر و نذیر دونوں ہوتے ہیں۔ وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین

یہ بعض اجمالی اشارات ہیں۔ ان دونوں سورتوں پر اگر پورا تدبر کیا جائے تو ہم نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ اچھی طرح واضح ہو سکتے ہیں۔

(۲) سورہ کے موقع ترجیع کے متعلق ایک اصولی بحث

یہ سورہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں ویل یومئذ للمکذبین کا فقرہ دس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اس اسلوب کی خصوصیات پوری تفصیل کے ساتھ سورہ رحمن میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک خاص امر کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ ترجیع کی خوبی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مواقع کے لحاظ سے پوری طرح بامعنی اور موزوں ہو، اور جو بات اس سے اوپر بیان ہوئی ہے اس سے پورا ربط و لگاؤ رکھتی ہو۔ اس اعتبار سے ترجیع کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وجوہ کی جامع ہو تاکہ مختلف مطالب کے ساتھ لگ سکے چنانچہ یہ آیت (ویل یومئذ للمکذبین) اپنے اندر مختلف پہلو رکھتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مختلف مواقع کے لئے ٹھیک ٹھیک موزوں ہو گئی ہے۔ اس کے اسلوب اور اس کے تینوں لفظوں میں کافی وسعت ہے۔ ذیل میں ہم اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) اس کا اسلوب ایسا ہے کہ اس میں انشاء اور خبر دونوں ہونے کی صلاحیت اور دونوں کا احتمال ہے۔ خبریہ اسلوب کا مقصد یا تو اس امر کا بیان ہوگا کہ ان منکرین کے لئے ہلاکت اور خرابی ثابت ہے۔ مثلاً

فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ — پس ان کے لئے خرابی ہے اس چیز کے باعث جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔

یا ان کے اس قول کا بیان ہے جو وہ قیامت کے دن کہیں گے اور ان کا یہ قول قرآن مجید میں مختلف جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً قالوا یٰویلنا ھٰذا یوم الدین۔ دوسری جگہ ہے قالوا یٰویلنا من بعثنا من مرقدنا۔

لفظ ویل کی بار بار تکرار میں بھی ایک خاص راز ہے۔ اگر اس سے اثبات ویل کا مفہوم سمجھا جائے تب تو اس تکرار کا یہ فائدہ ہوگا کہ اس سے اسباب ویل کی کثرت واضح ہوگی اور اگر یہ قیامت کے دن ان کے قول کی نقل ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس دن اس کے بہت سے مواقع پیش آئیں گے اور وہ ہر موقع پر اپنی خرابی کا ماتم کریں گے۔

بعض آیات سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ	اور جب وہ ڈال دیئے جائیں گے اس کی کسی تنگ
دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا	جگہ میں باندھ کر پکاریں گے اس وقت ہلاکی کو۔ آج ایک ہی
وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا	ہلاکی کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکیوں کو پکارو

اس سے معلوم ہوا کہ اس دن ہلاکت کے اسباب اور مواقع دونوں ہی بے شمار ہوں گے۔

(ب) لفظ 'ویل' خود ایک جامع لفظ ہے۔ وہ تمام چیزیں اس کے تحت میں آگئیں جو خرابی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ غم، حسرت، پریشانی، عذاب قیامت، ہر چیز پر یہ حاوی ہے۔ بعض جگہ قرآن مجید میں اس چیز کی تصریح کر دی جاتی ہے جو ویل کا سبب ہوگی مثلاً وویل للکفرین من عذاب شدید۔ خرابی ہے کافروں کے لئے عذاب سخت کے سبب سے۔ دوسری جگہ ہے فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون۔ پس خرابی ہے ان کے لئے اس چیز کے باعث جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور اس چیز کے سبب جو وہ کماتے ہیں۔ فویل للذین کفروا من یومھم الذی یوعدون پس ہلاکی ہو کافروں کیلئے ان کے اس دن کے سبب جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

الغرض لفظ ویل کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ چونکہ اس کے اسباب بہت سے ہوں گے اس لئے اس کے مواقع بھی بہت سے آئیں گے۔

(ج) 'یومئذ' کا لفظ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس دن ایسا ایسا ہوگا۔ پس اس کے حدود کی تعیین موقع کے لحاظ سے ہوگی۔

(د) 'مکذبین' کا لفظ ایک جامع لفظ ہے۔ اصلاً بعث اور آیات توحید کے انکار کے لئے آیا ہے لیکن تفصیلات میں رسول اور کتاب اللہ کی تکذیب بھی اس میں داخل ہے۔ قرآن مجید نے جابجا ان تمام پہلوؤں کی تصریح کر دی ہے۔ اور بعض آیات میں اس امر کو بھی واضح کر دیا ہے کہ جو اصل کا منکر ہوگا وہ لازماً اس کے فروع اور تفصیلات کا بھی منکر ہوگا۔ مثلاً فرمایا:۔

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ	اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم ڈال دیتے ہیں تمہارے درمیان اور
وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا، وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	اور ڈال دیتے ہیں ان کے دلوں پر غلاف کہ اس کو نہیں
اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا	سمجھتے اور ان کے کانوں میں بہراپن پیدا کر دیتے ہیں اور جب
وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ	تم قرآن میں اللہ کو تنہا یاد کرتے ہو تو یہ نفرت کے ساتھ
وَلَّوْا عَلٰى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا	پیٹھ پیچھے بھاگتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ وہ قیامت اور توحید کے منکر ہیں اس لئے لازماً اس چیز کا سننا بھی ان پر شاق ہے جو ان چیزوں کی طرف ان کو دعوت دیتی ہے۔ یہاں یہ اجمالی اشارہ کافی ہے۔ اپنے مقام پر پورے شرح و بسط کے ساتھ اس کی تفصیل موجود ہے۔

اس روشنی میں آیت ویل کا ظاہری اشارہ تو منکرین قیامت ہی کی طرف ہوگا لیکن سورہ کی آخری آیات اس کے ایک اور پہلو تکذیب قرآن کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں۔ اور حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت ترجیع کے متعدد پہلو ہیں، پس سیاق و سباق سے جو پہلو زیادہ لگتا ہوا

ہوگا، اختیار کر لیا جائے گا۔ یہ اصولی بحث بطور مقدمہ ذہن نشین رکھنی چاہیے۔ ہم آگے موقع موقع کے اعتبار سے آیت کے مختلف پہلوؤں میں سے جو پہلو اقرب ہوگا اس کو بیان کر دیں گے۔

(۳) لفظوں کی تفسیر اور بعض جملوں کی تاویل

(۱ - ۱۵)

[والمرسلت عرفا] عربی میں ارسل الشئ امسکہ کا ضد ہے۔ ارسل الشئ کے معنی ہوئے کسی بندھی ہوئی چیز کو چھوڑ دیا، آزاد کر دیا۔ ہوا رکی ہوئی ہے تو گویا بندھی ہوئی ہے، جب چلنے لگی تو گویا چھوڑ دی گئی، فرمایا وارسلنا الریاح لواقح۔ (عرف) ناصیۃ الفرس۔ گھوڑے کی ایال کے وہ بال جو پیشانی پر لٹکتے ہوتے ہیں۔ یہ عربی لغت کا نہایت مشہور لفظ ہے۔ امراء القیس کا شعر ہے:-

اذا نحن قمنا عن شواء مضهب ۔۔۔ نمشی باعراف الجیاد اکفنا

جب شکار کا پکا گوشت کھا کر اٹھتے تھے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنا ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔

یہاں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے چلنے اور رکنے کو گھوڑے کی پیشانی کے بال پکڑنے اور چھوڑنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ ہواؤں کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ہوتا ہے وہی مالک اور متصرف ہے۔ (وما من دابۃ الا ھو اٰخذ بناصیتھا)

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہواؤں کا چلنا فائدہ اور نقصان دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

محض ارسال کا لفظ شدت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھا، اس لئے عاصفات کو اس پر فا کے ذریعہ عطف کیا۔

[والعصفت عصفا] یعنی چلنے کے بعد سخت ہو جاتی ہے۔ ایسی ہوا عموماً نقصان کے لئے ہوتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ ۔۔۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو

بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَۃٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا ۔۔۔ لیکر چلتی ہیں بادِ موافق ہو کے ساتھ اور وہ اس سے خوش

رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ ہوئے ہیں کہ آتی ہے تند ہوا اور گھیر لیتی ہیں
مِنْ كُلِّ مَكَانٍ موجیں ہر طرف سے۔

[فَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا] نشر کے معنی ہیں کسی چیز کے پھیلا دینے، بکھیر دینے، پراگندہ کر دینے، اگا دینے۔ یہ سب معنی قریب قریب ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے واذا الصحف نشرت، دوسری جگہ ہے وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ۔ ایک جگہ فرمایا وجعل النہار نشورا۔ یہاں ناشرات سے ہوائیں مراد ہیں اس لئے کہ ان میں نشر کے مختلف پہلو پائے جاتے ہیں۔ یہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں، پھر فضا میں ان کو پھیلاتی ہیں، پھر اپنے رب کی رحمت کو پہنچاتی ہیں اور نباتات کو اگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی رہتی ہیں اور چونکہ یہ مستقل وصف تھا عاصفات سے متناسب نہ تھا اس لئے حرف عطف واو آیا۔

[فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا] ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں ۔۔۔ یعنی کبھی بارش کو لا کر لاتی ہیں اور کبھی بادلوں کو اڑا لیجاتی ہیں۔ کسی قوم کو نفع پہنچاتی ہیں کسی کو ضرر۔ سورہ ذاریات میں، ہواؤں کے ان تصرفات کو آیت والمقسمت امرا، کے تحت میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ چونکہ یہ فرق و امتیاز نشر کے بعد نمایاں ہوتا ہے اس لئے عطف 'ف' کے ذریعہ ہوا۔

[فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا] قرآن مجید میں اکثر جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہواؤں کی تصریف میں اللہ تعالیٰ کی نشانی اور یاددہانی ہے۔ اسی سببیت کے تعلق کی وجہ سے، عام قاعدہ کے مطابق فعل کی نسبت ہواؤں کی طرف کر دی گئی۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں، اضلال کی نسبت اصنام کی طرف کر دی گئی ہے۔

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ اور مجھکو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بت پوجنے لگیں،
رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ میرے پروردگار ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک مخلوق کثیر
. . . . کو گمراہ کر رکھا ہے۔

پس ہواؤں کی تصریف کے بعد اس امر کو یاد دلایا کہ ہوائیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے قانون قضا، بالحق کا اعلان کرتی ہیں۔

[عذرا او نذرا] یعنی یاد دہانی جو ہواؤں کی تصریف کے ذریعہ ہوتی ہے اس کا مقصد غافلوں پر اتمام حجت اور ہوشیاروں کو انذار کا پیام پہنچانا ہے۔ او تفہیم کے لئے ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مصلحین کا قول نقل ہوا ہے اس میں اس مفہوم کی تصریح ہوگئی ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ — اور جبکہ ان میں سے ایک گروہ نے تم کیوں نصیحت

قَوْمَا اِللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ — کرتے ہو ایسے لوگوں کو جن کو اللہ ہلاک کرنیوالا ہے

عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً — یا سخت عذاب دینے والا ہے، بولے تمہارے رب کے

اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ — حضور میں معذرت کے لئے اور تاکہ وہ ڈریں۔

یعنی جو لوگ ہماری باتوں کو نہ مانیں گے ان کے حق میں ہماری طرف سے یہ معذرت ہوگی اور جو لوگ سنیں گے ان کو اس سے نفع پہنچے گا۔

[انما توعدون] یہ ایک عام لفظ ہے۔ قیامت، بعث، فیصلہ اور روز جزاء کے متعلق جو وعدے کئے گئے ہیں، وہ سب اس میں آگئے۔ قرآن مجید میں اس کی جو نظیریں ہیں ان میں جگہ جگہ ان تمام چیزوں کی تصریح ہوگئی ہے اور چونکہ ان سب کی حقیقت ایک ہی ہے اس لئے یہاں اجمال کے ساتھ ان کو ذکر کردیا تفصیل نہیں فرمائی۔

[طمست] طمس الشئی کے معنی ہیں کسی چیز کو مٹا دیا۔ اس کے تمام نشانات و آثار محو کردیے۔ مثلاً فرمایا: من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا۔

[واذا السماء فرجت] اس کے نظائر متعدد ہیں مثلاً وفتحت السماء فکانت ابوابا۔ نیز واذا السماء انفطرت۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ آسمان جو تمہیں بالکل ٹھوس اور سپاٹ نظر آتا ہے۔

جن میں کوئی شگاف یا دراڑ نہیں دکھائی دیتا (وما لها من فروج) (ارجع البصر هل ترى من فطور) وہ جو اس مضبوطی اور استحکام کے تم دیکھو گے کہ خدا کے حکم سے اس میں شگاف پڑ گئے ہیں۔

[واذا الجبال نسفت] نسف کے معنی ہیں، ریزہ ریزہ کر دینا، منتشر کر دینا۔ جیسے دینا، جھاڑ دینا۔ اسی سے منسف اس آلہ کو کہتے ہیں جو گیہوں کو بھس سے الگ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے۔ وانظر الی الٰهك الذی ظلت علیه عاكفا لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نسفا۔ دوسری جگہ ہے۔ ویسئلونك عن الجبال فقل ینسفها ربی نسفا فیذرها قاعا صفصفا۔

[اقتت] وقتت کی تبدیل شدہ صورت ہے جیسے وجوہ سے اجوہ۔ توقیت کے معنی ہیں وقت متعین کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے لئے وقت متعین کیا جائے گا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے۔ مثلاً بولیں گے ابغنی خادما، ارسلنی فرسها۔ مطلب یہ ہو گا کہ ابغ لی خادما وارسل الی فرسها۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انبیاء کے لئے گواہی کا ایک وقت متعین کیا جائے گا اور اس میں ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کیا جائے گا اور ان کی شہادتوں کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ یہاں یہ مضمون مجمل صورت میں ہے لیکن دوسری آیت میں اس کی پوری تصریح ہو گئی ہے۔

[اجلت] اجل له۔ اس کے لئے ایک مدت ٹھہرا دی۔ ایک وقت متعین کر دیا۔ فرمایا وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا۔ ہم اس مدت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرائی تھی۔ اس کے اسلوب کے باب میں دو تاویلیں ممکن ہیں۔ یا تو وہی تاویل اختیار کر لیجئے جو وقتت کے متعلق اوپر گذر چکی ہے۔ یا اجلت الاجال کے معنی لیجئے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہوگا۔

[وما ادراك] یعنی وہ دن عظیم الشان ہوگا۔ یہ اسلوب استفہام کبھی کبھی محض تفخیم کے لئے آتا ہے اور اس صورت میں جواب سے مستغنی ہوتا ہے۔ مثلاً الحاقة ما الحاقة وما ادراك ما الحاقة كذبت ثمود وعاد بالقارعة

[ویل یومئذ للمکذبین] اس آیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہاں صرف

مناسب مقام موعود کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا واذا النجوم طمست الآیہ کا جواب نہیں ہے
اسکی متعدد وجوہ ہیں۔

(۱) اس کے بعد نظائر ہیں ان میں معنوی تعلق کے باوجود اسکی حیثیت بالکل مستقل ہے۔

(۲) اس طرح کی شرطیہ کے موقع پر جواب پر فا آتی ہے الا انکہ جواب جملہ فعلیہ یا ظرفیہ ہو مثلاً فاذا نقر
فی الناقور فذالک یومئذ یوم عسیر۔ دوسری جگہ ہے۔ یوم تمور السماء مورا وتسیر
الجبال سیرا فویل یومئذ للمکذبین۔

(۳) اس قسم کی شرط میں جواب محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً اذا السماء انشقت واذنت لربها وحقت
واذا الارض مدت والقت ما فیها وتخلت واذنت لربها وحقت۔ یا ایها الانسان انک
کادح الآیہ ان میں جواب محذوف ہے اس لئے کہ سیاق کلام سے خود واضح ہے۔

(باقی)

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن

(بزبان عربی)

تفسیر بزبان عربی زبان میں مفسرین کے متفقہ اصول القرآن یفسر بعضہ بعضا پر لکھی گئی ہے جسے
ظاہری و باطنی خوبیوں کے باعث اہل علم حضرات نے پسند فرمایا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں
بھی بہت مقبول ہو چکی ہے بعض مدارس میں بطور نصاب (جلالین کی طرح) پڑھائی جا رہی ہے ہر آیت کی تفسیر میں قرآن مجید کی دوسری
آیت سے استشہاد کیا گیا ہے مصری رنگ کے کاغذ پر اعلیٰ کتابت و طباعت کے ساتھ طبع کرائی گئی ہے۔ سارے قرآن کی تفسیر ہے۔ قیمت للعہ

ملنے کا پتہ:- مینیجر دفتر اہلحدیث امرتسر

ذبیح کون ہے؟

بعض لوگ مدت سے تقاضا کر رہے ہیں کہ استاذ امام کے رسالہ الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح کا ترجمہ الاصلاح میں شائع کر دیا جائے تاکہ قربانی کے متعلق بعض بنیادی مباحث کے سمجھنے میں مدد ملے۔ ہم نے ... کی صورت ... ہونے کی وجہ سے اس کا ترجمہ ... لیکن اس زمانہ میں قربانی کے متعلق بعض نئے مباحث پیدا ہو گئے ہیں اور ان کو سمجھنے کے لئے بعض مقدمات کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا ضروری ہے اس مقصد سے اس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ امید ہے لوگ ان دقیق اور خشک مباحث کو توجہ سے پڑھیں گے۔

(اڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ خالق الوجود من العدم، وجاعل النور من الظلم، ومخرج الصبر من الالم، ومنزل ... على الامم ... الاصحاب ... شكره على انعم ... ولي الاكرم، ذي الشرف الاشم، والنور الاتم، والكتاب المحكم، والكمال ... سيد ولد آدم، محمد الذي بشر به عيسى بن مريم، ودعا لبعثته ابراهيم حين كان يرفع قواعد بيت الله ... صلى الله عليه وسلم، وعلى ... الذين بارك ... كافة الناس من العرب والعجم۔

یہ رسالہ نظام القرآن کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے۔ اس میں مصنف مرحوم نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دونوں بیٹوں — حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحاق علیہما السلام — میں سے کس کو ذبح کیا، اور اس کا تاریخی نام الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح رکھا۔ اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کے بعض خاص اسباب ہیں جن میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔

۱- پہلی چیز جو اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کی محرک ہوئی وہ اسلام میں اس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔

ان آیات کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلام کی آزمائش کی اور جب اس چیز میں ان کو کامل پورا اور راسخ پایا ان کو برگزیدہ کیا اور لوگوں کا امام بنایا۔ قرآن مجید نے تفصیلاً اور اجمالاً دونوں طرح اس حقیقت کی توضیح کر دی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا	اور جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں فرمایا البتہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔

دوسری جگہ فرمایا:-

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ	اور ہم نے اسکو برگزیدہ ٹھہرایا دنیا میں، اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں ہوگا۔ یاد کرو جبکہ اس سے اس کے پروردگار نے کہا سرفگندہ ہو جاؤ۔ بولا میں سرفگندہ ہوا عالم کے پروردگار کے حضور۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے برگزیدہ ٹھہرایا کہ انھوں نے اپنے پروردگار کی اطاعت کی اور جو کچھ ان کو حکم ملا اس کی ٹھیک ٹھیک تعمیل کر دی۔

اس کے بعد بعض دوسری آیات میں اس اسلام اور اطاعت و سرفگندگی کی اصل حقیقت اور اس امتحان کی نوعیت آشکارا کر دی۔ فرمایا:-

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (صافات)	پس جب وہ دونوں اطاعت کیلئے آمادہ ہوگئے اور ابراہیم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔

اس کے بعد تشریح کر دی کہ امتحان سے مراد یہی امتحان ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ	بے شک یہی کھلا ہوا امتحان ہے۔

یعنی اس امتحان نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال اسلام اور حوائگی نفس کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اور یہی چیز توحید کامل اور دین خالص کی اصلی حقیقت ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھ کر معاملہ کی ایک اور خصوصیت پر غور کرو۔ اس اسلام کو جس کی حقیقت اوپر بیان ہوئی، عام ملت و شریعت کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے مخصوص فرمایا، اس میں دوسروں کو ساجھی نہیں بنایا۔ کیونکہ شریعت اسی کو دیجاتی ہے جو اس کو اٹھا سکے۔ اس بارگراں کی متحمل صرف آپ ہی کی امت ہو سکتی تھی، اس لئے اسی کو یہ امانت تفویض ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے وقت دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کی اپنی ذریت میں سے جو اس وادی غیر ذی زرع میں آباد ہے، ایک امت اٹھائے جو اس شریعت کی حقیقت و کمال اسلام کی مظہر و حامل ہو۔ اور ایک پیغمبر مبعوث فرمائے جو اس امت کو اس بارگراں کے اٹھانے کے قابل بنائے اور ان کو اس شریعت کی تعلیم دے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	اور یاد کرو جب ابراہیم اٹھا رہا تھا گھر (بیت اللہ) کی بنیادیں اور اسمٰعیل (اور دعا کر رہے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہماری دعا قبول فرما بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ پروردگار اور ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہم کو ہمارے حج کے طریقے بتا اور قبول فرما ہماری توبہ بیشک تو توبہ قبول کرنے والا ہے اور مہربان ہے، پروردگار اور اٹھا ان ہی میں سے ایک رسول جو سنائے ان کو تیری آیتیں اور سکھائے ان کو شریعت اور حکمت اور ان کو پاک کرے، بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اور ان کی ذریت میں سے وہ امت اٹھائی جو ان حضرات کی مثال و یادگار بنی۔ یہ ابراہیم و اسماعیل نے اسلام کامل پیش کیا تھا جس کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں اپنے نفس کو قربان کر دینا ہے۔ یہ اس طرح یہ پوری امت گویا اپنے باپ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی سنت کے مطابق خدا کی راہ میں قربان ہے۔ اس کی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ایک دعا جو آنحضرت صلعم کو تلقین ہوئی ہے اس میں یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو گئی ہے۔

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ	کہو بے شک مجھے پروردگار نے میری رہنمائی کی سیدھے
مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ	رستہ کی طرف سیدھا دین ابراہیم کی ملت جو یکسو تھا
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ	اور شرک والوں میں نہ تھا۔ کہو میری نماز اور میری
قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ	قربانی، میری زندگی اور میری موت تمام عالم کے
وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ	پروردگار اللہ کے لئے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں
لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ	اسی کا مجھکو حکم ہوا ہے اور میں تمام مسلمانوں میں آگے ہوں

یہاں اول المسلمین میں اسلام سے اس کا یہی خاص مفہوم مراد ہے۔ ورنہ اسلام اپنے عام معنی میں تو تمام مذہبی مذاہب کے لئے بولا گیا ہے۔ البتہ علم اور نام کی حیثیت سے صرف اسی ملت کے لئے استعمال ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملت کے لوگ کمال اسلام کے آخری نقشہ پر ہیں۔ یعنی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ اپنی جان کو خدا کے سپرد کر چکے ہیں۔ اور ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ نے ان کو برگزیدہ کر کے تمام دنیا پر اپنا گواہ بنایا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ	اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں پورا جہاد، اس نے تم کو چنا
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي	اور نہیں رکھی دین میں تم پر کوئی تنگی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا
الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ	دین۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے

اِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

اور اس میں بھی تمہارا نام وہی ہوا تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ . . . .

"ھو سمّٰکم المسلمین من قبل" اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے۔ اس میں حضرت ابراہیم کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جس میں انھوں نے دعا کی ہے کہ "من ذریتنا امۃ مسلمۃ لک" اور ہماری ذریت میں سے اپنی ایک فرمانبردار امت بنا۔

اس خاص مقصد کے لئے ایک خاص امت اس لئے اٹھائی گئی کہ اس کے ذریعہ یہ نعمت تمام دنیا پر عام ہو اور ابراہیم کی نسل تمام عالم کے لئے خیر و برکت کا سرچشمہ قرار پائے۔ چنانچہ تورات میں جہاں یہ واقعہ ذبح بیان ہوا ہے اس کی طرف نہایت واضح اشارہ ہے۔

"اور میں اس وجہ سے کہ تو نے یہ کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو مجھ سے بچا نہ رکھا تجھکو برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاؤں گا .... اور تیری نسل میں زمین کی تمام قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات سنی"

اس آخری ٹکڑے کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ یہ امت تمام دنیا میں دینِ خالص اور توحیدِ کامل کی اشاعت کرے گی اس لئے اس کے ذریعہ میری برکت تمام دنیا کی قوموں کو پہنچے گی اور یہی معنی ہیں "وتکونوا شھداء علی الناس" اور تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو) اور "جاھدوا فی اللّٰہ حق جہادہ" (اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو پورا جہاد) کے۔ یعنی اللہ تعالے نے تم کو اس عظیم الشان مقصد کی انجام دہی کے لئے چن لیا ہے پس تمہاری تمام جد و جہد اور سرگرمی کا محور یہی مقصد ہونا چاہئے۔ تم اللہ کی راہ میں قربان ہو چکے ہو۔ تمہاری زندگی اودوت اللہ تعالی کیلئے ہے۔ اور اسی خصوصیت کی وجہ سے تم لوگوں پر اللہ کے گواہ اور ان کے ہادی و رہبر بنائے گئے ہو۔

اچھا۔ اب اس پوری تفصیل پر دوبارہ نظر ڈالو۔ اور غور کرو کہ اس سے کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہی وہ کامل اسلام ہے جو ملت ابراہیمی کی اصل حقیقت ہے۔ اسی کی تکمیل اور تفصیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اسی کا نام اسلام رکھا، اور اس کے پیروؤں کو مسلم کا لقب بخشا، پھر اسی کی دعوت وتبلیغ کے لئے ذریت ابراہیم میں سے جو دین حنیفی کے مرکز بیت اللہ الحرام کے پاس آباد تھی، ایک خاص امت مسلمہ مبعوث فرمائی، اب غور کرو کس خوبی واختصار اور جامعیت کے ساتھ یہ تمام اشارات آیت ذیل میں جمع ہوگئے ہیں۔

أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ	اپنے رخ کو سیدھا کرو، دین کے لئے یکسو ہوکر یہ
اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا	خدا کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو
تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ	پیدا کیا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں
وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ	یہی سیدھا فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے

اب غور کرو جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ امتحان جبل یروشلم پر واقع ہوا اور ذبح ہونے والے حضرت اسحاق ہیں وہ سرور کائنات صلعم کی بعثت عظمیٰ کی اصل حقیقت اور مذہب اسلام کے اندر اس قربانی کی اصلی عظمت واہمیت سے کس قدر بیگانہ ہیں!

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن کی صحیح تاویل اور جن کے صحیح نظام کا سمجھنا اسی مسئلہ کی تفصیلات کے سمجھنے پر منحصر ہے۔ اس دعویٰ کی بعض دلیلیں تم کو اوپر کی سطروں میں مل چکی ہیں اور بعض اس کتاب کی آئندہ فصلوں میں آئیں گی۔ تفسیر نظام القرآن میں تمام متعلق آیات کے تحت میں ان مباحث سے تعرض کرنا تکرار واطناب کا باعث ہوتا اس لئے ہم نے اس معاملہ کی تمام مشکلات کے حل کے لئے اپنی یہ کتاب خاص کی پس اس کو ہماری تفسیر کا مقدمہ سمجھنا چاہئے ضرورت کے وقت ہم اس کا حوالہ دیدیں گے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہوئی کہ یہود نے اس واقعہ کے چھپانے کے لئے جو کوشش کی وہ کوشش کسی واقعہ کو بھی چھپانے کے لئے نہیں کی۔ حضرت اسمٰعیل اور خانہ کعبہ کے معاملہ میں ان کی تحریفات اور ان کے جھوٹ کا طومار بے پایاں ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر (فصل ۳۲) اور دوسری فصلوں میں آئے گا۔ تورات میں یہ ذبح کا واقعہ بیان ہوا ہے لیکن اس پر یہود نے تحریفات کے اتنے پردے ڈالدئیے ہیں کہ اصل حقیقت بالکل مسخ ہوکر رہ گئی ہے، قرآن مجید نے یہ تمام

پردہ ہٹا کر معاملہ کے اصلی چہرہ کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ اور اس معاملہ میں بحث و نظر کی ایک مخصوص روش اختیار فرمائی ہے جس کی بعض خصوصیتیں یہاں قابل ذکر ہیں۔

(الف) یہود کے تمام صحیفوں کا متفقہ بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دیں۔ لیکن قرآن مجید کا بیان اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید اس سے ارفع ہے کہ وہ کسی بات کو یہود سے یا ان کی مسخ شدہ کتابوں کو اپنا ماخذ بنائے۔ بلکہ وہ مہیمن اور مصلح ہے۔ یہود نے اپنی کتابوں میں جو تحریفات کر دی ہیں، وہ ان کا پردہ چاک کرتا ہے۔ اور ان کی ملائی ہوئی غلطیوں کی تصحیح کر کے اصل حقیقت سامنے رکھ دیتا ہے۔ واللہ اعلم

(ب) یہود نے ذبیح کے واقعہ میں جگہ جگہ بالکل بے ڈھنگے طور پر حضرت اسحاقؑ کا نام ڈال دیا ہے۔ اور یہ سب زیادہ بھونڈی تحریف تھی جس کے یہود مرتکب ہوئے۔ قرآن مجید نے اس طرح کی بھونڈی تحریفات سے تعرض بوجوہ (جن کی تفصیلات فصل ۳ میں ملیں گی) اپنے وقار و حکمت کے منافی سمجھا، اس لئے کھلے لفظوں میں اس کی تردید نہیں فرمائی اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، یہود نے بعض جگہ بلاشبہہ حضرت اسحاقؑ کا نام ڈال دیا تھا لیکن کلام کی باقی تمام شہادتیں ان کی تحریف کی پردہ دری کے لئے بالکل کافی تھیں۔ راہ کے بعض نشانات تو انھوں نے ضرور مٹا دئیے لیکن راہ کو بند کر دینا ان کے بس میں نہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ تحریف ان کی خواہشوں کے بالکل موافق تھی۔ اس لئے فوراً دلوں میں رچ گئی اور پھر انھوں نے اس کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ ان کے سلف و خلف سب اس پر متفق ہو گئے، ایک آواز بھی اس کی مخالف نہیں رہ گئی۔ اور بدقسمتی سے جو لوگ صحیح اور غلط میں امتیاز کے عادی نہیں ہوتے۔ وہ عام اور مشہور باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت اس معاملہ میں بھی پیش آئی۔ یہود نے صدا، ایسے اتفاق رائے اور زور و قوت کے ساتھ بلند کی کہ عام و خاص سب یہی بولی بولنے لگے۔ اس ہمہ گیر ہنگامہ نے ہمارے بعض ان علماء کو بھی متاثر کر دیا، جو یہود سے روایات لینے میں کوئی حرج نہیں خیال کرتے تھے اور ان کے صحیفوں کے

باب میں حسن ظن رکھتے تھے۔ مثلاً علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ۔ انھوں نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ وہ قوموں کے حالات کے بارہ میں خود اس قوم کے افراد کے بیانات پر اعتماد کرتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ تسامح ان حضرات سے سہو صحبت ہوگا کہ وہ یہود کے صحیفوں کی حقیقت اور اصلی اور موجودہ تورات میں جو محض چند مخلوط روایات کا مجموعہ ہے پوری طرح فرق نہ کر سکے۔

لیکن یہ غلط فہمی صرف بعض علماء کو ہوئی۔ دوسرے علمائے اسلام جو نقد و نظر کی قابلیت رکھتے تھے انھوں نے خود تورات کے نصوص و دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ ذبیح دراصل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ تاہم اس خلاف رائے کا یہ نتیجہ کم از کم ضرور ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت نگاہوں میں گھٹ گئی۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس اختلاف کا باعث زیادہ تر اس کی عدم اہمیت کا احساس ہی ہوا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس معاملہ ذبیح کو ہماری ملت میں کیا درجہ حاصل ہے تو اس باب میں ان سے جو غفلت ہوئی وہ ہرگز نہ ہوتی۔ ان تین اسباب نے ہم کو آمادہ کیا کہ اس مسئلہ کو پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے یہ کتاب لکھی۔ واللہ هو الموفق للحق والصواب

یہ کتاب مقدمہ کے علاوہ تین قسطوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

قسط اول میں تورات اور علمائے اہل کتاب کے بیانات و اعترافات سے استدلال ہے تاکہ یہ دلائل اہل کتاب پر حجت ہو سکیں۔

قسط ثانی میں قرآنی دلائل و نصوص سے بحث کی گئی ہے۔

قسط ثالث میں۔ احادیث و آثار، اقوال علمائے مشاہیر، احوال عرب اور اقوال عرب قبل از اسلام سے استدلال ہے۔

خاتمہ میں۔ ان تمام مباحث پر ایک جامع نظر ڈالی گئی ہے۔

ان اشارات کے بعد اب ہم اصل مسئلہ کو شروع کرتے ہیں و نسأل اللہ تعالیٰ التائید والتسدید و

هو الولی الحمید

(باقی)

مذاکرہ

مصدقاً لما بین یدیہ

(از مولانا سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب مچھوی)

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اس مسئلہ پر مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی اور مولانا سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب میں جو مذاکرہ ہو رہا تھا یہ اس کی آخری قسط ہے۔ اب اس پر کسی بحث و نظر کی ضرورت نہیں، دونوں صاحبوں نے اپنے اپنے خیالات و دلائل بیان کر دیئے ہیں۔ ناظرین خود فیصلہ کریں گے کہ حق کیا ہے اور قوت استدلال کس کے ساتھ ہے۔ ہم دونوں صاحبوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس مذاکرہ میں انہوں نے علمی و مذہبی شان کو نہایت ضبط و احتیاط کے ساتھ باقی رکھنے کی کوشش کی گو قلم کہیں کہیں بحث کے متعین حدود سے متجاوز ہو کر دوسروں کو زخمی کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اس طرح کے مفید مباحث پر ان حضرات میں بحث و نظر ہو اور لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ حق تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو فہم قرآن کا ذوق عطا فرمائے اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کے لئے تدبر قرآن کی راہیں باز ہوں۔

مولانا سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب نے مجھ کو بھی اس عنوان پر اظہار خیالات کی دعوت دی ہے۔ لیکن اس وقت لوگ اس بحث سے آسودہ ہیں۔ ضرورت داعی ہوئی تو ان شاء اللہ کسی فرصت میں اپنی ناچیز معروضات پیش کرنے کی جرأت کروں گا۔ (ایڈیٹر)

الاصلاح بابت جون و جولائی ۱۹۳۶ء میں خاکسار اشرف کی حقیر معروضات کے جواب میں مخلص محترم جناب مولوی بدرالدین صاحب بدر اصلاحی نے اس ہیچمدان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نہایت شرح و بسط کے ساتھ ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ سب سے پہلے میں اپنے فاضل دوست کا شکریہ ادا کر دوں کہ اس دور نفسانیت میں بھی میری تنقید سے کوئی تکلیف نہیں پہونچی اور اتنے طول طویل مضمون میں انھوں نے کہیں بھی

متانت و سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور پھر اس امر کا شکریہ مزید کہ انھوں نے ایک طالب قرآن کے لئے اپنی زحمت گوارا فرمائی۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

گرچہ یہ کوئی اصولی مسئلہ نہیں، جس میں اختلاف کسی اہم نتیجہ تک منتہی ہوتا، لیکن کم از کم اس سے "تدریجی اقرأ" کی صورت پیدا ہوتی ہے، اور قرآن میں بے ضرورت اجتہاد و تاویل کا سد باب ہوتا ہے، اس لئے میں چاہتا تھا، کہ تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر تبادلۂ خیالات کروں، لیکن اپنی پریشانیوں اور الجھنوں میں اس طرح مبتلا رہا کہ سارے خیالات، خیالات پریشاں ہو کر اڑ گئے، اور آج بھی اس طویل وقفہ کے بعد جو کچھ لکھ رہا ہوں اپنی خواہش کے خلاف نہایت اختصار کے ساتھ۔ امید کہ میرے محترم دوست مزید غور فرمائیں گے۔

میرا مقصد چونکہ بحث و مناظرہ نہیں، محض افہام و تفہیم ہے، اس لئے آپ کے مضمون کی تردید اور آپکے طول و طویل مقالہ کے جواب کے بجائے، بہتر یہ ہے، کہ اپنے دلائل کو ایک دفعہ پھر مزید وضاحت و ترتیب کے ساتھ پیش کر دوں، جن سے آپ سرسری طور پر گزر گئے ہیں، اور ان دشواریوں کا حل بھی، جو اس عام اور مسلمہ معنی کے قبول میں آپ پیش فرما رہے ہیں، تاکہ یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں، اور اختلافات طے ہو سکیں۔

آپ کے اختیار کردہ معنی سے میرے اختلاف کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے، جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے اور مجھے الزام دیا ہے کہ میں اس خیال کا حامی یا مدعی ہوں کہ "نزول قرآن کے زمانے میں صحف سماوی کے اصل اور صحیح نسخے زیادہ نہ سہی دو ایک ضرور موجود تھے" بلکہ یہ ان لوگوں کے خیالات کی ترجمانی تھی، جو اس کے مدعی ہیں، اور انھیں کے دلائل کی طرف سرسری اشارہ تھا، اور اس لئے آپکے اجتہاد و اختلاف کی بنیادی کمزوریاں بھی یہیں ہیں۔ اسی لئے آگے چل کر میں نے اس دلیل سے اعراض کرتے ہوئے دوسری دلیلوں سے حجت قائم کی ہے کہ اختلاف کے بعد یہ دلیل نہ میرے کام کی ہے، نہ آپ کے کام کی، ورنہ اس موضوع پر ابھی کافی بحث و نظر کا موقع تھا۔ میری اصل دلیلیں تو یہ ہیں:-

(۱) اسلام دین فطرت ہے، اور اسی دین فطرت اور شریعت اسلام کی تمام انبیاء علیہم السلام

تبلیغ و اشاعت فرماتے رہے، اس لئے تمام کتابیں ایک دوسرے کی مصدق آئیں

(۲) اور چونکہ یہی قرآن تمام اگلی کتابوں میں تھا اسلئے یہ تمام کتابوں کا مصدق ہوا یہانتک تو آپ کو بھی اعتراف ہے کہ بلا شبہہ ہر وحی آسمانی دوسری وحی آسمانی کی مصدق ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر وحی آسمانی دوسری وحی آسمانی کی مصدق کیونکر ہوئی؟ کیا ہر وحی آسمانی کے نزول کے وقت اس سے پہلی کتابیں صحیح و غیر محرف حال میں موجود تھیں؟ مثلاً انجیل تورات کی مصدق ہے، تو کیا نزول انجیل کے زمانہ میں توراۃ صحیح حال میں موجود تھی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر قرآن کی تصدیق و شہادت کے لئے آپ صحف سماوی اور کتب سابقہ کے صحیح اور اصل نسخوں کی موجودگی کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔؟

(۳) نزول قرآن کے زمانہ میں گرچہ صحف سابقہ کے اصلی و صحیح نسخے نہ ہوں یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن انھیں محرف نسخوں کا مصدق ہے، جس طرح ہم لوگ ایمان بالکتب کے لئے مامور ہیں لیکن اُس کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں انھیں محرف کتابوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔

اس کے متعلق آپ کا یہ ارشاد کہ "جہاں گذشتہ وحیوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں "ما اوتی" اور "ما انزل" کا لفظ لایا گیا ہے" میرے خیال میں محض لفظی گرفت اور لفظ "ما اوتی" اور "ما انزل" سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش ہے۔ ہر مسلمان یہی کہتا ہے کہ آمنت باللہ و ملئکتہ و کتبہ اور ہر شخص یہی جانتا ہے کہ ہم کتب سابقہ پر ایمان لانے کے لئے مامور ہیں، اگر گذشتہ وحیوں پر ایمان لانے کے لئے "ما انزل" اور "ما اوتی" کی قید کو باور کرلیا جائے تو کتب سابقہ کے وہ حصے جو صدر رسالت میں تحریف و ترمیم سے بچ گئے تھے، یا آج تک محفوظ ہیں گو وہ کسی قدر کم سہی، اُن کے متعلق کیا حکم ہوگا؟

اور پھر یہ کہنا بھی کسی طرح درست نہیں اور آپ نے اس حصر و استقصا میں بلا شبہہ تسامح ہوا ہے کہ جہاں گذشتہ وحیوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں "ما اوتی" اور "ما انزل" کا لفظ لایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رسول پر جو کچھ اُن کے رب کی طرف سے اترا ہے اس پر رسول

رَبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	بھی ایمان لائے اور مومنین بھی سب اللہ پر اس کے
وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ الآیۃ	فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ۔

آپ بتائیے یہاں کونسی بیان واقعہ والی بات ہے؟ لیکن پھر اس آیت کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ	ایمان والو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب
وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ	پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو پہلے
عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ	نازل فرمائی حق ایمان لاؤ، اور جو شخص اللہ سے اس کے
مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ	فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ	اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لایا، وہ بھٹک کر
ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا	دور جا پڑا۔

اب آپ کی وہ تاویل تو یہاں کسی طرح نہیں چل سکتی، اور جو تحذیر "مصدقا لما بین یدیہ" کے سیدھے سادے معنی میں آپ پیدا کرتے ہیں، ٹھیک وہی دشواری یہاں بھی پیش آ رہی ہے۔

یہ "مصدق لما بین یدیہ" اور "لما معکم" و "معہم" کے متعلق یہ میرا مشورہ اور میری دعوت نہیں کہ قرآن کی تصدیق و شہادت کو صحت سماوی کے بیج اور غیر محرف حصے تک محدود سمجھ لیجئے، بلکہ الفاظ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے۔ اور بادنیٰ تامل یہ بات ظاہر ہے، اس لئے کہ مصدق کے بعد توراۃ یا انجیل یا کتاب کے الفاظ اکثر مقامات پر مذکور ہیں مثلاً "مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ" یا "مصدقا لما بین یدیہ من الکتب" جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ "تصدیق کرنے والا اس کی جو کچھ اس کے سامنے توراۃ یا کتاب سے موجود ہے۔ اور جو حصہ کہ محرف ہو چکا۔ یا جس قدر وحی آسمانی کے ساتھ انسانی اہوا و امانی کی آمیزش ہو گئی، وہ حصہ اس قید کی وجہ سے خود بخود مستثنیٰ ہو گیا، اس لئے کہ انسانی اہوا و امانی پر نہ ہرگز توراۃ و انجیل کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ کتب الٰہی اور وحی آسمانی کا۔

اور جہاں کہیں مصدق کے بعد توراۃ و کتاب کے الفاظ نہیں، جیسے یا ایھا الذین اوتوا الکتاب

آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم" اور "ولما جاءھم کتب من عند اللہ مصدق لما معھم" وہاں بھی کوئی دشواری نہیں کہ "ما" سے مراد کتب الٰہی اور صحف سماوی کے سوا دوسری چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اس طرح بغیر کسی تاویل اور اہتمام خاص کے ساری دشواریاں خود بخود حل ہیں۔ اور آیت کی تمام وسعتیں اپنی جگہ پر قائم، یعنی قرآن "ما انزل" اور "ما اوتی" کی تصدیق وشہادت بھی کرتا ہے، جو سراسر وحی آسمانی تھیں، اور "ما بین یدیہ" اور "ما معکم" و "معھم" کی بھی یعنی جس قدر وحی آسمانی نزول قرآن کے زمانے میں ان کے سامنے یا اہل کتاب کے پاس موجود تھیں، اور اس کی بھی جو موجودہ زمانے تک محفوظ ہیں، یا جتنی بھی قیامت تک محفوظ رہیں گی۔ اور بعینہ یہ صورت یہی حکم یہی مراد آیات ایمانیات میں بھی ہے۔

اس مسئلہ میں آپ نے میری خاطر "مصدقا لما بین یدیہ" یا "بین یدیہ" کی تاویل ما سبق اور ماضی کے ساتھ فرماتے ہوئے تصدیق وشہادت کے معنی کو قبول فرمائے ہیں، اس میں صرف یہی خرابی نہیں کہ یہ تاویل "ما معکم" اور "معھم" کے ساتھ لگا نہیں کھاتی، بلکہ بڑی خرابی یہ ہے کہ آیت کی وسعت محدود اور تنگ ہو کر رہ جاتی ہے، اس لئے شکریہ کے ساتھ نامنظور۔

۵۔ کتب سابقہ کی قرآن نے جس جس طرح تصدیق کی ہے، اس کی بے شمار مثالیں قرآن میں موجود ہیں جو گویا اس اجمال کی تفصیل ہے، پھر لفظ کو دوسرے معنی کی طرف لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟

۶۔ مصدق کی تشریح وتفسیر خود قرآن میں تصدیق وشہادت کے معنی میں موجود ہے یعنی جس طرح مصدق کا لفظ قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے، ٹھیک اسی طرح تصدیق کا لفظ بھی جس کے بعد کسی ظن وقیاس، کسی اجتہاد و تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایک آیت تو سورہ یوسف کی گذر چکی، دوسری آیت ملاحظہ ہو، جو بہت زیادہ واضح ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى	اور یہ قرآن ایسی کتاب نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِیْ	بنا لے، بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے

بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ — سامنے ہیں، اور ان کتابوں کی تفصیل ہے جو

فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس ۴) — بلاشبہ پروردگار عالم کی طرف سے ہیں۔

یعنی قرآن کتب سابقہ کے صرف منزل من اللہ ہونے کا زبانی شاہد اور مصدق نہیں، بلکہ عملی طور پر تصدیق کرتا ہے، کہ ان کے احکام کا مفصل بھی ہے اور مبین بھی۔ ایک تو تصدیق کے لفظ نے مصدق کے معنی کی خود تصدیق و تعیین کر دی پھر تفصیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین نے ان تمام گتھیوں کو بھی سلجھا کر رکھدیا، کہ قرآن صحف سابقہ کے محرف نسخوں کا مصدق کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور قرآن کی تصدیق و شہادت کا یہی وہ اہم پہلو ہے، جو اہل کتاب کے آگے قرآن کی صحت و صداقت کی آفتاب سے زیادہ روشن دلیل ہے،

(۷) مصدق کے عام اور متعارف معنی تصدیق و شہادت سے اعراض میں یہی نہیں کہ اتنے شواہد مانع ہیں بلکہ ایک اور اہم اور بڑی خوبی سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے کہ یعنی اہل کتاب کو قرآن کے ایک اعجاز اور خرق عادت پر تحدی بھی کر رہا ہے، یعنی اے اہل کتاب! قرآن تمہاری کتابوں کی تصدیق ہی نہیں کرتا بلکہ اس تصدیق و شہادة میں ایک اعجاز خاص یہ ہے کہ "یبین لکم کثیراً مما کنتم تخفون من الکتٰب ویعفوا عن کثیر" تمہاری کتابوں کے ان مضامین کی تصدیق کرتا ہے، جس کو تم مبالغہ اور اہتمام کے ساتھ چھپائے رکھتے ہو، لاجرم یہ من عند اللہ ہے، ورنہ جس کا علم تمہارے احبار و رہبان علماء و پیشوا کے سوا کسی دوسرے کو نہیں، وہ قرآن کو کیونکر معلوم ہو جاتا؟ کیا قرآن کی یہ معجزنما تصدیق و شہادت ایک آیت و نشان اور ایک کھلا ہوا معجزہ نہیں؟

(۸) مصدق کے دوسرے معنی "کسی کو اس کے خیال کے مطابق سچا ثابت کر دینا" بلاشبہ مستعمل اور متداول ہے، لیکن آپ اس دوسرے معنی کو بھی جس انداز کے ساتھ استعمال فرما رہے ہیں، اس سے یہی نہیں کہ بے ضرورت اور قرآنی تصریح کے خلاف تاویل کرنی پڑتی ہے، بلکہ آیت کی تمام تر وسعت برباد ہو کر رہ جاتی ہے اور آپ کے نزدیک "مصدقا لما بین یدیہ" کے معنی یہ ہوئے، کہ قرآن اگلی کتابوں کی، پیشگوئی کو سچا ثابت کرنے والا ہے

... تاکہ اس تعین و تحدید کی کوئی وجہ اور دلیل نظر نہیں آتی۔ اور صرف پیشنگوئی کی تخصیص کس طرح کریگی سمجھ میں نہیں آتا۔ لفظ کے دوسرے معنی کو بھی اگر اس کی وسعت پر چھوڑ دیا جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآن اگلی کتابوں کو سچا ثابت کرنے والا ہے، اور یہ اس حیثیت سے صحیح ہے، کہ قرآن وہی پیغام لایا، جو کتب سابقہ نے دیا تھا۔ اور اس نے وہی تعلیمات پیش کیں، جو صحف قدیمہ میں تھیں، اور پیشنگوئی کی تخصیص کے لئے آپ کا کام نہیں نکلتا۔

نظم کلام اور "مصدقا لما بین یدیہ" کے سیاق و سباق سے بھی آپنے جو کچھ استدلال فرمایا ہے۔ میں نے اسے بھی غور سے دیکھ لیا۔ وہاں بھی آپ کو جو دشواریاں نظر آتی ہیں، محض اسی اختلاف نظریہ کی وجہ سے اگر آپ اتنے شوق کے بعد اس رائے سے متفق ہو کر غور فرمائیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ دشواریاں بھی خود بخود حل نہ ہو جائیں۔ احتیاطاً آپکے بعض استدلال کی طرف میں بھی اشارہ کر دوں۔

آپ کا سب سے پہلا استدلال سورۂ بقرہ کی آیت ۴۱ "یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ" سے ہے :-

(۱) "اوفوا بعهدی" سے ایمان بالقرآن ہی کا ایفاء عہد مقصود ہے۔ (۲) آپکے خیال میں ولا تکونوا اول کافر بہ اس لئے خاص طور پر قابل غور ہے۔ کہ یہود کو اولین منکر ہونے سے کیوں روکا گیا، آخر اس انکار میں مشرکین ہی تو پیش پیش تھے"۔

(۱) جہاں تک واقعہ میثاق کے بعد آپ جس عہد کا ذکر فرما رہے ہیں، وہاں بھی ایک عہد نہیں، بلکہ اتباع نبی امی، آپ پر ایمان لانا۔ آپ کی حمایت کرنا، آپ کی مدد کرنا، اور سب کے بعد اتباع قرآن مذکور ہے، اس لئے یہاں ایمان بالقرآن کی خصوصیت کہاں سے نکل آئی؟ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اتباع قرآن

کی اہمیت کے لحاظ سے محض اشارہ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید تاکید کے لئے "وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم" کہکر خصوصیت کے ساتھ اس معاہدہ کو یاد دلایا گیا کہ ہم نے جو نازل فرمایا ہے اُس پر ایمان لاؤ، جس کی صداقت کی دلیل خود اس کی تصدیق و شہادت ہے کہ وہ تمھاری کتابوں کی تردید نہیں بلکہ معجزانہ طور پر تصدیق کرتا ہے وہی تعلیمات بھی پیش کرتا ہے جو تمھارے پاس آچکی ہیں۔ پھر تمھیں اس معاہدہ کے پورا کرنے میں کیا عذر رد تامل ہے؟" اور اسی لئے انھیں اولین منکر ہونے سے روکا گیا۔ کہ ان کیلئے قرآن کوئی نئی اور انوکھی چیز نہ تھی۔ وہ ان تعلیمات سے اچھی طرح واقف تھے۔ بخلاف مشرکین کے کہ وہ اس حیثیت سے معذور تھے۔ قرآن سے پہلے نہ انھیں کوئی کتاب ملی تھی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان لوگوں کے پاس کوئی رسول تشریف لائے تھے۔ "وما آتیناھم من کتب یدرسونھا وما ارسلنا الیھم قبلک من نذیر" اس لئے اہل کتاب کا جرم نہایت اہم اور سنگین تھا۔

اس کے بعد آپ کو اس سورہ کی اس آیت "ولما جاءھم کتب من عند اللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا بہ" میں یہ دقت پیش آئی ہے کہ اگر "مصدق لما معھم" کا مطلب تصدیق کرنے والا قرار دیا جائے تو "کانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا" سے اس کا کیا ربط ہوگا، اور "فلما جاءھم ما عرفوا" کے کیا معنی ہونگے؟ حالانکہ ربط اس طرح بھی بالکل ظاہر ہے۔ اور "ما عرفوا" کے معنی بھی واضح کہ جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آگئی، جو ان کی کتابوں کی معجزانہ تصدیق کرتی ہے۔ اور اس کتاب کی صحت و صداقت اور من عند اللہ ہونے کی یہی دلیل نہیں، بلکہ اہل کتاب خود اس کتاب کے منتظر اور اس کے وسیلہ سے کفار پر فتح و نصرت کی دعائیں کرتے تھے، تو جب ان کے پاس وہ کتاب آگئی جسے انھوں نے اپنی کتابوں کے انداز و نہج اور تعلیمات کی یکسانی اور بشارت قدیمہ کی وجہ سے پہچان لیا، تو اس کا انکار کر بیٹھے، اس کے بعد آپ کو اس آیت "ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا

کتٰب اللّٰہ وراء ظہورھم کانھم لایعلمون" میں مصدق کے معنی تصدیق کرنیوالا قرار دیتے ہوئے یہ دشواری لاحق ہوتی ہے، کہ "پھر توراۃ کو پیٹھ کے پیچھے پھینکنے کا کیا مطلب ہوگا"

مطلب تو صاف ہے کہ جب یہودیوں کی سرکشی کا ذکر ہو رہا ہے، کہ وہ اسقدر شرارت پر کمربستہ ہیں، کہ جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں، تو ان میں کا کوئی نہ کوئی فریق اس کو بالائے طاق اٹھا کر رکھ دیا کرتا ہے، چنانچہ دیکھو جب ان کے پاس خدا کی طرف سے رسول، یعنی محمد صلعم آئے اور ان کی کتابوں کی اس طرح تصدیق کرتے ہوئے آئے جو خود ایک معجزہ ہے، تو ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب توراۃ کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا، گویا انھیں اس عہد کا جو رسول عربی صلعم پر ایمان لانے کے متعلق توراۃ میں ان سے لیا گیا تھا، کچھ علم ہی نہیں،

آپکے دونوں آخری دلائل ہیں، مصدق کو تصدیق کے معنی میں رکھنے سے، اہل کتاب پر چند طرح کی حجتیں قائم ہوتی ہیں۔

(۱) قرآن جب تمھاری کتابوں کو جھٹلاتا نہیں، ان کی مخالفت اور تردید نہیں کرتا، بلکہ تصدیق کرتا ہے، اور تصدیق بھی زبانی نہیں بلکہ عملی تو پھر تم بے وجہ قرآن کی مخالفت کیوں کرتے ہو، اور اس کو کیوں جھٹلاتے ہو؟

(۲) قرآن اپنی مخالفت کے ڈر سے تمھاری کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا اور نہ اس میں تملق و خوشامد کا کوئی پہلو ہے، بلکہ اس تصدیق و شہادت میں ایک خرق عادت ایک کھلا ہوا معجزہ ہے،

(۳) خود تمھاری کتابوں میں رسول عربی صلعم اور قرآن کی بشارتیں اور خبریں موجود ہیں، اس لئے تم ہمارے رسول اور قرآن کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہو، کہ یہ ٹھیک انھیں خبروں کے مطابق ہیں لیکن دانستہ اعراض و انکار کر رہے ہو،

اور مصدق سے آپکے مزعومہ معنی کے مطابق صرف ایک حجت قائم ہوتی ہے، کہ تمھاری کتابوں میں رسول عربی اور قرآن کے متعلق جو پیشگوئیاں ہیں، ہم ٹھیک اس کے مطابق ہیں، اور یہ حجت تو خود "وکانوا من قبل یستفتحون"

علی الذین کفروا" و "نبذ فریق من الذین اوتوا الکتب" تھا۔ ظاہر ہے "مصدق لما معہم" سے
اس میں کون سی خوبی اور قوت پیدا ہوگئی، اور دونوں کو ملا کر ایک کر دینے سے کیا فائدہ ہوا؟ یہ وہ مقامات
تھے جن سے آپ نے بہت زور و قوت کے ساتھ استدلال فرمایا تھا، اور اس کے حل کی دعوت بھی دی تھی۔ لہذا
میں نے کچھ عرض کر دیا بقیہ مقامات میں اس نقطۂ نظر سے اتحاد کے بعد نظم کلام، سیاق و سباق میں بھی کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا میں نے رسول کیلئے
مصدق کو دوسرے معنی میں استعمال کرنے کی جو صلاح پیش کی تھی اس کے لئے چند قرائن بھی پیش کر دیئے تھے۔
نیز یہ کہ یہاں تاویل کی گنجائش ہے اس لئے کہ رسول کے لئے تصدیق کا لفظ استعمال نہیں ہوا، اور کتاب کیلئے
تو تصدیق کے لفظ نے تاویل و اجتہاد کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ تاہم آپ کی تنبیہ سے ندامت ہوئی، اور اپنی اس
جرات پر، نیز ان تمام لغزشوں پر جو نادانستہ طور پر فہم قرآن میں مجھ سے ہوئی ہیں، بارگاہ رب العزت میں
عفو و مغفرت کا خواہاں ہوں، اور اپنے قصور فہم کا معترف۔ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا
اور صدق دل سے دعا ہے کہ رب اشرح لی صدری و یسر لی امری، و رب زدنی علما۔

موعظۂ حسنہ

فرصت کی گھڑیاں

از جناب مولوی ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی

قدما کا قول ہے "فطرت خلا کو ناپسند کرتی ہے"۔ خلا سے مراد مکان کا مادہ سے خالی ہونا ہے۔ لوگوں نے اپنے مشاہدہ اور استقرار سے جب دیکھا کہ کوئی جگہ کسی حال میں خالی نہیں ہوتی۔ ہم جن جگہوں کو خالی سمجھتے ہیں وہ بھی ہوا سے پر ہوتی ہیں۔ اور جب کسی خالی برتن میں پانی یا کوئی اور شے گرائی جاتی ہے تو ہوا کے نکلنے سے پہلے وہ اس میں داخل نہیں ہو سکتی تو اس حقیقت کو اس طرح تعبیر کیا کہ "فطرت خلا کو ناپسند کرتی ہے"۔ قدما نے خلاء مکان کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ اس زمانہ کے علماء طبیعین کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ البتہ وہ اس کی تعبیر دوسرے الفاظ میں کرتے ہیں۔ یعنی خلا محال ہے اور ہم کسی ایسے مکان کا تصور نہیں کر سکتے جس میں مادہ نہ ہو۔

یہ بات محسوسات کیلئے تو بالکل مسلم ہے لیکن اس کا اطلاق معنویات پر بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح کوئی مکان مادہ سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح دماغ بھی کسی حال میں فکر و خیال سے خالی نہیں رہتا۔ اگر کوئی شخص اپنے ذہن کو کسی ایک خیال سے باز رکھنا چاہے تو لامحالہ کوئی دوسرا خیال اس کی جگہ لے لیگا۔ چاہے اس کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ جب انسان پر مختلف کام آپڑتے ہیں تو ان میں سے جو زیادہ اہم ہوتا ہے یا جس کا اثر اس پر زیادہ پڑتا ہے، اس کا ذہن اسی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جب اس سے فرصت مل جاتی ہے تو اس سے کم اہم کام اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جب وہ بھی ہو چکتا ہے تو تیسرا اس کی جگہ لیتا ہے اور اسی طرح ہوتا رہتا ہے۔ گویا جس طرح وہ سیال مادے جو اپنے نوعی ثقل کے اعتبار سے متفاوت ہوں اور جن کی باہم آمیزش نہ ہوئی ہو، جب کسی برتن میں رکھدئے جائیں تو وہ اپنے ثقل کے اعتبار سے نیچے اوپر ہو جاتے ہیں، اور جب سب سے زیادہ ثقیل

... اپنی جگہ خالی کر دیتا ہے تو اس سے فوراً دوسرا خیال اس کی جگہ لے لیتا ہے اور یہ عمل تعاقب کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح ... مثلاً حل ... ذہن میں اپنی اہمیت کے اعتبار سے اوپر نیچے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں

غرض یہ ہے کہ انسانی ذہن کبھی بیکار نہیں رہ سکتی۔ ایک کام سے جہاں فراغت ہوئی۔ دوسرے میں مصروف ہو گئی۔ اگر اس کو اچھے کاموں کی طرف نہ لگایا گیا تو لامحالہ برے خیالات میں مصروف ہو جائے گی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔ "خالی ذہن شیطان کا گھر ہے"۔ عقلمند وہ ہے جو ان خطروں سے بچنے کے لئے اپنے دماغ کو اچھے کاموں میں مصروف رکھے۔ ذہن کو کام میں مصروف رکھنا وقت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ حکیم وہ ہے جو اپنے وقت کو اچھے کاموں میں صرف کرے اور ذہن و فکر سے اچھے کام لے ... شخص کا ذہن خالی ہوتا ہے تو اس میں برے خیالات اس میں گھس جاتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ فوج کے سپاہی جس زمانہ بیکار ہوتے ہیں ان کے درمیان فسادات بکثرت رونما ہوتے ہیں، اسی لئے حکومت بیکاری کے زمانہ میں فوجیوں کو مختلف کاموں میں مشغول رکھتی ہے جن میں اکثر غیر ضروری ہوتے ہیں۔ یہی حال سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور مذہبی رہنماؤں کا ہے۔ وہ اپنے متبعین اور مریدین کو مختلف فرائض و اعمال کا پابند بنا دیتے ہیں جنہیں اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد انھیں آپس کی لڑائی جھگڑے سے باز رکھنا یا ایسی باتوں میں پڑنے سے بچانا ہوتا ہے جن کا اثر ان کے اور ان لیڈروں کے باہمی تعلقات پر برا پڑتا ہو۔ یہاں ہم اس مسئلہ پر غور نہیں کرنا چاہتے کہ انسان کو زندگی کے مختلف ادوار میں یا دن کے مختلف حصوں میں کس قسم کے کام کرنے چاہئیں، کیونکہ اس مسئلہ پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں۔ انسان زندگی گذارنے کے لئے کچھ نہ کچھ اپنے لحاظ سے کرتا ہی رہتا ہے۔ ہم یہاں صرف اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انسان اپنے روزمرہ کے ضروری کاموں سے فرصت پا جائے تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ فرصت کے جو اوقات ملتے ہیں معلوم نہیں کیا معلوم ان کی قیمت کیا ہے؟ یہ گھڑیاں حقیقت میں انسان کی راہ میں ایک ایسے پہاڑ کی حیثیت رکھتی ہیں جسے، اگر کامیابی کے ساتھ طے کر لیا جائے تو اس کے پیچھے سعادت و کامرانی استقبال کے لئے کھڑی ہے اور اگر اس میں ناکامی ہوئی تو ذلت و بدنصیبی کے کھڈ میں گرنا ناگزیر ہے۔ ہم کام کے اوقات کے متعلق کچھ نہیں

سکتا جاتا ہے کہ ان میں کسی قسم کے خطرے کا احتمال نہیں ہے۔ کام کے اوقات میں انسان زبان و قدم کی لغزشوں سے محفوظ اور شیطان کے دام سے مامون ہوتا ہے لیکن فراغت کی گھڑیاں یا تو بچھو ہیں یا شہد کی مکھیاں یا تو تمھارے لیے لذیذ شہد فراہم کریں گی یا ڈنک مار کر ہلاک کر دیں گی۔ بہت سے نوجوان ایسی فراغت کی گھڑیوں کو غنیمت جان کر تے ہیں اور ان میں مفید کام کر کے ہر قسم کی چیزیں حاصل کر لیتے ہیں اور بہت سے نوجوان انھیں غلط کاموں میں صرف کرتے ہیں اور اپنی بھلائی کو ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ پس فراغت کے وقت اپنی عقل اور ہاتھ سے ہر وقت چوکنے رہو کیونکہ جس وقت ان کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا تب شیطان ان کو اپنے طور پر استعمال کرتا ہے۔

راحت کیا ہے؟

ناظرین اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ ہم کام کرنے والوں کو راحت سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ بھی جیسے جس طرح کام کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آرام کرنا بھی ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ راحت کہتے کن چیزوں کو ہیں؟

ہمیں پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کا ذہن کسی وقت بیکار نہیں رہ سکتا جب وہ اپنے روزمرہ کے کام سے فارغ ہو جائے گا تو دلچسپی کے لئے یا تو شطرنج، چوسر، بلیرڈ وغیرہ کھیلے گا یا دوستوں کے ساتھ بیٹھکر گپ شپ کریگا یا جرائد و رسائل کے مطالعہ سے دل بہلائے گا یا شراب نوشی اور قمار بازی میں وقت کاٹیگا بہرحال وہ اپنی تفریح اور دلچسپی کیلئے جو کام بھی اختیار کرے اسکی عقل ہمیشہ اپنے کام میں مشغول رہیگی اب سوال یہ ہے کہ عقلی کام آرام و تکان دونوں کا سبب کس طرح ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ راحت کا دار مدار کام ترک کر دینے پر نہیں ہے بلکہ کام میں تنوع یا تبدیلی پیدا کرنے پر ہے۔ وہ مزدور جو دن بھر بیٹھا ہاتھ سے کوئی کام کرتا ہے اس کی راحت چلنے اور ہاتھوں کو حرکت سے روک دینے میں ہے۔ وہ تاجر جو دن بھر دماغ کو اپنے کاروبار میں مشغول رکھتا ہے، اس کی تفریح مطالعہ، یا عقلی اور جسمانی کھیلوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے جبکہ اس کے ذہن کو تجارتی افکار سے نجات مل جائے۔ وہ وکیل جو دن بھر قانونی موشگافیوں میں مشغول رہتا ہے، جب ادبیات وغیرہ کا

مطالعہ کرتا ہے تو اس کے ذہن کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ بسا اوقات مضمون نگار کسی خاص موضوع پر لکھتے لکھتے تھک جاتا ہے لیکن جب اسے چھوڑ کر کوئی اور موضوع اختیار کر لیتا ہے تو اس کا قلم اس طرح چلتا ہے گویا بالکل تازہ دم ہے۔ اسی پر تمام پیشوں کو قیاس کر لو۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی کام کو مسلسل ایک نہج پر کرتے رہنے سے اعضاء میں سستی اور طبیعت میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور جب کام بدل دیا جائے تو اس سے نفس کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ ایک حال میں رہنے سے گھبرا جاتا ہے خواہ وہ کتنا ہی خوش آیند ہو۔ ایک فقیر گوشت اور عمدہ کھانوں کی تمنا کرتا ہے۔ نرم گدوں پر سونے والوں اور دیبا و حریر پہننے والوں پر رشک کرتا ہے اور انہی چیزوں کے حصول کو اپنی انتہائی خوش بختی سمجھتا ہے لیکن جب اسے یہ تمام چیزیں میسر آ جاتی ہیں تو تھوڑے ہی دنوں میں اس کا دل بھر جاتا ہے اور انھیں چھوڑ کر وہ اور کسی لذت بخش چیز کو تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہی حال تمام لذات کا ہے۔ لذت کا انحصار، مال و دولت یا غذا کی کسی خاص مقدار پر نہیں بلکہ خواہش کے مطابق ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کے اختیار کرنے پر ہے۔

ہر قسم کے کام سے کنارہ کش ہو جانا موجب راحت نہیں ہے بلکہ ایک کام کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جانا یہ باعث سکون و راحت ہے۔ لوگ حصول راحت کے لئے اپنے کاموں میں تنوع اور تبدیلی پیدا کرنے کی مختلف راہیں اختیار کرتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف ہم نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی توجہ مائل کرنا چاہتے ہیں۔ جب فراغت کے اوقات میں ہم بھی اپنے دماغ کو کام سے باز نہیں رکھ سکتے تو کیوں نہ اسے ایسی باتوں میں مصروف رکھیں جو ہمارے لئے مفید بھی ہوں اور لذت بخش بھی۔

بیکاری کے خطرات

تمھارے لئے اس وقت کوئی خطرہ نہیں جب تم کاموں میں مشغول ہو۔ خطرے کا وقت تمھاری فراغت کی گھڑیاں ہیں۔ یا تو تم انھیں لہو و لعب میں صرف کرو گے، جس کا نتیجہ وبال ہوگا۔ یا ان میں کوئی ایسا کام کرو گے جو تمھارے اور تمھاری اولاد کے لئے مفید ہوگا۔ تم کھوگے اگر دامن بچا کر فراغت کی

گھڑیاں تفریحی مقامات میں صرف کی جائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ حرج تو کچھ بھی نہیں لیکن نوجوانو! تمھیں معلوم نہیں کہ آج لہو ولعب اور فواحش میں پڑنے کی وجہ سے جن کا حال برا ہے اور جنھیں دیکھکر تم ہنستے اور افسوس کرتے ہو انھوں نے بھی اس راہ میں یہی سوچ کر قدم رکھا تھا۔ اور انھیں بھی اپنے متعلق یہ حسن ظن تھا کہ "تفرد دریا کے درمیان تختہ بندی کے باوجود وہ اپنا دامن تر ہونے سے بچا لیں گے" لیکن ان کا یہ حسن ظن غلط نکلا جن چیزوں کو انھوں نے تفریحی طور پر شروع کیا تھا، رفتہ رفتہ ان کی عادت میں داخل ہو گئیں۔ اسکے بعد قماش اشخاص ان پر ڈورے ڈالتے رہے یہاں تک کہ وہ آج درجہ بدرجہ اپنے اصلی بلند مقام سے اتر کر ہلاکت کے غار میں گر گئے۔ قہوہ کا معاملہ شروع ہوا پھر سیر کی باری آئی پھر وہسکی اور شامپین تک نوبت پہنچی اور پھر...... اور پھر...... یہاں تک کہ پستی اخلاق کے انتہائی درجہ تک پہنچ گئے اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہوا اب اگر وہ اپنی اس حالت سے رجوع بھی کرنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ اب وہ اپنی حالت پر افسوس کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ تمھیں اپنے کمال کا غرہ نہ ہو کیونکہ انسان بہت ہی ضعیف الارادہ ہے۔ تم بغیر کسی ارادے کے ایک کام کئی بار کرتے ہو، پھر رفتہ رفتہ اس کی اس طرح عادت ہو جاتی ہے کہ کوشش کے بعد بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ تم پہلے تفریح گاہوں میں کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ تجمل و تست کے اظہار سے بچنے کیلئے جاتے ہو اور ان لوگوں کو دل سے برا سمجھتے ہو جو عادتاً جایا کرتے ہیں اور اپنے متعلق گمان کرتے ہو کہ کبھی اس کے عادی نہ ہو گے لیکن تم یہ بھول جاتے ہو کہ تم آج جنھیں برا کہتے ہو وہ بھی پہلے تمھاری ہی طرح تھے اور اس کی ابتدا انھوں نے تمھاری ہی طرح کی تھی۔ لیکن آج ان کا جو حال ہے وہ تم دیکھتے ہو۔ علاوہ بریں اگر تم ان کے حال پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ ان کے لئے موجب راحت نہیں ہوتا بلکہ ہلاکت و بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ کیا رات رات بھر جاگنا اور شراب نوشی پر اپنا مال و متاع صرف کر دینا، موجب راحت ہو سکتا ہے؟ دراں حالیکہ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کی تنخواہیں نہایت معمولی ہوتی ہیں، اور وہ خود تو مزے اڑاتے ہیں لیکن ان کے بچے بھوک سے بلکتے ہیں۔ راحت و انجام کے لحاظ سے یہ اچھا ہے یا یہ کہ فراغت کے اوقات میں کوئی مفید کام خواہ پر مشقت ہی ہو کیا جائے۔

ممکن ہے تم دولتمند ہو اور تمھیں وراثت میں بہت کچھ دولت و ثروت ملی ہو۔ اور یقیناً ایسا ہی ہوگا کیونکہ جو لوگ ان برکتوں کے عادی ہوتے ہیں خود روپیہ نہیں پیدا کر سکتے۔ فرض کرو تمھارے پاس قارون کا خزانہ ہے کیا تم سمجھتے ہو وہ ہمیشہ تمھارے پاس باقی رہے گا؟ ہو سکتا ہے کہ تمھاری دولتمندی تمھیں اس برائی کا جو تمام برائیوں میں بدتر اور تمدن کے لئے زبردست خطرہ ہے یعنی قمار بازی کا عادی بنا دے۔ اس وقت تمھاری تمام دولت و جائداد دیکھتے دیکھتے تمھارے ہاتھ سے نکل جا سکتی ہے۔ آج بہت سے امیروں اور بلند کوٹھیوں میں رہنے والوں کی اولاد اپنے نوکروں چاکروں ہی کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھر رہی ہے اور نان شبینہ کی محتاج ہے۔ محض اسلئے کہ انھوں نے کام کرنا اپنی امارت کی شان کے منافی سمجھا اور اپنا کاروبار دوسروں کے ہاتھ میں دیکر خود لہو و لعب اور امیرانہ فضول خرچیوں کے عادی بن گئے، اس طرح اپنی دولت بھی ضائع کی، صحت بھی خراب کی اور خاندانی عزت و شرافت کو بھی بٹہ لگایا۔ اگر وہ کسی غریب گھرانے میں پیدا ہوتے تو غریبی ان کی پردہ پوشی کرتی اور انھیں ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رکھتی۔ اس لئے عقل و دانائی کا کام یہ ہے کہ فرصت کے اوقات کو لہو و لعب، شراب نوشی، قمار بازی وغیرہ ایسے کاموں میں صرف کرنے سے احتراز کرو جس کا نتیجہ برا نکلنے والا ہو۔ بدقسمتی سے بڑے بڑے شہروں میں بہت سے گھر قمار بازی کے مستقل اڈے بن گئے ہیں، جہاں شب و روز نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا ہے اور تاش اور جوئے کھیلے جاتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ یہ مرض ان خاندانوں میں بھی منتقل ہو چکا ہے جو علم و اخلاق کے لحاظ سے بہت ممتاز سمجھے جاتے ہیں اور جن میں پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی کافی ہیں۔ یہ لوگ اپنے نفس کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کے کھیل قمار بازی کی خاطر نہیں بلکہ تفریح و دلچسپی کیلئے کھیلتے ہیں۔ لیکن انھیں سوچنا چاہئے کہ اگر ان کھیلوں سے خود انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچے گا تو ان کی اولاد اور خاندان والوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ تفریح کا بہانہ بھی ایک عذر لنگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ تفریح کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں تو وسائل تفریح کی کوئی کمی نہیں۔ طلبہ اور پڑھے لکھے لوگ ادبی جلسے کر سکتے ہیں۔ سیاسی یا اجتماعی مسائل پر بیٹھ کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے تفریحی مشاغل پیدا کر سکتے ہیں جن میں لذت

بھی ہوا اور فائدہ بھی۔ نیز ایسے کھیل کھیلے جا سکتے ہیں جو گھریلو کہلاتے ہیں اور جن میں ایک ساتھ بیس بیس پچیس پچیس آدمی حصہ لے سکتے ہیں۔ بعض کھیل تو ایسے ہیں کہ جن سے تفریح کے علاوہ عقل و فہم کی قوت میں اضافہ بھی ہوتا ہے مثلاً وہ کھیل جن میں تاریخی یا ادبی سوالات ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کھیل عام طور پر معلوم و مشہور ہیں۔ ان کھیلوں سے ضرور احتراز کرنا چاہئے جن میں جوئے کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ اکثر سادے طریقے سے تاش کھیلنا، قماربازی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور اس کی بنا پر یا تو لوگ خود جوا کھیلنے لگتے ہیں یا ان کی اولاد کو اس کی لت پڑ جاتی ہے۔ اس قسم کے کھیلوں کے بجائے مختلف قسم کے علمی و ادبی مذاکروں اور مباحثوں کے ذریعہ دل بہلانا چاہئے۔

فرصت کے فوائد

بیسویں صدی کے نوجوانوں سے ہم صرف یہی نہیں چاہتے کہ وہ فراغت کے اوقات شر سے بچیں بلکہ ورنا وہ اپنا سارا وقت بالکل بیکار ضائع کرتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری اس سے بہت زیادہ ہے۔ فراغت کی گھڑیاں نہایت قیمتی ہیں اگر انھیں مفید کاموں میں صرف کیا جائے۔ دنیا میں ایجاد و اکتشاف یا کسی اہم کارنامہ کی انجام دہی کے سلسلہ میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ہے، ان کے حالات زندگی پڑھو۔ تم دیکھو گے کہ ان کی کامیابی کا دارومدار اس امر پر تھا کہ وہ فرصت کے اوقات کو ضائع نہیں کرتے تھے۔ رچرڈ آرکرائٹ جس نے سوت کاتنے کی مشین ایجاد کی اور روئی کے بڑے بڑے کارخانے قائم کئے، ایک معمولی نائی تھا۔ یہی حال مشہور چیف جسٹس ٹنٹرڈن اور مشہور مصور ٹرنر کا تھا۔ کیا ان لوگوں نے یہ بلند مرتبے وقت کی صحیح قدر و قیمت پہچانے بغیر حاصل کر لئے؟ تاریخ میں جن لوگوں کا نام آج خاص عزت سے لیا جاتا ہے ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ابتدائی حالت بہت پست تھی وہ محض اپنے ولولۂ کار اور گرمیٔ عمل کی بدولت بلند مراتب پر پہنچے۔ انھوں نے اپنے فرصت کے لمحات کبھی بیکار ضائع نہیں کئے۔ جو شخص فرصت کا وقت مفید کاموں میں صرف کرتا ہے وہی پرجوش اور شجاع ہے اور اسی کے متعلق کامیابی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ کوئی کتنا ہی مفلس و تنگدست ہو اسے اپنے کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ مفلس

اصل میں وہ ہے جو کاہل اور پست ہمت ہے۔ معمولی پیشہ وروں میں بہتوں نے نام پیدا کئے ہیں۔ اور بلند مراتب حاصل کئے ہیں۔ بن جونسن پہلے ایک معمولی معمار تھا۔ لیکن محض اپنی محنت سے بلند مرتبہ کا مالک ہوا۔ اس کا حال یہ تھا تجربہ آلات ہاتھ میں اور کتاب جیب میں۔ جب ذرا فرصت ملی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ اڈورڈس المونڈو جیسے انجینیر، ہیو ملر جیسا ماہر علم طبقات الارض اور الن کنھم جیسا نقاش، سب پہلے معمولی درجہ کے غریب اشخاص تھے۔ انیگو جانس اور ہرریسن جیسے مشہور موجد، یوحنا ہنٹر جیسا ماہر فزیالوجی، رمنی اور اوپی جیسے مصور، پرفیسر لی جیسا ماہر لغات مشرقیہ، یوحنا جیسن جیسا نقاش، یہ سب بڑھئی تھے۔ مشہور ماہر ریاضی سمسن مشہور نقاش، باکن شہرہ آفاق مولف فسٹر عظیم الشان ماہر طبیعی ڈولٹن، معروف سیاح ڈاکٹر لونسٹن، مشہور شاعر ٹناہل کپڑا بننے والوں میں سے تھے۔ سر کلوڈسلی شوول جیسے امیر البحر، اسٹرجان جیسا کہربائی، سموئیل ڈرو جیسا مولف، جیورڈ جیسا صحافی بلومفیلڈ جیسا شاعر، ولیم کاری اور موریسن جیسے مبلغ موچی تھے۔ اور موریسن تو صرف موچی ہی نہ تھا بلکہ موچیوں کے لئے قالب تیار کرتا تھا۔ موچیوں میں ایک بلند شخصیت کا مالک ٹوما اڈورڈس بھی گذرا ہے جس نے اپنے پیشہ کے ساتھ ساتھ تمام علوم طبیعیہ کا بھی مطالعہ کیا اور ان میں بہت مہارت حاصل کی۔ اس نے خود ایک خاص قسم کا حجری مادہ بھی دریافت کیا تھا جو اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ درزیوں میں یوحنا اسٹو مورخ، جیکسن مورخ اور انڈریو جونسن صدر ولایات متحدہ امریکہ جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ عظیم الشان کرڈینل ولسی قصاب تھا۔ یوحنا بنیان، لوہار تھا۔ مشہور مولف ہلکرافٹ سائیس تھا۔ مشہور ماہر فلکیات ہرشل سازندہ تھا۔ غرض یہ ہے کہ بیشمار اشخاص ایسے پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے فرصت کے اوقات کو مفید کاموں میں صرف کر کے علم اور دولت و عزت کے بلند مراتب حاصل کئے۔ ہمارے نوجوانوں کو بھی چاہیے کہ وہ ان کامیاب انسانوں کے رستہ پر چلکر تاش، شطرنج، بلیرڈ وغیرہ جیسے کھیلوں میں اپنا عزیز وقت صرف کرنے کے بجائے، اسے علم، اخلاق یا صنعت و حرفت وغیرہ حاصل کرنے میں صرف کریں۔ بہت سے ادنیٰ پیشہ کے لوگ ہیں جو اگر چاہیں تو فرصت کے اوقات میں کچھ پڑھ لکھ کر یا کوئی ہنر سیکھ کر اپنے ادنیٰ پیشہ سے نجات حاصل کر کے کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کر سکتے ہیں لیکن ان کے

دل میں کبھی اس کا خیال ہی نہیں آتا۔ بلاشبہ ابتداءً انھیں یہ کام بھاری معلوم ہوگا لیکن جب رفتہ رفتہ وہ اپنے تئیں اس کا عادی بنالیں گے تو انھیں اسی میں لذت ملنے لگے گی۔ دشواری صرف پہلے قدم پر پیش آتی ہے، اس کے بعد خود بخود پاؤں اٹھنے لگتے ہیں۔ عقلمند وہ ہے جو طبیعت کو فکر و مطالعہ کا عادی بنالے۔ کچھ دنوں بعد وہ خود بخود مانوس ہو جائے گی۔

ہمارے اندر بہت سے نوجوان ہیں جو تجارت، صنعت، کھیتی اور ملازمت میں مشغول ہیں اور سب کے سب ترقی اور اضافۂ آمدنی کے طالب ہیں لیکن اس کے لئے صحیح طریقہ سے کوشش کرنے والے بہت کم ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا بہت سے لوگ زمانہ کی ستم ظریفیوں کی شکایت کرتے پھرتے ہیں، اپنے نصیبے کو روتے رہتے ہیں۔ کہ ہر قسم کی لیاقت وقابلیت کے باوجود وہ محض اپنی بدقسمتی کی بنا پر اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ لیکن اگر تم ان کے ساتھ رہ کر ان کے حالات کی تحقیق کرو تو دیکھو گے کہ وہ اپنا وقت (جو سب کا سب خالی ہوتا ہے) ایک قہوہ خانہ سے دوسرے قہوہ خانہ میں، یا ایک فیاض رئیس کے دروازہ سے دوسرے رئیس کے دروازہ کی خاک چھاننے میں صرف کرتے ہیں اور مطلق کوئی کام نہیں کرتے گویا چاہتے ہیں کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے آسمان سے دولت برس پڑے یا من وسلویٰ کی طرح خود بخود کام انھیں مل جایا کرے۔ اگر تم ان سے گفتگو کرو تو لوگوں کی شکایت اور دولتمندوں کی نا اہلی و ناقدرشناسی کی ہجو سنتے سنتے گھبرا جاؤ حالانکہ ہم نے ایک آدمی بھی ایسا نہیں دیکھا جس نے بغیر سعی و محنت اور بغیر استقلال و مداومت، دولت و ثروت جمع کر لی ہو۔ اگر کوئی شخص شر و فساد کے مقامات کی سیر سے احتراز کرے اور اپنا وقت جد وجہد و سعی وعمل میں صرف کرے، تو اس کی کامیابی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ سرکاری محکموں میں ملازم ہیں وہ ہمیشہ اپنے عہدہ سے ترقی کرکے اعلیٰ عہدہ تک پہونچنا چاہتے ہیں لیکن ان میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس تمنا کے ساتھ ان علوم کو سیکھنا چاہتے ہوں جو ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی اس کوتاہی پر تنگیٔ وقت کا گلہ کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک فرائض منصبی کے ادا کرنے کے بعد جو وقت بچ رہتا ہے وہ اتنا نہیں ہوتا کہ اس میں

کوئی اہم کام کیا جا سکے وہ صرف آرام و تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم جیسا کہ پہلے کہہ چکے ہیں، کام سے بالکل دست کش ہو جانا تفریح نہیں ہے بلکہ کام میں تنوع پیدا کرنا اصل تفریح ہے۔ علاوہ بریں وہ اگر ہر روز تفریح کے اوقات میں سے چند ہی منٹ نکال لیا کریں تو بڑے بڑے کام انجام دیئے جا سکتے ہیں منٹوں ہی سے گھنٹے بنتے ہیں اور گھنٹے ہی دن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بلند پہاڑ جو ہمیں دکھائی دے رہے ہیں یہ آخر ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں جو اتنے چھوٹے ہیں کہ خوردبین کے بغیر دیکھے نہیں جا سکتے۔ جو لوگ اپنے وقت کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں وہ اپنے پیشہ کے کاموں سے فرصت پانے کے بعد اپنا وقت ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جو دوسروں کے لئے بھی نفع بخش ہوں اور ان کے لئے بھی۔ عموماً یہ لوگ انہی اوقات میں بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں جن کی ہم کوئی قیمت نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر ہارن گوڈ، لکریٹس کا ترجمہ اس وقت کرتا تھا جب وہ اپنے مریضوں کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر ڈارون نے اپنی اکثر کتابیں، اسی طرح تصنیف کیں۔ ڈاکٹر برنی جب موسیقی سکھانے کے لئے اپنے شاگردوں کے گھروں پر جایا کرتا تو درمیانی وقفہ میں فرانسیسی اور اٹالین زبان سیکھتا۔ کرک ہوائٹ نے یونانی زبان اپنے دفتر اور مجلس قضاء کے راستہ میں سیکھی۔ دگسو نے جو فرانس کا مشہور شہری تھا، ان قلیل وقفوں میں جو دسترخوان پر ایک قسم کا کھانا اٹھانے اور دوسری قسم کا رکھنے میں پیش آتے ہیں ایک موٹی کتاب تصنیف کر ڈالی۔ میڈم ڈی جنلی نے اپنی بعض کتابیں ان چند منٹوں میں لکھیں جو وہ ہر روز اپنی ایک امیر تلمیذہ کے انتظار میں صرف کرتی تھی۔ ایلیہو برٹ ایک لوہار تھا ذاتی پیشہ کے کاموں سے فارغ ہو کر زبانیں سیکھا کرتا تھا۔ اس نے ۴۰ زبانیں جن میں ۲۰ جدید ۲۰ قدیم ہیں سیکھ لی تھیں۔ غرض یہ ہے کہ تنگی وقت کا عذر بالکل ناقابل التفات ہے۔ کسی کام کو مداومت اور استمرار کے ساتھ کیا جائے تو ہر روز کے چند منٹ ہی اس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف ارادہ اور عزم کی ہے تمہیں کوئی کام ہرگز کل پر نہیں ٹالنا چاہیئے، مشرقیوں کی سب سے تباہ کن عادت یہی ہے۔ کتنے ذہین لوگوں نے اپنی عمریں بیکار رہنے، بخت و اتفاق پر بھروسہ کرنے، ہر کام کو کل پر ٹال دینے اور صرف شکوہ و عتاب پر اکتفا کر لینے

میں صرف کر دیتے ہیں۔ ہمارے نوجوان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ انگریزی، فرانسیسی، حساب، انشاء وغیرہ یعنی ان علوم میں سے کوئی نہ کوئی علم سیکھیں جن کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ جو لوگ وکالت صحافت زراعت وغیرہ جیسے پیشے کرتے ہیں انھیں غور کرنا چاہئے کہ ان کی ترقی میں کن علوم کا فقدان حائل ہے اور پھر انھیں فراغت کے اوقات میں حاصل کرنا چاہئے اور اس طرح اپنے وقت صحت اور تنخواہ کو مضر و تباہ کن کاموں میں برباد ہونے سے بچاکر اپنے نفس اور ملک کو فائدہ پہونچانا چاہئے۔

نوجوان لڑکیاں اور بیکاری

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کا تعلق لڑکوں سے تھا۔ اب لڑکیوں کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے۔ بیکاری کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہے۔ اسی پر لڑکیوں کو بھی قیاس کرو بلکہ بیکاری لڑکیوں کے لئے لڑکوں سے زیادہ مضر ہے۔ خصوصاً ان لڑکیوں کے لئے جو سمجھتی ہیں کہ وہ صرف بننے سنورنے اور فیشن برتنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور انھیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ اس کا انجام ان کے اور ان کے عزیزوں کے حق میں کیا ہوگا۔ موت سے بھی زیادہ خطرناک بیکاری ان امیر گھرانوں کی لڑکیوں کیلئے ہے جن کی ناز و نعمت میں پرورش ہوئی ہے، جو گھر کے کسی کام میں ہاتھ لگانا اپنی عزت کے منافی سمجھتی ہیں، جو خیال کرتی ہیں کہ وہ صرف زیب و زینت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ جو کپڑوں اور آرائش کی چیزوں پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی ہیں اور دل میں یہ خیال نہیں آنے دیتیں کہ روپیہ آتا کہاں سے ہے۔ جو سینے کو ہاتھ لگانا بھی توہین سمجھتی ہیں، صرف کاغذ پر اپنی ضروریات لکھ دیا کرتی ہیں اور حساب و کتاب مردوں کے ذمہ چھوڑ دیتی ہیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ بعض دولتمند اشخاص خود اپنی لڑکیوں کی عادت بگاڑتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ خادمائیں مقرر کیجاتی ہیں۔ بلکہ ایک ایک کے لئے کئی کئی خادمائیں ہوتی ہیں کوئی چائے حاضر کرتی ہے کوئی کھانا کھلاتی ہے، کوئی سنگار سنگاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جن لڑکیوں کا حال یہ ہو اور انھیں مشغول رکھنے کے لئے کوئی بھی عقلی یا جسمانی کام نہ ہو، جب ان کے جذبات بیدار ہو جائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا؟ نوجوان لڑکیاں جب عالم شباب میں بیکار

ہوں اور انکی دلچسپی کا کوئی مشغلہ نہ ہو تو لباس ہر قسم کے پرزے باوجود انکی سیرت خطرے میں نہ ہوگی؟ جس لڑکی نے سالہا سال تک مطلب زندگی بسر کی ہو کہ اسے معلوم بھی نہ ہو کہ گھر میں کیا چیز آتی ہے اور کیا جاتی ہے، ہر کام نوکر انجام دے رہے ہوں، اگر اسکے پاس مہینے کے آخر میں خادم خرچیات کا حساب لیکر آئے اور پانچ گنی کا خرچ صرف نمک کا دکھائے تو کیا وہ اسے باور نہیں کرلیں گی، حالانکہ اتنا نمک ایک مدت کو نمکین بنا دینے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ بعض لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب نئے ڈیزائن کے کوئی قیمتی کپڑا انکی طرز پر بیٹھے دیکھتی ہیں تو پھر شوہر سے اسی قسم کا کپڑا لانے کیلئے اصرار شروع کر دیتی ہیں، اگر وہ نہ لائیں تو خفا ہو جاتی ہیں، حالانکہ وہ جانتی ہیں کہ اس کپڑے کی قیمت شوہر کی ایک مہینہ کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم اس شر کا سبب دریافت کرو تو تم دیکھو گے کہ یہ محض بیکاری کا نتیجہ ہے۔ چونکہ انھیں کوئی کام کرنا نہیں رہتا اسلئے وہ اپنا سارا وقت زیبائش و آرائش یا اس کی کثرت فکر میں صرف کرتی ہیں۔ کبھی آئینہ کے سامنے ہوتی ہیں، کبھی پرستانی میں اور کبھی کپڑے بدلنے کے کمرے میں۔ اور اگر کسی جلسہ وغیرہ میں شریک ہوتی ہیں تو انکی توجہ صرف نئے نئے فیشن کے کپڑوں اور قسم قسم کی بیوگیوں کے دیکھنے میں مشغول رہتی ہیں۔ جلسوں کی شرکت عموماً ان کے اور ان کے شوہروں کی معیشت کو منغص کر دیتی ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہاں کسی عورت کو کوئی ایسا نیا کپڑا پہنے ہوئے دیکھ لیں جو ان کے پاس نہ ہو۔ اگر ان عورتوں کی صحیح تربیت ہوئی ہوتی، بچوں کی تربیت اور امور خانہ داری کا انھیں عادی بنایا گیا ہوتا، روپیہ پیسہ کی قیمت سے انھیں آگاہ کیا گیا ہوتا تو انکی توجہ گھر کے انتظام اور اخراجات کو کم کرنے کی فکر میں صرف ہوتی۔ اور بجائے قیمتی کپڑوں پر فخر کرنیکے تدبیر منزل اور تربیت اولاد وغیرہ پر فخر کیا کرتیں۔ اس صورت میں انکا وجود شوہر کیلئے وجہ راحت اور گھر کیلئے زینت ہوتا، اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں کوئی عار نہ ہوتا۔ وہ حقیقی عار اسی کو سمجھتیں کہ اپنے جسم کی آرائش و زیبائش کا خوب اہتمام کیا جائے اور گھر کو میلا کچیلا رکھا جائے۔ اگر یہیں تک ہوتا تو خیر چنداں حرج نہ تھا، افسوس تو یہ ہے کہ یہ عورتیں اپنی اولاد کیلئے برے نمونہ کا کام دیتی ہیں اس لئے ان کے تمام برے اوصاف ان میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں اس طرح گھر کر جاتے ہیں کہ مدرسوں کی تربیت اور اساتذہ کی تعلیم کچھ اثر انداز نہیں ہوتی۔ سب سے خطرناک برائی جو اولاد کو اس قسم کی ماؤں سے وراثت میں ملتی ہے۔ فرصت کے اوقات کا غلط استعمال ہے۔

(تلخیص)

حکمت غرب

مارکس اریلیس کے خیالات

(۲)

از جناب مولوی حنیف احمد صاحب صدیقی ایم اے

گناہوں کا موازنہ کرتے ہوئے اگرچہ یہ موازنہ بذات خود عامیانہ ہے، نہ کہ عالمانہ تھیوفراسٹس نے The Characters میں بالکل صحیح فلسفہ کی ترجمانی کی ہے کہ ہوا و ہوس کا گناہ غیظ و غضب کے گناہ سے کم قابل معافی ہیں کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان کرب اور ایک قسم کے غیر شعوری دماغی ہیجان سے متاثر ہو کر عقل سے بے بہرہ معلوم ہوتا ہے برخلاف اس کے وہ شخص اپنے گناہ میں زیادہ پست، ذلیل و بزدل نظر آتا ہے، جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہو کر صرف اس وجہ سے گناہ کرتا ہے کہ وہ ایسا کمزور ہے کہ تعیشات کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ پس تھیوفراسٹس کا یہ خیال بالکل صحیح اور فلسفیانہ ہے کہ ایسے گناہ جن کی بنیاد ترغیبات نفس پر ہے ان گناہوں سے کہیں زیادہ قابل نفرت ہیں جن کی بنا غیر لطف طرازی [illegible] ہے۔ کیونکہ اگر آپ بطور مجموعی دونوں گنہگاروں کے حال پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک صرف اس وجہ سے مغلوب غیظ و غضب ہوا کہ اس کو پہلے زخم لگ چکا تھا، برخلاف اس کے دوسرا گنہگار دیدہ و دانستہ مرتکب گناہ ہوا اور اپنے ہی خواہشات نفس کے ارادے کے ساتھ ہو گیا۔

تو اپنے ہر قول، عمل اور خیال کو ایک ایسے شخص کے شایان شان بنا دے جو ہر لحظہ زندگی کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہے، کیونکہ اگر خدا کا وجود ہے تو انسانی صحبت سے جدائی ہرگز ہیبت ناک نہیں ہے۔ کیونکہ تجھکو برائیوں میں گرفتار کرنا فطرت ربانی سے بالکل بعید ہے۔ لیکن اگر خدا کا وجود نہیں ہے یا اگر اس کا وجود ہے لیکن پھر بھی و

نوع انسان سے بے نیاز ہے تو پھر ایسے غیر یزدانی اور محروم رُخ دنیا میں دن کاٹنے سے کیا حاصل ہے؟ لیکن
خدا موجود ہے اور وہ ہماری اور ہمارے خاندان کی فکر رکھتا ہے کیونکہ اس نے انسان کو مختار کل بنا دیا ہے کہ اس سے
کوئی ایسی لغزش نہ ہو جو در حقیقت برائی ہے اور اگر بقیہ چیزوں میں برائی کا کچھ شائبہ تھا بھی تو خدا کو پہلے ہی اسکا
علم ہے اور اس نے ہم سب کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے احتراز کریں۔ یہ کیونکر ممکن ہو کہ وہ جس نے انسان
کو برا نہیں پیدا کیا وہ انسان کی زندگی کو برائیوں سے مسخ کر دے۔ پس یہ ناممکن تھا کہ ہمہ گیر فطرت یوں
فروگذاشت کے جرم کی مرتکب ہوتی۔ یہ (ہمہ گیر فطرت) علیم، خبیر اور دانائے مطلق ہے اور ان صفات کی حامل
ہو کر وہ قادر مطلق ہے جس کو خطاؤں کا پہلے سے پورا علم ہوتا ہے اور وہ ان کی اصلاح کرتی ہے۔ نہ تو یہ ممکن تھا
کہ وہ راہ مستقیم سے ہٹتی گمراہ ہو جاتی (قطع نظر اس سے کہ اس کا سبب قوت یا حسن تدبیر کا فقدان ہو) کہ وہ
بنا بر نیکی اور برائی کو نیک اور بد دونوں پر یکساں کارفرما ہونے دیتی۔ اصل یہ ہے کہ حیات اور موت، نیکنامی
اور بدنامی، رنج و راحت، دولت و عسرت، دونوں عادل اور غیر عادل کے حصہ میں آتی ہیں کیونکہ یہ چیزیں
نہ جائز ہیں نہ ناجائز نہ تو اچھی ہیں اور نہ بری۔

تبدیلی اور انحطاط کی یورش تمام چیزوں پر نہایت سرعت سے ہوتی ہے۔ دنیا میں ہمارا وجود فنا ہو جاتا
ہے اور امتداد زمانہ اس کی یاد کو بھی مٹا دیتا ہے۔ ان چیزوں پر غور کیجئے جن کی بنیاد عموماً حس پر ہے خصوصاً
ترغیبات تعیش، کرب و محن کی دہشتناکیاں، نمود و تصنع کی ساری داستانیں یہ تمام چیزیں نازیبا نمائش، نفرت
کثافت، آلودگی اور نجاست کی مرادف ہیں۔ وہ بالکل مردہ ہیں۔ وہ بالکل رستے ہوئے ناسور کی مانند ہیں۔ ان
تمام چیزوں پر دماغ کی کارفرمائی ہونی چاہئے۔ دماغ کے سامنے یہ سوال ہونا چاہئے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی تعریف
توصیف اور تخیل پر شہرت کا مدار ہے۔ اس کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ موت کیا چیز ہے؟ اس کو اس بات پر غور کرنا
چاہئے کہ اگر کوئی ان مصنوعی ہیبتناکیوں کا ازالہ کر کے جنکو ہمارے تخیل نے موت سے وابستہ کر رکھا ہے موت کو

صرف نوعیت پر غور کرے اور اس خیال کا تجزیہ کرے تو معلوم ہوگا کہ موت کچھ بھی نہیں ہے بلکہ صرف فریضۂ فطرت ہے اور اس سے بجز ایک بچے کے کون خوف زدہ ہوگا۔ موت فطرت کا صرف ایک فریضہ ہی نہیں ہے بلکہ عافیت فطرت کے لئے ایک نہایت ضروری شے ہے۔ ایسے دماغ و ذہن کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کیسے اور اپنی کس صفت سے انسان خدا رسیدہ ہو سکتا ہے اور کن حالات میں اس صفت کی کارفرمائی مفید ترین ہوگی۔

اس انسان سے زیادہ بدحال و بدبخت کوئی نہیں جو ہمیشہ ایک دائرہ میں سرگرداں ہے اور بقول پنڈر (Pindar) طبقات الارض کی چیزوں کا متلاشی ہے اور ہر وقت اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ دوسروں کے دل کا راز معلوم کرے اور وہ ہمیشہ اس بات کے سمجھنے سے بالکل عاری ہے کہ اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنا ذاتی وصف معلوم و محسوس کرے اور دیانت کے ساتھ اس پر کاربند ہو۔ اس خدمت کی بجاآوری یوں ہو سکتی ہے کہ اس وصف یا خوبی کو جذبات یا خواہشات اور بگڑے پن سے مسخ نہ کردے۔ اور نہ تو احکام الٰہی یا دیگر انسانی برتاؤ سے گھٹ گھٹ کر اس صفت کو داغدار بنادے۔ کیونکہ ہمارے معاملات ایزدی کا فیصلہ ہے کہ ہم رشتۂ احترام کو مضبوط پکڑیں۔ کیونکہ انسان کے اعمال دراصل اپنے بھائیوں کے اعمال ہیں اور اس وجہ سے ہم کو ان سے محبت کرنی چاہئے۔ یا کبھی کبھی شاید ہمیں ان پر ترس کھانا چاہئے کیونکہ وہ خیر و شر کی تمیز ہی نہیں کرتے۔ ان کے سامنے ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہے جو اس تاریکی سے کہیں زیادہ سیاہ ہے جو ہمارے لئے روشنی اور تاریکی کو یکساں بنادیتی ہے۔

اگر تیرا پیمانۂ حیات تین ہزار سال کا کردیا جائے اور اس میں ایسے لاتعداد تین ہزار سال شامل کردئے جائیں تو تو یاد رکھ کہ کوئی آدمی بجز اپنی موجودہ حیات کے دوسری حیات نہ ضائع کرتا ہے اور نہ کوئی دوسری حیات بجز موجودہ حاصل کرتا ہے۔ بس طویل ترین پیمانۂ حیات مختصر ترین پیمانۂ حیات کے برابر ہے زمانۂ حال پر سب کی کارفرمائی برابر مساوی ہوتی ہے۔ پس جب موجودہ زمانہ ضائع ہوجاتا ہے تو یہ نقصان

ہی سبب کے لئے یکساں ہوتا ہے۔ یعنی موت کے واقع ہونے کے وقت کا کم سے کم حصہ ضائع ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے لئے گذشتہ اور آئندہ کا ضائع ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ اس متاع کا لٹ جانا جو ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کو یاد رکھنا ہمارے لئے مناسب ہے۔ اول یہ کہ ازل سے ہر چیز بالکل یکساں اور ایک ہی دائرہ میں رواں ہے اس لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک شخص وہی مناظر صدیوں یا دوامی دیکھتا ہے دوسرے یہ کہ وہ دونوں اشخاص جن میں ایک پیری اور دوسرا شباب میں مرتا ہے۔ برابر مساوی خسارہ میں رہتے ہیں۔ موت ہم کو صرف زمانہ حال ہی سے محروم کرتی ہے کیونکہ حال ہی ہمارا کل متاع ہے بالفاظ دیگر حال ہی سب کچھ ہے جس کو ہم کھو سکتے ہیں۔

ادبیات

خیر مقدم!

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے وارود مدرسۃ الاصلاح کے موقع پر ہمارے فاضل دوست جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب کی یہ نظم جو اسی موقع کے لئے لکھی گئی تھی، پڑھی گئی، اور حاضرین نے بالاتفاق بہت پسند فرمایا۔ یہ اپنی ادبی اور شعری خوبیوں کی بدولت اس قابل ہے کہ الاصلاح کے قارئین بھی اس سے محظوظ ہوں۔ (اڈیٹر)

بحمد اللہ کہ ایزد دعوتِ ما را مجیب آمد — نوید کامرانی بہر جانِ ناشکیب آمد
ز سحر انگیزیِ خلق تبسم کیست کایں محفل — گلستاں در گلستاں از وفورِ عطر طیب آمد
سزد ایں ناحیہ گر بر عروج بخت خود نازد — کہ اکنوں سوئے او اہل معارف را حبیب آمد
عجب نبود دریں ویرانہ از ذوق مشتاقاں — کہ خود آوازۂ فضل و کمال او نقیب آمد
ندا آید کنوں از خوابگاہِ حضرت شبلی — خوشا یارے کہ با آں دولتی منزل قریب آمد
چراغ دودۂ افغاں، فروغ دیدۂ شروان — کہ ذاتش در نظام آباد ہندوستاں نجیب آمد
حیاتش یادگارے آمد اسلافِ گرامی را — کہ او آں گنج ہائے دین و دانش را رقیب آمد
ز ہر حرفش گل خنداں لطافت دامن گیرد — صریر خامہ اش گوئی نوائے عندلیب آمد
وجودش مجمع البحرین آمد دین و دولت را — کہ خلقش بر نہاد او بدر خالق نجیب آمد
کنوں در جامعیت مثل او دیگر نمی بینم — تقی آمد، نقی آمد، ادیب آمد، خطیب آمد

سزد امروز اگر این سر آید بر خویشتن بالد

کہ از فیض قدوم کامگار خویش نصیب آمد

غزل

(از حضرت بیخود دہلوی)

پریاں خجل ہیں یوسف کنعاں کے سامنے ۔ سب کچھ ہے چاند گل ہوئے انساں کے سامنے

دیوانگی میں چاک جگر کا ہوں پر ادار ۔ رہتے ہیں میرے ہاتھ گریباں کے سامنے

ذروں میں دیکھتا ہوں ضیا آفتاب کی ۔ کب ہے حباب صاحب طوفاں کے سامنے

آنکھوں عذاب اک ترے دوری کا مرحلہ ۔ دوزخ بھی گرد ہے غم ہجراں کے سامنے

ہم کو بتا تو دیجئے کتنے پئیں گے زہر ۔ کب تک جگر رہے صف مژگاں کے سامنے

میں جاں نثار باغ تماشا حسن کا پھول ہوں ۔ دیکھو بہار گلشن خنداں کے سامنے

لو بعد مرگ نخل تمنا ہرے ہوئے ۔ کوئی کھڑا ہے گور غریباں کے سامنے

میں گمرہان عشق کی منزل کا ہوں نشاں ۔ ہے باغ خلد میرے بیاباں کے سامنے

اے سوز دل کی آہ شرر بار کھینچ کر ۔ برسا دے پھول ابر بہاراں کے سامنے

بیخود کا آپ شیشۂ دل ہم سے پوچھئے

وہ ہے شراب خانۂ طوفاں کے سامنے

تلخیصات

آرزوؤں کا جال

گزشتہ دو سالوں کے اندر پروفیسر ولیم مارستان نے تقریباً تین ہزار اشخاص کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ اس زندگی میں تم کیا چاہتے ہو؟ تمھاری بہتر سے بہتر آرزو کیا ہے؟ اس کے جواب میں تقریباً فیصدی ۲۳ آدمیوں نے یہ جواب دیا کہ ہم موجودہ مصائب کو محض مستقبل کی خوشگوار توقعات پر انگیز کر رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ جواب آرام طلب اور راحت پسند لوگوں کا ہے۔ جو حال کے حقائق سے محض اسلئے متحمل رہتے ہیں کہ شاید مستقبل میں وہ غلط ثابت ہو جائیں۔ دنیا کے بیشتر لوگوں کا یہی حال ہے۔ ان کی جولانگاہ ہمیشہ خیالی دنیا ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر مزدور اور ملازمت پیشہ لوگ اپنی موجودہ حالت پر محض اس لئے قناعت کرتے ہیں کہ شاید آگے چلکر معاش کی کوئی آسان صورت پیدا ہو جائے۔

کسی عراقی کی دوکان میں دو ملازم کام کرتے تھے۔ کسی وجہ سے مالک دوکان نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں کی تنخواہ نصف کر دیجائے۔ ان میں سے ایک نے بادل ناخواستہ اور دوسرے نے بخوشی اس فیصلہ کو منظور کر لیا اور دونوں حسب سابق کام میں مشغول رہے۔ کچھ دنوں کے بعد پہلے نے اپنے کام میں کوتاہی کرنی شروع کی اور دوسرا اسی طرح بحسن و خوبی اپنے فرائض میں سرگرم رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مالک نے مجبور ہو کر پہلے کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد دوسرے ملازم کی تنخواہ حسب سابق کر دی۔ یہ واقعہ ان لوگوں کے لئے ایک درس عبرت ہے جو موجودہ تکلیفوں سے گھبرا کر مستقبل کی موہوم امیدوں سے تسلی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پروفیسر موصوف نے ایک شادی شدہ خاتون سے پوچھا کہ "آپ کا مقصد زندگی کیا ہے؟" خاتون نے جواب دیا: "اس وقت میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ میرا شوہر پنشن پانے لگے۔ اور میرے تمام بچوں کی شادی ہو جائے۔ اس کے بعد بقیہ زندگی عیش سے گذاری جائے۔" بالآخر میاں کی پنشن بھی ہو گئی اور لڑکوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ لیکن سکون قلب اور عیش جو تمام آرزوؤں کا منتہیٰ تھا، اس سے ہنوز محرومی ہی رہی۔ بلکہ لڑکوں کی شادیوں کے بعد بہوؤں نے اکر بڑی بی کی زندگی اور تلخ کر دی۔ اور اس دنیاے دوں کے حالات کے اعتبار سے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ مستقبل کے شیریں خوابوں کی تعبیر عموماً اتنی ہی تلخ ہوتی ہے۔ لیکن اس بدبخت انسان کی بدبختیاں کتنی حیرت انگیز ہیں کہ آج کا اطمینان کل کی امیدوں میں نذر کر رہا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ آج دہ تلخ و ناخوش گوار زندگی کے کانٹوں میں وہ پھول بھی ہے جو اگر مل جائے تو دولت دوجہاں ہاتھ آجائے۔ لیکن اول تو اس بات کا اعتبار کسے، اور اگر اعتبار بھی ہو تو وہ نگاہ دوربیں کوئی کہاں سے لائے، جو کانٹوں کے اندر ان پھول کو چن لائے۔

کسی شخص کو اپنے مستقبل پر اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہئے کہ حال کی مشکلات کا حل تمام تر اسی پر چھوڑ دے۔ کسی کو کیا خبر کہ "فردا چہ زاید؟" اگر کشتی بھنور میں ہے تو بازو کی ساری طاقت صرف کر ڈالو۔ ممکن ہے اس کشمکش میں ساحل مراد مل جائے۔ مگر صرف اس امید پر کہ ان طوفانی ہواؤں کے بعد باد موافق چلے گی اور وہ آپ سے آپ ساحل کے مرغزاروں تک پہنچا دے گی۔ انسان کا وہ بھولا پن ہے جس پر صرف ماتم کیا جا سکتا ہے۔ دانا وہ ہے جو اپنے حال پر نظر رکھے اور زمانہ کی ہر مصیبت کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرے۔ ماضی کو بھول جائے۔ مگر اس کے بخشے ہوئے تجربات کو زاد راہ بنائے۔ مستقبل سے بے پروا ہو جائے۔ مگر اس کی ضروریات کو سوچتا رہے۔ حاضر جب تک تمہارے سامنے ہے اس سے بہادری کے ساتھ لڑو اور جب آگے بڑھو تو اپنے پیچھے ایک فتحمند میدان چھوڑ دو۔ دنیا میں انسان کی اخلاقی تربیت کے لئے جس طرح ماں کی چھاتی کا شیریں

دودھ ضروری ہے۔ اسی طرح مصائب کا امر بھی ناگزیر ہے۔ جسم کی پرورش غذا سے ہوتی ہے مگر روح کی بالیدگی اور عقل کی تربیت مشکلوں ہی کے اندر ہے۔ ان ہی تاریکیوں کے اندر سے تجربات کی وہ روشنی نمودار ہوتی ہے جو ہر وادی میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

اکثر انسان اس آرزو میں گم رہتے ہیں کہ کسی طرح کہیں مال کثیر ہاتھ لگ جائے تاکہ عیش سے زندگی گذاریں اور تمام دنیا کی سیر و سیاحت کا لطف اٹھائیں لیکن قبل اس کے کہ ان کی یہ خواہش پوری ہو انقلاب دہر ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ دیتا ہے اور ساری زندگی اسی موہوم آرزو کی نذر ہو کے رہ جاتی ہے۔

بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ایک زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ کے بڑے شائق تھے، یہ چیز ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد مطالعہ سے جی چرانے لگے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس سے بالکل بیزار ہو گئے اور اس خیال سے تسلی حاصل کرنے لگے کہ "جب وقت ملیگا تو فلاں کتاب پڑھیں گے"۔ یا "کسی دوسری فرصت میں یہ کام کریں گے"

حقیقتاً ایسا کرکے انھوں نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔ اسلئے کہ جس فرصت کا وہ خواب دیکھ رہے تھے وہ ان کو کبھی نہیں ملی کیونکہ فرصت کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر اس کو تلاش کرو تو نہیں ملتی۔ اسکی تلاش میں جو نکلے سب کھوئے گئے۔

ایک بلند پایہ مصنف کا قول ہے کہ "اگر ہم روزانہ دس منٹ بھی اپنی عقلوں کی تربیت اور ان کے سنوارنے میں گذاریں جب بھی ہمارے لئے بہت مفید ہے۔ لیکن اگر ہم محض آیندہ پر تکیہ کرکے بیٹھ رہیں کہ بوقت فرصت دیکھا جائیگا تو یہ ہمارے لئے سم قاتل ہے۔

سطور بالا سے تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ صرف مستقبل کی لذیذ آرزوؤں میں حال سے بے پروا ہو جانا صحیح نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ صرف حال ہی پر نظر رکھو اور مستقبل کو نظر انداز کر دو، نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ حال و مستقبل دونوں کا دامن ہاتھ میں ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے اور صرف مستقبل ہی پر نظر رکھوگے تو تمہاری مثال گویا اس شخص کی ہوگی جو ہمیشہ عالم خواب کی سیر کر رہا ہے۔ غور کرو، تم زمانۂ حال سے گذر رہے ہو اور تم اس وقت کو یوں ہی ضائع کر رہے ہو، بتاؤ تم مستقبل کے لئے کیا کر رہے ہو؟

ع۔ ر ناصر

آنکھوں سے سننے والے

پیدائشی بہرے اور وہ انسان جو بعد میں بہرے ہو جاتے ہیں کچھ ایسا فرق نہیں ہوتا البتہ دونوں کے احساسات میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ پہلے کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی قوت کم ہے اور دوسرے کو یہ احساس ہے کہ اس سے ایک حاسہ زائل ہے لیکن یہ دوسرا بڑی کوفت اور پریشانی کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے حافظہ میں شیریں نغموں، اور پرشور ہنگاموں کی جو یاد محفوظ ہوتی ہے وہ اس کو انہی نغموں اور ہنگاموں کے لیے بیچین رکھتی ہے اور جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اب ان سے متمتع ہونے سے وہ قاصر ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے بہرے قدرتی طور پر بولنے والے ہونٹ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کہ دیکھیں وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کو کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔

اس زمانہ میں بہروں کی تعلیم کے لئے بے شمار مدرسے قائم ہو چکے ہیں، جنھیں ہونٹوں کے حرکتی اشارات سکھا کر ان کو اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی باتیں سمجھ سکیں۔ یعنی سماعت کا حاسہ جو وہ کھو چکے ہیں اس کا کام بھی وہ آنکھوں سے لینے کی مشق پیدا کر لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ مشہور مدرسہ امریکہ میں اڈورڈ منشی کا ہے۔

اڈورڈ منشی کا قصہ عجیب و غریب ہے۔ اس کو سنکر وہی مشہور مصرعہ یاد آتا ہے ع عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد بچپن میں بہرا ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ کے دوا علاج کے بعد جب اس نے دیکھا کہ اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں ہے تو اس نے ارادہ کر لیا کہ اس بے مزہ زندگی کا قصہ ہی پاک کر دے۔ یہ ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے۔ جب وہ چودہ برس کا تھا۔ لیکن غور کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے سوچا کہ زندگی جیسی عزیز متاع مفت میں ضائع کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کو کسی عمدہ مصرف میں صرف کیا جائے اور جب مصرف کی تعیین کا سوال سامنے

آیا تو اس کو سب سے اچھا مصرف یہ نظر آیا کہ اپنی زندگی دنیا کو بہرے پن کی مصیبت سے رہائی دلوانے میں صرف کرے۔ چنانچہ یونیورسٹی کی تعلیم نہایت نمایاں طور پر ختم کرنے کے بعد وہ نیویارک کے ایک مدرسہ میں داخل ہو گیا جس میں ہونٹوں کے اشارات کے ذریعہ پڑھنے کی تعلیم دیجاتی تھی۔ اس مدرسہ کی تعلیم بھی اس نے پوری کامیابی کے ساتھ ختم کی۔ اور اس کے بعد اس نے خود ایک مدرسہ قائم کیا جس میں یہی تعلیم نہایت سیدھے اور آسان طریقہ پر جاری کی۔ اس مدرسہ میں ہر طبقہ کے صدہا طلبہ جمع ہو گئے۔ اور اس کے مصارف کی شکل اس نے یہ نکالی کہ مدرسہ کے غریب طلبہ کی کفالت کا بار مستطیع اور دولتمند طلبہ پر ڈالدیا۔ اس وقت اس مدرسہ کی عمر صرف ۵ سال ہے لیکن امریکہ کے تمام گوشوں میں اس کی کثرت شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ اور آج بے تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج یہی مدرسہ ہزاروں بہروں اور اونچا سننے والوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور ہے۔

اس پورے ادارہ کی نگرانی نیویارک کے بہروں کی انجمن ہے۔ جس کے تمام مدرسین و عہدہ داران دوسرے لیڈروں کے سوا بہرے ہیں تاہم اس کے کسی گوشہ میں آپ کبھی نہ تو کوئی بلند آواز سن سکتے نہ کسی شخص کو مکبر الصوت کے استعمال کی ضرورت پیش آتی اور نہ کوئی شخص کسی بات کرنیوالے سے اعادہ کلام کا خواہشمند ہوتا، کیونکہ وہ گفتگو کرنیوالے کے ہونٹوں کی حرکت سے ایک ایک لفظ بالکل ٹھیک ٹھیک پکڑتے ہیں۔

دس برس ہوئے اس انجمن نے نیویارک کے محکمہ تعلیم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مدارس کے طلبہ میں اس امر کی تحقیقات کرے کہ کتنے طالب علم اونچا سننے والے ہیں۔ کیونکہ امریکہ میں تیس لاکھ طلبہ ایسے ہیں جو اگر ان کا علاج نہ کیا گیا تو نپٹ بہرے ہو جائیں گے لیکن محکمہ تعلیم نے انجمن کے اس مشورہ کی طرف توجہ نہیں فرمائی نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن کو ایک مفصل رپورٹ شائع کر کے یہ بتانا پڑا کہ محکمہ تعلیم کی اس غفلت سے کیا کیا مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ انجمن کی تحقیقات کے لحاظ سے اونچا سننے والا طالب علم اپنے دوسرے ساتھیوں سے دو تین سال پیچھے رہتا ہے کیونکہ وہ استاد کی تقریر کے بہت سے حصے سننے سے بالکل قاصر رہتا ہے۔ اور اس طرح ہر طالب علم سالانہ ۴۰ پونڈ

کا بار محکمہ تعلیم پر پڑتا ہے۔ حالانکہ اگر صرف چند ہزار پونڈ محکمہ تعلیم اونچا سننے والے طلبہ کے علاج پر صرف کردیا کرے تو وہ ہزاروں پونڈ سالانہ بچا لے۔

ان معقول دلیلوں نے محکمہ تعلیم کو مجبور کیا کہ وہ اس معاملہ کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں اس نے ۱۰ لاکھ طلبہ کی قوتِ سامعت کا امتحان کرایا جن میں ۸۰ ہزار طلبہ ایسے نکلے جن کی قوتِ سامعہ اوسط سے کم تھی۔ ان میں سے ۱۰ ہزار کو اس نے علاج کے لئے بھیج دیا اور ۷۰ ہزار ان مدارس میں داخل کرادیئے جو ہونٹ کے اشارہ کے ذریعہ تعلیم دیتے ہیں۔

اس تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ مدرس بغیر آواز نکالے ہوئے صرف ہونٹ کی گردش سے کوئی لفظ ادا کرتا ہے۔ بہرا اس کو بار بار دیکھکر اس طرح اپنے حافظہ میں محفوظ کرلیتا ہے۔ جس طرح کوئی سننے والا حروف کی ترکیب اور ان کی کیفیت نطق کو محفوظ کرلیتا ہے۔ مدرس اس کیلیے پہلے بالکل بسیط اور متشابہ الفاظ انتخاب کرتا ہے مثلاً باب، تاب، غاب، دال، ذال، سال۔ جب استاذ کئی بار ان کو کہہ چکتا ہے تو طلبہ بھی اس کو آواز کے ساتھ دہراتے ہیں اور مدرس الفاظ کے انتخاب میں اس امر کا لحاظ رکھتا ہے کہ ان کے حروف اکثر وہ ہوں جو ہونٹ سے ادا ہوتے ہیں۔

لیکن اس طریقہ میں ایک مشکل یہ ہے کہ اس سے آدمی ہر لفظ کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ ۵۰ فیصدی آوازیں ایسی ہیں جن کو ہونٹ کی حرکت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ یا تو حلق سے نکلتی ہیں یا منہ کے اطراف سے لیکن اگر ایک آدمی ہونٹ کی حرکت سمجھنے کی پوری مشق بہم پہنچالے تو سیاق کلام کی رہنمائی سے بغیر گفتگو کو بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

ان مدارس کا مقصود صرف یہی نہیں ہے کہ بہرے یا اونچا سننے والے طلبہ گفتگو سمجھنے لگیں، بلکہ اس گروہ کی تمام اجتماعی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے مرکز ہوتے ہیں۔ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ جو لوگ بہرے ہوتے ہیں، یا اونچا سنتے ہیں وہ ان کاموں کے لئے نہایت موزوں ہوتے ہیں جنکا تعلق شور و ہنگامے

انگسدہ کر محض غور و فکر سے ہو۔ مثلاً تحریری کام، یا حسابی مشاغل یا ٹائپ کا کام۔ بلکہ اکثر حالات میں یہ کام بہتر طریقہ پر صرف وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں۔ جو حاسہ سماعت سے بالکل محروم ہوں۔ ان مدارس کے ایک نگراں کی رائے یہ ہے :۔

" بہروں یا اونچا سننے والوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ مہربانی کرے اور کسی کام میں لگا دے تو وہ اس مہربانی کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنا وقت فضول کاموں میں صرف نہیں کرتے بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے وقت کا تمام حصہ مفید کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ وہ برابر کام میں مشغول رہتے ہیں اور اپنے طریق عمل میں کبھی کسی قسم کا تغیر نہیں پسند کرتے۔ اور یہ ایک ایسی خوبی ہے کہ اس کی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے۔ یہ کام کے نظم کو ہمیشہ ایک طریق پر قائم رکھتی ہے جو کامیابی کے لئے بہترین ضامن ہے۔ علاوہ ازیں ایسے لوگوں کو اپنی آنکھوں ہی سے کانوں کا کام بھی لینا پڑتا ہے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بصارت نہایت تیز ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہر کام میں وقت رسی اور باریک بینی کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

تقریظ و تبصرہ

واردات مصنفہ منشی پریم چند آنجہانی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۹۹ صفحے۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ کاغذ عمدہ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

منشی پریم چند آنجہانی کے تیرہ افسانوں کا یہ ایک خوبصورت مجموعہ ہے اور ہر افسانہ اپنی جگہ پر لاجواب۔ منشی جی کے افسانے سرتاسر ہندوستانی تخیل پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ اکثر ٹھیٹ ہندوستانی پلاٹ تیار کرتے ہیں اور اس میں ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ ہندوستانی زندگی، ہندوستانی تمدن و معاشرت اور ہندوستانی المناکیوں کی صحیح تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے ہندوستانی کیرکٹر اپنی اصلی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ افسانہ، افسانہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں انکی یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہے۔

صحیفۂ چین۔ مترجمہ سید اسد علی انوری فریدآبادی۔ بی۔ اے۔ سی۔ آئی۔ ایف۔ ایس تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۰۸ صفحے کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ہے ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ دہلی

یہ چین کے مشہور رہنما اور فلسفی کنفوشس کی کتاب شوکنگ کا ترجمہ ہے۔ ایشیائی ممالک میں چینی تمدن کو خاص عظمت حاصل رہی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ہم اس سے قریب تر ہونے کے باوجود اس کے حالات و خصوصیات سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب اس واقفیت کے لئے راہ کھول رہی ہے۔ بلکہ جامعہ نے چین کی موجودہ مظلومی کی حالت میں اس کتاب کو شائع کرکے اس کی بہت بڑی اخلاقی اعانت کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے چین کی تاریخ اس کے اخلاقی و روحانی فلسفہ، اس کے تمدن و تہذیب اور اس کے سیاسی و ملکی نظام کے متعلق بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس کی موجودہ مظلومی پر دل میں

ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ گرچہ یہ ترجمہ براہ راست اصل کتاب سے نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ترجمہ اچھا ہے۔ آخر میں چینی بادشاہوں کی رومن اور اردو خط میں ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے۔ اس فہرست سے چینی تلفظ کے ادا کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

تسہیل البیان فی رسم نظم القرآن۔ مؤلفہ قاری محمد نظر۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ کاغذ سفید دبیز۔ قیمت ۱۲/ر۔ دو پتوں سے مل سکتی ہے:۔ محمد راشد ارد پوی چو بداری محلہ لکھنؤ شبلی بک ڈپو۔ نظیر آباد لکھنؤ۔

قاری محمد نظر صاحب مدرس مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ مشہور قاری ہیں۔ عرصہ دراز سے فن قرأت کے درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے طویل تجربۂ تعلیم اور کافی مطالعہ کے بعد اردو زبان میں یہ ضخیم رسالہ لکھا ہے۔ طلبہ اور عام ناظرین کی آسانی کے لئے عربی عبارت کے بالمقابل اسکا بامحاورہ اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے۔

ہرچند ہمیں فن قرأت سے واقفیت نہیں ہے اور نہ اس فن کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا ہے لیکن کتاب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے۔ قاری صاحب موصوف نے اس رسالہ کی ترتیب میں قرآن وحدیث کے علاوہ فن کی اکثر بنیادی کتابوں سے مدد لی ہے۔ شروع میں نزول قرآن۔ اور قرآن کے جمع و ترتیب اور نظم پر آیات و احادیث کی روشنی میں نہایت مدلل بحث کی ہے۔ اس کے بعد فن قرأت کے اصول و مبادی اور جزئیات کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس رسالہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اسلوب بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ جس سے طلبہ کو مسائل کے ذہن نشین کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ ہمارے خیال میں یہ رسالہ فن قرأت کے طلبہ کے لئے نہایت مفید ہے اور اس قابل ہے کہ ان کے نصاب درس میں شامل ہو۔

یورپ اور اسلام۔ مؤلفہ مولوی عبدالقیوم ندوی سرگی تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۹۰ صفحے کتابت و

طباعت روشن، کاغذ عمدہ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:- ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔

مدت سے اکثر اسلامی اخبارات و رسائل میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلعم کے متعلق یورپین مصنفین اور مستشرقین کی مدحیہ رائیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ رائیں تحسین ناشناس کے حکم میں داخل ہونے کی وجہ سے کچھ بہت وقعت نہیں رکھتیں لیکن جو لوگ ہر چیز کے حسن و قبح کا معیار یورپ ہی کی نظر کو سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ رائیں فائدہ سے خالی نہیں اور شاید اسی مقصد سے مولوی عبدالقیوم صاحب نے ان رایوں کو یکجا کر کے کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب ان نوجوانوں کے لئے ایک تریاق ہے جو مغربی مصنفین کی کتابوں سے متاثر ہو کر اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

ہم کو امید ہے کہ اس کتاب کی قدر کی جائے گی۔ اگر انگریزی ناموں کے بالمقابل انگریزی تلفظ دیدیا گیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ امید ہے دوسرے اڈیشن میں اس نقص کو دور کر دیا جائے گا۔

تفسیر سورہ اخلاص

(اردو)

استاذ امام علامہ فراہی رحمتہ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین کاغذ نہایت عمدہ

قیمت:- ۵؍

منیجر

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی بر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۰۳ صفحے۔ قیمت ۸/

تفسیر سورۃ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴/

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶/

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲/

منیجر

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۹۰۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت واعانت، کتاب الٰہی کی خدمت واعانت ہے، اسکی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہونگے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ھدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط وکتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط وکتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائمیر اعظمگڈھ

عبدالاحد طابع وناشر نے اصلاح پریس مدرستہ الاصلاح سرائمیر اعظمگڈھ میں چھاپکر شایع کیا

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت وطباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱-۵ ر

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار وحقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت وطباعت جاذب نظر۔ کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۲ صفحے قیمت :-۸۰ ر

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثرانگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت وطباعت بہتر۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۲۸ صفحے قیمت ۶ ر

منیجر

جلد ۳ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۸ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

شذرات

علماء اور سیاست

پچھلی اشاعت میں ہم نے ان لوگوں کے خیالات پر تنقید کی تھی جو علماء کو سیاست کے میدان سے محض اس جرم میں نکال دینا چاہتے ہیں کہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ معزز معاصر پیام (حیدرآباد دکن) نے ۲ فروری ۳۸ء کی افتتاحیہ میں ہمارے خیالات پر اعتراض کیا ہے اور جو لوگ علماء کی سیاسی دخل درمعقولات کے مخالف ہیں، ان کے عذرات بیان کئے ہیں۔ ہم عام موصوف کی رائے سے حرف حرف متفق ہیں اور ہرگز یہ خیال نہیں رکھتے کہ علماء انگریزی یا موجودہ علوم و فنون نہ سیکھیں۔ اس معاملہ پر الاصلاح کے صفحات میں ہم جو کچھ لکھ چکے ہیں چونکہ وہ معاصر موصوف کے سامنے نہیں ہے اس لئے ہمارا نقطۂ نظر سمجھنے میں اس کو غلط فہمی ہوئی۔ خود وہ تحریر بھی جس پر معاصر موصوف نے تنقید کی ہے، ناتمام تھی اور اسکے بقیہ حصہ میں یقیناً وہی باتیں بیان ہوتیں جن کی طرف پیام نے اشارہ کیا ہے۔ صرف الفاظ اور طرز لہجہ میں شاید فرق ہوتا۔

ہم ہرگز یہ خیال نہیں رکھتے کہ علماء موجودہ علوم و فنون سے واقفیت کے بغیر موجودہ زمانہ میں اپنی ذمہ داریوں کو سنبھال سکتے ہیں۔ علماء نے اس معاملہ میں تغافل کی جو روش اختیار کی ہے وہ نہ صرف افسوسناک بلکہ ہمارے لئے تباہ کن ہے۔ زمانہ کی بساط بدل چکی ہے۔ اب نہ وہ پرانا فلسفہ باقی رہا نہ پرانا علم کلام۔ خیالات نئے، اشتباہات نئے، اعتراضات نئے، بحث و نظر کا انداز مختلف، تحقیق و تنقید کی روش انوکھی، زندگی کا آئین نرالا، علوم و فنون کا ڈھانچہ دوسرا، سیاست یورپ کی گفتگو عجم کی۔ غرض زندگی اور متعلقات زندگی کا ہر باب بالکل متغیر ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ علماء کے اوپر مذہب اور قوم کی خدمت کی جو ذمہ داریاں، اور بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کو ٹھیک ادا کرنے کیلئے انھیں اپنی روش میں تبدیلی نہ کرنی پڑے گی۔ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کے مختلف دوروں میں، علماء کو مختلف بھیسوں میں

دیکھتے ہیں وہ جب تک سادہ عرب کی سادہ فطرت کی بساط پر تھے، ان کی زبان زمزمہ سنج حدثنا و اخبرنا ہی پھر جب عجم کی نوشگافیوں اور فلسفہ طرازیوں سے دوچار ہوئے تو وہی حدثنا و اخبرنا، وہی قال اللہ و قال الرسول، دوسرے بھیسوں اور دوسری شکلوں میں نظر آنے لگا۔ روح کبھی نہیں بدلی مگر قالب بارہا بدلا، حقیقت ہمیشہ ایک ہی رہی مگر اس نے اظہار کی نہ جانے کتنی روشیں اختیار کیں۔

ہمارے علماء کی یہی خوبی تھی جس کی وجہ سے انھیں پوری اسلامی تاریخ میں کبھی دین کو کوئی آشیانہ بالائے سیاست (above Politics) نہیں بنانا پڑا۔ وہ کبھی عبدالحمید آفندی بن کے نہیں رہے۔ اور نہ کبھی یہ نوبت آئی کہ دین دنیوی سیاست کی مشہور اصطلاح "تاج" کی طرح ایک خیالی معبود بن کے رہ گئیں۔ ہوتے تو شہنشاہ بحر و بر اور خداوند خشک و تر مگر بالڈون جیسے بیادست، جب جب چاہیں ان کی راہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ ہمیشہ زندگی کی معرکہ گاہ میں سردار رہے، مسجد کے منبر سے لے کر بادشاہ کے تخت تک جو کچھ تھا سب ان ہی کا تھا۔ زمانے نے ہزار پلٹے کھائے مگر رشتہ انہی کے ہاتھ میں رہا، اس لئے کہ وہ اس کے قابل تھے، زمانہ کی ضرورتوں اور اس کے رجحانات سے واقف تھے، یہ انہی کا صدقہ تھا کہ سب کچھ ہوا، مگر کسی نہ کسی شکل میں ہر چیز پر اسلامی رنگ چھایا رہا۔ مگر جب وہ پتھر بن گئے زمانہ نے ان کو ٹھکرا کر پھینک دیا اور پھر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دفعۃً سوئٹزرلینڈ کا سول لا، اٹلی کا قانون تعزیرات، جرمنی کا قانون تجارت ہماری تعزیرات اور ہمارے پرسنل لا پر بازی لے گیا اور خود ہمارے ہی گھر کے اندر!۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود ایک حقیقت قابل غور ہے اور ہم کو نہایت تعجب ہوگا اگر پیام کے قابل و تجربہ کار اڈیٹر کی عمیق اور دور رس نظر سے وہ مخفی رہ جائے۔ وہ یہ کہ ایک چیز ہے مسلمانوں کی سیاست، اس کا قوام، اس کا مزاج، اس کا ہیولیٰ، اس کا وجدان اور جامع لفظوں میں اس کی روح اور اسپرٹ اور ایک شے ہے زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی تنفیذ، اس کی تشکیل، اس کی ترجمانی اور اس کی نمائندگی۔ ان دونوں چیزوں میں

نمایاں فرق ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اگر معاصر موصوف اس کو تسلیم کرتا ہے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ زندگی ہے تو یقیناً جو جماعت اس ضابطۂ زندگی سے واقف ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہماری سیاست کی نبض پر ہاتھ رکھے اور بتائے کہ یہ نبض ہے یا تندرست اور اسکے علاج و مداوا کیلئے نسخے لکھے۔ البتہ یہ ضرور ہوگا کہ دوا گھسنے اور لگانے کے لئے ایک عطار کی بھی ضرورت ہوگی لیکن اگر خدانخواستہ معاملہ بالکل منقلب ہو کر یوں ہو جائے کہ نسخہ تو کمپونڈر لکھے اور دوا کا گھسنا اور لگانا ڈاکٹر کے ذمہ کر دیا جائے تو غریب مریض کا کیا حشر ہوگا؟۔

ایک روزنامہ کے دفتر میں مختلف زبانوں سے خبروں اور مضامین کے ترجمہ کے لئے بہت سے مترجم ہوتے ہیں، کتابت کیلئے کاتب ہوتے ہیں، کمپوز کرنے کیلئے کمپوزیٹر ہوتے ہیں، اصلاح سنگ کیلئے مصلح ہوتے ہیں، پریس مین ہوتے ہیں، کاغذ اٹھانے والے ہوتے ہیں، دفتری ہوتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہوتے ہیں اور یہ سب عناصر کار یقیناً معاصر پیام کے دفتر اور کارخانے میں بھی ہوں گے لیکن اخبار کی پالیسی کون ڈکٹیٹ کرتا ہے؟ ایسا تو شاید کبھی نہ ہوتا ہو کہ اخبار کا کاتب یا خبروں کا مترجم اڈیٹر کی میز پر بیٹھکر اخبار کی سیاست پر فرمانروا بن جاتا ہو۔

"ہر مردے و ہر کارے"

بس ہم نے اپنے شذرات میں اسی چیز کی طرف توجہ دلائی تھی کہ علماء کو دھکے دیکر سیاست سے نکالنے کے معنی یہ ہیں کہ باورچی رب البیت بننا چاہتا ہے اور وکیل مالک جائداد ———— امید ہے کہ ان اشارات کے بعد واضح ہوگیا ہوگا کہ ہمارے اشارات صحیح سمت میں تھے۔ البتہ دیکھنے والے کی نگاہ کو دھوکا ہوا۔ اور اس معاملہ میں بہت کچھ دخل اس بیگانگی کو بھی ہے جو فریقین کو ایک دوسرے کے خیالات سے ہے۔

شکوہ اور جواب شکوہ

معزز انگریزی معاصر ٹروتھ لاہور کے فاضل اڈیٹر نے اپنی یکم فروری کی اشاعت میں شکایت کی ہے کہ

باہم علم و فضل، اور جہاد و ایثار فی سبیل اللہ اور شرفِ نسب و حسب انکا ایمان بعض مسلم اخبارات و رسائل کے نزدیک
اب تک مشتبہ ہے اسلئے اپنے بعض معاصرین کو، جن میں ناچیز الاصلاح بھی شامل ہے، انھوں نے دعوت دی ہے کہ
وہ ایک مرتبہ اسلام کو وہ عقائد، جن کے قبول کرنے سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے، صاف صاف لفظوں میں بتا دیں
کہ کفر و اسلام کے حدود متعین ہو جائیں۔

اس سوال کا تعلق جہاں تک اڈیٹر الاصلاح سے ہے، اس کا جواب بجز بصد ہزار گونہ اعتراف جہل و قصور علم و اقرار
بے مائگی و تہیدستی، و حرمان شرف نسب و انتساب کچھ نہیں کہ آپ جس سے اپنی خستگی کی داد چاہتے ہیں وہ کچھ آپ سے بھی زیادہ
ہی تیغ ستم سے مجروح ہے۔ اور یہ داغ تو شاید اس پورے طائفہ میں مشکل ہی سے کوئی نکلے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم نالہ
و شیون نہیں کرتے اور ممکن ہے کہ اپنے علم و عمل کی بےچیزی کی شرم دامنگیر ہوتی ہو لیکن آپ جیسے لوگوں کو یہ بات
فراموش نہ کرنی چاہئے کہ زخمی اگر آہ و فریاد نہیں کرتا تو اس سے اس کی دادرسی کا حق ساقط نہیں ہو جاتا!

ہاں! اگر اجازت ہو تو ایک امر نہایت ادب سے گذارش کریں کہ آپکی اتنی ہوشیاری و کاردانی کے باوجود آخر
(Andre Servier) کا ایک نشتر آپ کو زخمی کر ہی گیا۔ اس کی عیاریوں اور خدع و فریب کی
ملمع کاریوں کے باوجود آپ اس کی اس چال کو تو تاڑ گئے کہ اس فیتین کے میٹھے لفظوں میں مغربی سیاست کی چھری
پوشیدہ ہے جس سے وہ شمالی افریقہ کے عربوں اور بربروں کے اسلامی رشتۂ اخوت کو کاٹ دینا چاہتا ہے لیکن ادھر
آپ کی نظر نہیں گئی کہ اس کی آستین میں ایک اور نشتر بھی ہے جس سے خود آپ کی رگ گلو زخمی ہو رہی ہے۔

ع آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا۔

حالانکہ آپکو سوچنا تھا کہ جس شیطان لعین کے ہاتھ میں رشتۂ اسلام کی قطع و برید کیلئے اتنا تیز خنجر ہے وہ دفعۃً
دو ہی سطر کے بعد اتنا فرشتہ نہیں بن سکتا کہ اسلام اور مسلمانوں کے جمود کے غم میں سینہ کوبی شروع کر دے۔
آپ جیسے واقفِ رموزِ دین و سیاست سے کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھلانا ہے۔ لیکن مجبوراً عرض کرنا
پڑتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے جمود کا یہ مرثیہ جس نے آپکے دل کے تمام کہنہ زخم ہرے کر دئے ہیں،

اسلام کے غم میں نہیں ہے یہ بھی مغربی سیاست کی ایک ادا ہے گو اس کا کوئی نام نہ ہو۔

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

آپ کو شاید معلوم ہو کہ مراکو وغیرہ کے مسلمانوں میں ادھر ایک نئی تحریک نمودار ہوئی ہے۔ ایک عرصہ تک وہ مغربی تہذیب کے رنگ میں ایسے رنگے گئے تھے کہ ان کی روح اور ان کا قالب دونوں مسخ ہو گیا تھا لیکن جدید بیداری نے اب ان میں ردعمل کی کیفیت پیدا کر دی ہے یعنی ایک مدت تک مغربی مظالم کے ہدف رہنے کے بعد اب جو انھوں نے کروٹ بدلی ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ فرانس سے اپنا سیاسی رشتہ کاٹ لینا چاہتے ہوں بلکہ اپنی کھوئی ہوئی تہذیب اور اپنے گم شدہ کلچر کو بھی زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی ذہنی انقلاب کے روک تھام کے لئے آپ کے محبوب فرنچ مصنف نے ایک طرف تو یہ چاہا کہ عربوں اور بربروں میں نسلی منافرت کا بیج بو کر پھوٹ ڈالے کہ پھوٹ ڈال کر حکومت کرنا ہی مغربی سیاست کا اصلی منہج ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کے جمود، ان کی قدامت پرستی اور توہم پسندی پر مرثیہ خوانی کی کہ ان میں اپنی مدنیت کی طرف عود کا جو میلان پیدا ہو رہا ہے اور جو یقیناً فرانس کی کامیابی کی راہ میں ایک شدید رکاوٹ ہے، کچھ مدھم پڑے۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ سیاست کے ان دونوں جالوں میں دوسرا زیادہ خوفناک ہے، کیونکہ اس میں آپ جیسا طائر بلند آشیانہ بھی پھنس گیا یعنی اس کی ہمنوائی میں بے تکان آپ نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے جہل و جمود پر خطبہ شروع کر دیا اور تجدد و فرنجیت کا راگ الاپنے لگے۔

اُف! یورپ کی زبان میں بھی کیا جادو ہے! جو سحر فرانس اور شمالی افریقہ کے تمام بر و بحر اور دشت و جبل طے کرتا ہوا لاہور تک پہنچ گیا اور ہماری الٰہیات و اسلامیات کے ائمہ تک اس کی زد سے محفوظ نہیں تو وہ پاس ہی مراکو کے سادہ لوح عربوں اور بربروں پر کیا کچھ غضب نہ ڈھائے گا!!۔

جرم اور پاداش جرم

دسمبر کے الاصلاح میں ہم نے مسلم لیگ پر ایک نوٹ لکھا تھا۔ وہ نوٹ بہت سے اخباروں میں

چھپا اور الاصلاح کے حوالے سے چھپا لیکن معاصر آفتاب لکھنؤ نے نہ معلوم کس غلط فہمی کی بنا پر اسی مضمون کو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے نام سے چھاپ دیا۔ اور اب سید صاحب قبلہ اس مضمون کی پاداش میں مختلف مسلم لیگی اخبارات میں گالیاں سُن رہے ہیں۔ ان گالیوں کی شاید سید صاحب قبلہ کو تو چنداں پروا نہ ہو مگر الاصلاح کو یہ شکایت ضرور ہے کہ گالی ہو یا دعا ہر چیز بڑوں ہی کو ملتی ہے، چھوٹوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ زمانہ کی ذہنیت اس درجہ اقتدار پرست ہوگئی ہے!۔

ہمارے اخبارات کے اڈیٹروں کا بھی عجیب حال ہے۔ سید صاحب کے انداز تحریر کی متانت و سنجیدگی اور زبان کی سادگی و پرکاری معروف و مسلم ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی اس کو جانتا ہے، اور جاننا چاہئے۔ لوگوں کو اس مضمون کا پہلا ہی جملہ پڑھکر سمجھ لینا تھا کہ یہ اُن کی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ وہ انتہائی غصہ میں بھی کبھی اپنی روش نہیں بھولتے۔ یا تو ان کو غصہ آتا نہیں یا ان کا قلم غصہ سے بھی زیادہ طاقتور ہے کہ کبھی اس سے مغلوب نہیں ہوتا وہ تو طنز کا لہجہ بھی کبھی انہی حالتوں میں اختیار کرتے ہیں جن حالتوں میں دوسرے تلوار چلادیا کرتے ہیں۔ بس جن حضرات نے اس مضمون کو سید صاحب کی طرف منسوب کیا انھوں نے اپنی ادبی بدذوقی کا نہایت افسوسناک ثبوت دیا ہے۔

اور ہم نہایت سخت حیران ہیں کہ آخر مسلم لیگ والے گالیاں کیوں دیتے ہیں؟ آخر یہ کون اسلامی کلچر ہے؟ ہمارے مذہبی صحیفہ میں تو تنابز بالالقاب کی سخت ممانعت وارد ہے۔ بحث ہمیشہ اصول پر ہونی چاہئے۔ شخص و افراد کا نام اوّل تو آنا نہ چاہئے اور اگر آئے تو سب وشتم تو ایک مسلمان کے لئے کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے تھے اذا ذکرتم الکفار فعمموا فانکم اذا خصصتم غضب الابناء للآباء کفار کا ذکر کبھی زبان پر آئے تو تعمیم کے ساتھ آئے تخصیص کرکے کہو گے تو بیٹوں میں باپوں کیلئے غیرت پیدا ہوگی۔ جب کفار کے ساتھ ہمارا معاملہ یوں ہونا چاہئے تو پھر اپنوں کے ساتھ ہماری یہ فحاشی کب جائز ہو سکتی ہے؟ آنحضرت صلعم نے کبھی نام لے کر کسی کو برا نہیں کہا اگر کبھی کسی کی برائی پر آپ اظہار غضب فرماتے

تو اس پر تبسم کا پردہ ڈال دیتے۔ ما بال قوم یفعلون کذا و کذا۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ البر شئی ہین وجہ طلیق وکلام لین۔ نیکی اور اطاعت کی راہ بہت آسان ہے۔ بشاش چہرہ اور شیریں زبان الاصلاح میں اختلاف رائے کے جوش میں کبھی کبھار جو کسی قدر ترش فقرے نکل جاتے ہیں، یقیناً ان کا محرک ہمیشہ حمایت حق کا جذبہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور نہ یہ محض قلم کا بچپن ہے۔ نفس بڑا خادع ہے، اس میں بہت کچھ شوق تو سب و نکتہ چینی کی خواہش بھی کارفرما ہوتی ہوگی۔ ما ابرئ نفسی ان النفس لامارة بالسوء۔ بعض صحابہ سے مروی ہے۔ قال ان الرجل لیکلمنی بالکلام لجوابہ اشھی الی من الماء البارد الی الظمآن فاترک جوابہ خیفۃ ان یکون فضولا۔ بعض مرتبہ کوئی شخص کوئی بات کہتا ہے۔ مجھے اس کا جواب سوجھتا ہے اور وہ مجھے اس سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہے جتنا پیاسے کو ٹھنڈا پانی مگر میں اس ڈر سے چپ رہتا ہوں کہ مبادا فضول گوئی ہو جائے۔ آج ان روایات و آثار کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہم کیا سے کیا ہو گئے۔ ایک وہ تھے جو باتوں کا معقول جواب بھی اس اندیشہ سے نہیں دیتے تھے کہ فضول گوئی کے گناہ سے محفوظ رہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ زبان قلم پر اگر کوئی فقرہ آگیا ہے تو اس کو لکھیں گے ضرور چاہے کتنوں ہی کے دل اس سے پارہ پارہ ہو جائیں۔ یہ ہماری قوم کے مہذب اور اونچے ارباب قلم کا شیوہ ہے۔ پھر ان بیچاروں کا کیا ذکر جو گالیوں ہی میں پلے، گالیوں ہی میں جئینگے اور افسوس کہ شاید گالیوں ہی میں مریں گے؟۔

ہم لوگوں میں مسلمان بننے کی ہمت نہیں ہے، نہ سہی، کیا ایک مہذب اور متمدن قوم بننے کی بھی امنگ نہیں ہے!! اوصیکم وایای بتقوی اللہ۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ مرسلات

۲

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی

ہواؤں کی شہادت اور ان آیات کا نظم و موقع

ہم اپنے رسالہ الامعان فی اقسام القرآن میں بیان کر چکے ہیں کہ قسم مقسم علیہ پر دلیل و شہادت ہوتی ہے۔ یہاں بھی ان ہواؤں کا ذکر اسی مقصد سے ہوا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیان میں ان کے مختلف پہلو آشکارا کئے گئے ہیں۔ وہ چھوڑ دی جاتی ہیں، تیز و تند ہو جاتی ہیں، بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں، نباتات کو اگاتی ہیں، حیوانات کی پرورش کا سامان کرتی ہیں، پھر ہر زمین کے ساتھ ان کا معاملہ یکساں نہیں ہوتا۔ اس میں فرق و اختلاف ہوتا ہے۔ کہیں پانی برساتی ہیں اور کہیں خشک و بنجر چھوڑ جاتی ہیں۔ ایک قوم کو اپنی زرخیزیوں اور شادابیوں کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہیں اور دوسری کو اپنے بادلوں اور بگولوں اور کڑک اور دمک کی قوتوں سے تباہ کر دیتی ہیں۔

یہ سب حالتیں اور خصوصیتیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ واضح ہو کہ ان کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی قدرت و حکمت سے ان پر پورا تصرف رکھتا ہے۔ وہ اپنی عام حالت میں خدا کی رحمت کے لئے پیام بشارت ہیں لیکن، جب وہ چاہتا ہے، ان کے ذریعہ ایک ظالم قوم کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے اور دوسری مظلوم لیکن صالح قوم کو ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے۔ کبھی ان کی باگیں ڈھیلی کر دیتا ہے اور کبھی کھینچ لیتا ہے۔

یہ تمام باتیں سورہ ذاریات کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں اور قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس قدر توضیح وتفصیل کے ساتھ ان کو بیان کیا ہے کہ یہاں دلائل کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

ان ظاہری احوال و آثار پر قرآن نے ایک عظیم الشان حقیقت کی بنیاد رکھدی ہے یعنی دنیا میں ہواؤں کے جو تصرفات ہم دیکھتے ہیں اور ان سے رحمت و عذاب، بخشش و انعام اور نفع اور نقصان کے جو مظاہر ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں ان ہی سے ایک روز جزا کے وقوع پر دلیل قائم کی ہے کیونکہ قانون جزا و سزا کی اتنی نشانیاں اور دلیلیں ان کے اندر نمایاں ہیں کہ کوئی شخص ان کا انکار نہیں کرسکتا۔ یہ خدا کی پروردگاری اس کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی تدبیر کی گواہی دیتی ہیں اور واضح کرتی ہیں کہ وہ اپنے بندوں سے غافل نہیں ہے بلکہ اس کے انعام کی بخشش اور اس کے عذاب کے تازیانے آئے دن ان کے لیے نمودار ہوتے رہتے ہیں، پس جب یہ کچھ دنیا میں ہورہا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے یہ عجائب روز دیکھ رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ایسا دن نہ آئے جس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے۔

یہ جزاو سزا کے وقوع پر بنیادی دلیل ہے اور پوری طرح کفایت کرتی ہے لیکن یہاں معاملہ کی ایک خاص حالت اس سے کچھ زیادہ کی مقتضی ہوئی۔ کفار اپنی شدت غفلت کے باعث روز جزا کے دو وجہوں سے منکر تھے۔ ایک اس کے عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے، دوسرے اس کی تاخیر کی وجہ سے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بہت دنوں سے اس کی آمد کی دھمکیاں سن رہے ہیں لیکن وہ آتی نہیں، پس موقع مقتضی ہوا کہ کلام کا اسلوب ایسا ہو کہ ان دونوں شبہات کا آپ سے آپ جواب نکل آئے۔

چنانچہ پہلے شبہہ کو یہاں یوں دور کیا کہ روز قیامت کی جو تفصیلات بیان فرمائیں وہ تمام نزرہ ہیں جو ہواؤں کے فعل سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً ہوائیں نشانات کو مٹا دیتی ہیں، آثار کو دبا دیتی ہیں۔ بادلوں کو اڑالیجاتی ہیں اور بسا اوقات تیز ہوجاتی ہیں تو ان کے زور سے دیواریں ڈھ جاتی ہیں، چھتیں اڑ جاتی ہیں۔ عالیشان عمارتیں منہدم اور پارہ پارہ ہوجاتی ہیں۔ یہ ہمارے آئے دن کے مشاہدات ہیں لیکن ابھی ان کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں

نہیں کھلی ہیں۔ قرآن مجید نے ان کی طرف اسی مقصد سے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص ان کو سمجھ جائے گا وہ ایک ایسے دن کے ظہور کے متعلق شبہ میں نہیں رہ سکتا جس دن تارے چھپ جائیں گے، آسمان کھل جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کیونکہ ہواؤں کے عجائب تصرفات میں ان کی نشانیاں موجود ہیں اور پوری طرح واضح۔

دوسرا شبہ ایک عام شبہ تھا۔ اسی لئے قرآن مجید نے اس کا مختلف مواقع پر مختلف پیرایوں میں جواب دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ	اگر اللہ مواخذہ کرتا ان کے ظلم پر تو نہ چھوڑتا زمین پر
مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ	ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو مہلت دیتا ہے
وَلٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى فَإِذَا	ایک معین مدت تک پھر جب ان کی مدت پوری
جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهِ	ہو جائے گی تو بے شک اللہ اپنے بندوں کا نگراں
بَصِيرًا۔	حال ہے۔

یہاں اس سے کسی قدر مختلف پہلو اختیار فرمایا ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ وہ روز جزا، یوم الفصل، دو ٹوک فیصلہ کا دن ہوگا۔ پس رحمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو مہلت بخشے اور نصیحت و عبرت کے زیادہ سے زیادہ موعظے ان کے کانوں تک پہنچا دے تاکہ جو غافل اور بے پروا ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے اور جن کے دلوں میں نصیحتوں کے سننے اور قبول کرنے کی کچھ صلاحیت ہے وہ اپنے لئے نجات کی راہ ڈھونڈ لیں کیونکہ جب وہ دو ٹوک فیصلہ کا دن آجائے گا تو مہلتوں کے دروازے بند ہو جائیں گے، پھر نہ تو غافلوں کے لئے توبہ کی فرصت باقی رہے گی اور نہ ان کا کوئی عذر مسموع ہوگا اور نہ ان کے پاس کوئی تدبیر ہی ایسی ہوگی جس سے وہ خدا کے انتقام کی سخت پکڑ اور اس کی عدالت کاملہ کے فیصلے سے اپنے کو بچا سکیں۔ چنانچہ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے پہلے اس یوم الفصل کی عظمت و اہمیت کو بیان فرمایا، اس کے بعد ان لوگوں کی حماقت کو آشکارا کیا جو اس دن کی آمد کے منکر ہیں کیونکہ وہ ایک ایسے دن کے منکر ہیں جو اٹل ہے۔ اگرچہ اس کے ظہور میں دیر ہو۔ اس کے بعد

پندرھویں آیت "ویل یومئذ للمکذبین" ہے۔ غور کرو کہ یوم الفصل اور یوم الجزاء کے ذکر کے بعد اس آیت کا آنا کس قدر برموقع اور بلیغ اسلوب کلام ہے! ان دو جامع لفظوں کے اندر وہ سب بیان ہوگیا جو اس دن منکروں کے سامنے آئے گا۔ اس کے بعد خرابی کے اسباب اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل کردی جو آگے دیکھو گے۔ اسی ترتیب کے اندر یہی جامع مفہوم ہے جو کوئی مناسب مقام پہلو نمودار ہو جائے گا۔

یہاں تک قدرت کے عام احوال و معاملات سے استدلال تھا۔ اس کے بعد کلام نے دوسری روش اختیار کرلی ہے یعنی گذشتہ ہوئے واقعات، ثابت و قائم آثار، اور روز افزوں ہونی سنۃ اللہ سے استشہاد پیش کیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کا ایک معروف انداز ہے۔ فرمایا۔

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ (١٦) ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ (١٧) كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ (١٨)
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (١٩) أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ (٢٠) فَجَعَلْنَاهُ فِي
قَرَارٍ مَكِينٍ (٢١) إِلَىٰ قَدَرٍ مَعْلُومٍ (٢٢) فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ (٢٣) وَيْلٌ
يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (٢٤) أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا (٢٥) أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا (٢٦)
وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا (٢٧) وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ
لِلْمُكَذِّبِينَ (٢٨)

کیوں، ہم نے ہلاک نہیں کر دیا اگلوں کو؟ پھر ان کے پیچھے پچھلوں کو بھی۔ گنہگاروں کے ساتھ ہم یونہی کیا کرتے ہیں۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے، کیا ہم نے تمھیں ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا، پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا، ایک مقررہ زمانہ تک، پھر ہم نے مقرر کیا، کیا خوب ہم مقرر کرتے ہیں، اس دن منکروں کی خرابی ہے، کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ زندوں اور مردوں کو، اور اس میں گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے اور خوشگوار پانی پلایا! اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

۵ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

۱ - ۳۸

[مھین] مہنۃ کے معنی ہیں عدم اہتمام کے۔ یہیں سے ابتذال اور تحقیر کا مفہوم پیدا ہوگیا مہنت الشی کے معنی ہوئے تم نے اس کو حقیر و مبتذل بنا لیا۔ اسی سے ماہن ہے جس کے معنی نوکر و غلام کے ہیں۔ مہنۃ کے معنی خدمت کے ہیں۔ مہنہ اس کی خدمت کی۔ قرآن مجید میں ہے ولا تطع کل حلاف مھین ہر بہانے ذلیل کی بات نہ سنو۔ مھین یعنی مبتذل۔ ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرعون کا قول نقل ہوا ہے۔ ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین

[قرار] قرار کے معنی سکون اور جائے سکون دونوں کے آتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کو دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ وان الاخرۃ ھی دار القرار یعنی آخرت ہی سکون کا گھر ہے دوسری جگہ فرمایا امن جعل الارض قرارا یہاں قرار کا لفظ موضع قرار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے یصلونھا وبئس القرار۔ اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ یہیں سے قرار کا لفظ زمین کے کسی گوشۂ ہموار و مطمئن کے لئے بھی استعمال ہوا۔ مثلاً فرمایا۔ واوینھما الی ربوۃ ذات قرار و معین

[مکین] مکین کے معنی ہیں مطمئن۔ کبھی یہ جگہ کی صفت کیلئے آتا ہے، اس وقت معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایسی جگہ جو ہر طرح کے اضطراب و تزلزل سے بالکل مامون ہو۔ اور کبھی یہ ذوی العقول کی تعریف کے لئے آتا ہے اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں ایسا شخص جو بھروسہ اور اعتماد کے لائق اور مرتبہ کے لحاظ سے صاحب عزت و رسوخ ہو قرآن مجید میں ہے۔ عند ذی العرش مکین۔ مطاع ثم امین۔ بادشاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا انک الیوم لدینا مکین امین۔

[قدر] قدر الشی۔ چیز کی مقدار اور اس کا اندازہ۔ انا کل شیء خلقنٰہ بقدر۔ ہم نے ہر چیز کو

پیدا کیا ہے ایک اندازہ کے ساتھ۔ دوسری جگہ ہے۔ وان من شئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ نہیں ہے کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے موجود ہیں اور ہم اس کو نہیں اتارتے مگر ایک معین اندازے کے ساتھ۔ دوسری جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قد جعل اللہ لکل شئ قدرا۔ دوسری جگہ ہے وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

[معلوم] معلوم کے معنی ہیں معین۔ شواہد اوپر گذر چکے ہیں۔ جو چیز معین نہیں ہے مبہم ہوگی، وہ معلوم نہیں ہو سکتی۔

[قدرنا] یہ قدر سے ہے معنی تقدیر کے یعنی اندازہ ٹھہرانا۔ شواہد اوپر گذر چکے ہیں اور قدرت کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ معنی بھی نہایت معروف ہیں۔ یہاں دونوں معنی لگ سکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں اس کی ان دونوں صفتوں کی جلوہ گری ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کے نظائر بھی موجود ہیں۔

[کفاتا] کفتہ۔ ضمہ وجمعہ۔ جمع کر لیا، اکٹھا کر لیا۔ حدیث شریف میں ہے۔ اکفتوا صبیانکم باللیل۔ رات میں اپنے بچوں کو اکٹھا کر لیا کرو۔ کفتہ عن وجہہ کے معنی ہیں کسی شے کو اپنے چہرہ سے ہٹا دیا۔ اسی سے کفت چھوٹی ہانڈی کے معنی میں ہے۔ عربی میں فعال کا وزن اس چیز کے لئے بھی آتا ہے جس کے ذریعہ فعل انجام پذیر ہو۔ مثلاً زمام۔ اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہو گئی ہے اور اس کے بعد مفعول کا استعمال جائز ہو گیا۔

[رواسی شامخات] یعنی پہاڑ جن کی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی اور چوٹیاں فضا میں بلند ہیں۔ صفت نے موصوف کو خود واضح کر دیا اس لئے موصوف کا ذکر نہیں ہوا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے اور قرآن مجید میں اس کی بہت مثالیں مل سکتی ہیں۔

[فراتا] وہ پانی جو نہایت شیریں ہو۔ قرآن مجید میں ہے وھو الذی مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج۔ دوسری جگہ ہے۔ وما یستوی البحران ھذا عذب فرات سائغ شرابہ وھذا ملح اجاج۔ اسی وجہ سے کوفہ کی نہر کو فرات کہتے ہیں۔

ان آیات کی تفسیر انکا نظم اور معاد پر انکی حجت

ان آیات میں تین فقرے اور تین ترجیعات ہیں اور یہ تینوں ترجیعات تین مستقل خطابات کے بعد وارد ہوئی ہیں اور ہر خطاب استفہام اقراری سے شروع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام باتیں مخاطب کی جانی بوجھی ہوئی ہیں۔ پھر غور کرو یہ تینوں خطابات تین مختلف پہلوؤں سے معاد پر دلیل پیش کرتے ہیں۔ پہلے خطاب میں زمین کے آثار و نشانات سے استدلال ہے۔ دوسرے فقرے میں انسان کی خلقت اور رحم کے اندر اس کی پرورش اور صورت گری سے استشہاد ہے اور تیسرے میں اس زمین کو رحم کی مثال قرار دیا گیا ہے۔ اور اس پہلو سے معاد پر اس سے دلیل پیش کی گئی ہے۔

یہ اجمالی اشارات ہیں۔ چند لفظوں میں اس کی تفصیل سن لینی چاہئے۔

پہلا خطاب ان واقعات کو یاد دلاتا ہے جن کے آثار مخاطب کے گرد و پیش موجود ہیں یعنی نافرمان قوموں کی ہلاکت و بربادی کے واقعات۔ اہل عرب خوب واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں مثلاً عاد و قوم لوط پر ہوا کا عذاب بھیج کر ہلاک کر دیا۔ یہاں چونکہ ہوا کے تصرفات کی شہادت موجود تھی اور مقصود آس پاس کی معذب بستیوں کے آثار سے عبرت دلانا تھا اس لئے معاملہ بغیر کسی تفصیل کے واضح تھا۔ چنانچہ واقعات کا ذکر نہیں فرمایا۔ صرف اجمال کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا الم نهلك الاولين ..... كذلك نفعل بالمجرمين۔ لیکن دوسرے مقامات میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ	پس جب انھوں نے اسکو بادل کی شکل میں بڑھتا ہوا
قَالُوا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ	اپنی وادیوں کی طرف، کہنے لگے یہ تو ابر ہے جو ہم پر برسیگا۔
هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهٖ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ	نہیں بلکہ وہ ... چیز ہے جس کے لئے تم جلدی مچا رہے تھے
أَلِيمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا	تند ہوا جس میں دردناک عذاب ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تہس نہس

لَا یُرٰی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ کَذٰلِکَ نَجْزِی	کردے گی۔ پس وہ اس طرح ہلاک ہوگئے
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ	کہ ان کے گھروں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی
....	ایسی ہی ہم بدلہ دیتے ہیں گنہگاروں کو ....
وَلَقَدْ اَھْلَکْنَا مَا حَوْلَکُمْ مِّنَ الْقُرٰی	اور ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کردیا اور پھیر
وَصَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ	پھیر کر اپنی نشانیاں بیان کیں کہ وہ رجوع کریں۔

اب اس روشنی میں اگر اس خطاب کو سمجھا جائے تو اس کے معنی بالکل واضح ہوجائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اگلے مجرموں اور شریروں کو ہلاک کردیا۔ اور یہ ہماری ایک جاری و قایم وسنت ہے جیسے گزری ہوئی قوموں کی ہلاکت و بربادی کے واقعات تم جانتے اور سنتے رہے ہو۔ پس آخرت کا معاملہ بھی یونہی ہے۔ جو گنہگار ہوں گے سزا پائیں گے، جو نیکوکار ہوں گے وہ ہماری خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔ یہ تفصیل ایک یوم الفصل کے وقوع تک خود بخود منتہی ہورہی تھی اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی البتہ اس سے جو لازمی نتیجہ پیدا ہورہا تھا اسکا ذکر کردیا وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ اس دن منکروں کے لئے خرابی ہے۔ تاکہ منکروں کو اس دن جن حالات سے دوچار ہونا ہے اس سے خبردار ہوجائیں۔ یہاں ویل کے ایک لفظ نے عذاب کی تمام اقسام کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ نیز آیت کے موقع سے یہ بات خود بخود نمایاں ہے کہ فیصلے کے دن کا انکار ایک سخت ترین جرم ہے یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عدل، اور اس کی قدرت و رحمت کا انکار ہے، پھر یہ ہر طرح کے شرک و معصیت کا سرچشمہ اور اللہ تعالیٰ کی آیات، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے متکبرانہ اعراض ہے یہاں یہ باتیں اشارات سے معلوم ہورہی ہیں، دوسرے مقامات میں ان کی پوری تفصیل آگئی ہے۔

دوسرے خطاب نے نظم کے ایک نہایت خوبصورت پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ یعنی پہلے میں آفاق کی شہادت پیش کی گئی تھی، اور اس میں انفس کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ ان دونوں کا اجتماع قرآن مجید کی بعض آیات میں بالکل نمایاں ہے۔ مثلاً

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي — اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنیوالوں کیلئے اور
أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ — تمھارے نفوس کے اندر بھی پس کیا تم کو نظر نہیں آتیں

اس خطاب میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب پروردگار نے تمھاری خلقت کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا اہتمام فرمایا۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمھاری زندگی کے ان امور سے جو بالکل بنیادی اور اہم ہیں، بے پروا ہو جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ پہلی بار تمھاری خلقت و مصوری پر قادر ہوا اور کوئی چیز اس کو عاجز نہ کر سکی تو تم کو دوبارہ اٹھانا تو اس کے لئے اور آسان ہے

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ — اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر جاؤں گا تو زندہ
أُخْرَجُ حَيًّا أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ — کرکے نکالا جاؤں گا کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے
أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا — اس کو پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ نہ تھا۔

ان دونوں پہلوؤں سے یہ ٹکڑا ایک روز فیصلہ کے وقوع کو خود بخود واضح کر رہا تھا اس لئے اسکے ذکر کی ضرورت نہیں ہوئی۔ بلکہ فرمایا ویل یومئذ للمکذبین یہ واضح کرنے کے لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی اس تقدیر یا قدرت کے منکر ہوں گے ان کے لئے خرابی ہے۔ جب وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ چیز سامنے کھڑی ہے، جس کا دنیا میں انکار کر رہے تھے تو ان کی تباہی ان پر پوری طرح آشکارا ہو جائے گی۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ — وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ دفعۃً وہ تکنے لگیں گے
يَنْظُرُونَ وَقَالُوا يَا وَيْلَنَا هَٰذَا — اور کہیں گے ہائے بدبختی! یہ تو جزا کا دن ہے۔ یہ فیصلہ
يَوْمُ الدِّينِ هَٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ — کا وہی دن ہے جس کا تم انکار کرتے تھے۔
الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ

تیسرے خطاب پر غور کرنے کے بعد جمع مثل بالمثل کی ایک عمدہ مثال ہمارے سامنے آتی ہے یعنی جس طرح

زمین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ معاد کی دلیلوں اور نشانیوں سے معمور ہے، جیسا کہ اوپر ہم نے عاد وغیرہ کے قصہ کا حوالہ دیا ہے اور قرآن مجید نے بار بار نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی طرح زمین کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ رحم سے بہت مشابہ ہے۔ بلکہ دونوں کی مشترک خصوصیات پر غور کرنے کے بعد بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ رحم خصوصیات کے اعتبار سے زمین کا پہلو نمایاں طور پر مرجح ہے۔ اور قرآن مجید نے زمین کی صفت میں، کفاتا احیاء و امواتا (سمیٹنے والی زندہ اور مردہ کو) کہکر درحقیقت اس کی اسی ترجیح کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ کر اس کو آرام و سکون کی جگہ بنایا۔

وَالْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ　　اور ڈالے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ کہ تمہیں لیکر ڈھلک نہ جائے

پھر ان پہاڑوں کو اونچا بنایا اور ان کے ذریعہ بادلوں کو روک کر زمین میں بقدر ضرورت پانی کا خزانہ جمع کر دیا، پھر اس سے سوتیں اور نہریں جاری کیں۔ ان تمام امور کی طرف قرآن نے جابجا اشارات کئے ہیں۔

غرض پہاڑوں کے ذریعہ زمین کو پابرجا اور مطمئن کرکے اُن کی چوٹیوں، گھاٹیوں اور چشموں سے شیریں پانی کی سوتیں جاری کرکے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین کو ویسا ہی پرامن گہوارہ بنا دیا ہے، جیسا کہ رحم مادر، جس میں جسم کے تمام گوشوں سے اس کے لئے غذا کا ذخیرہ نچڑ نچڑ کر جمع ہوتا ہے، اور جس کی تعریف میں فرمایا ہے۔ فجعلنہ فی قرار مکین۔ بلکہ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان تمام خصوصیات میں زمین کا پہلو نمایاں طور پر مرجح ہے۔ یہ تمام باتیں جس جامعیت اور کمال کے ساتھ زمین میں پائی جاتی ہیں، اس جامعیت و کمال کے ساتھ رحم میں نہیں پائی جاتیں۔ زمین تمام مخلوقات کے لئے بمنزلہ رحم ہے۔ پھر جب انسان مرتا ہے اور اس میں دفن کیا جاتا ہے تو گویا وہ اس ماں کے رحم میں رکھدیا جاتا ہے جس نے اس کو جنا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس حقیقت کی طرف کس قدر لطیف اشارہ کر رہی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا　　اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم تم کو لوٹائینگے

نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ اور پھر اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے

ظاہر ہے دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔ پھر انسان اس کی کیوں تکذیب کرے، بلکہ اگر وہ زمین کے معاملات اور اس کے اندر اپنی زندگی اور موت کی اصلی نوعیت پر غور کرے تو وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس پر ایک نئی حقیقت روشن ہوگی جو اس کے ایمان ویقین کو اور زیادہ محکم کردے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن پیدا ہوا تو گویا پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا حمل قرار پایا اور جس دن مرا تو گویا مرا نہیں بلکہ پیدا ہوا۔ پھر دوسرے پہلو سے اگر غور کرے گا تو ایک اور حقیقت اس کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن وہ مرا تو گویا مرا نہیں بلکہ زمین کے پیٹ میں اس کا حمل قرار پایا ہے ناگزیر ہے کہ اس حمل کے لئے بھی ایک دن وضع حمل کا آئے اور وہ دن وہی ہوگا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَ — جب زمین میں بھونچال ڈالا جائے اور زمین

أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا — اپنے بوجھ باہر نکال دے۔

اس تفصیل پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ اس کلام کا مقصد ربوبیت اور احاطہ کے پہلو سے معاد پر استدلال ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ ہمارا پروردگار ہے اور ہم زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اس کی مٹھی میں ہیں تو ناگزیر ہے کہ ایک دن بازپرس کا بھی آئے جس میں ہم اپنے اعمال کے متعلق جواب دہ ہوں۔ اسی طرح کلام درجہ بدرجہ ایک روز فیصلہ کے ثبوت تک خود بخود پہنچ گیا اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ لفظوں میں اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر سے گذر کر فرمایا ویل یومئذ للمکذبین (اس دن خرابی ہے انکار کرنے والوں کے لئے) یعنی جنھوں نے آج خدا کی پروردگاری اور اس کے احاطہ قدرت کا انکار کیا ہے جب وہ اپنے پروردگار کے حضور جمع کئے جائیں گے تو ان کے سامنے ان کے انکار کی بدبختی پوری طرح آشکارا ہوجائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ. قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا. هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ

اور صور پھونکا جائے گا تو دفعۃً وہ قبروں سے نکلکر اپنے پروردگار کی طرف چل کھڑے ہوں گے اور کہیں گے اے ہماری خرابی! ہم کو کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا(یا) یہی تو ہے جس کا خدائے رحمن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

اس کے بعد بلاغت کا ایک نیا اسلوب نمودار ہوا ہے، یعنی جو چیز اب تک نگاہوں سے اوجھل تھی وہ سامنے حاضر کردی گئی ہے۔ چنانچہ کلام کا اسلوب ایسا اختیار کرلیا گیا ہے جو ایک حاضر و مشہود چیز کے مناسب حال ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ فیصلہ کا دن آگیا ہے، لوگ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہیں اور جس چیز کا آج تک انکار کرتے رہے تھے وہ سامنے موجود ہے۔ فرمایا۔ انطلقوا الی ما کنتم بہ تکذبون الخ

(باقی)

ذبیح کون ہے؟

(۲)

قسط اول

تورات اور علمائے اہل کتاب کے اعترافات سے استدلال

وحی، رؤیا اور قربانی کے متعلق بعض اصولی مباحث

اصل بحث کے آغاز سے پہلے وحی، رؤیا اور قربانی کے متعلق بعض اصولی مباحث کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ اصولی مباحث تین ہیں۔

الف۔ شریعت خداوندی کے عام قاعدہ سے یہ بات بہت بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو اس بات کا حکم دے کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے، البتہ خواب میں یہ بات دکھائی جا سکتی ہے کیونکہ خواب تاویل کی چیز ہے اور ذبح انسان کی سب سے قریب ترین تاویل یہ ہے کہ اس کو خدا کی نذر اور اس کے گھر کا خادم بنا دیا جائے، کیونکہ معبد کا خادم درحقیقت قربانی کے جانور کا عوض ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس پر قربانی کے بعض مراسم ادا کئے جاتے ہیں مثلاً اس پر ہاتھ رکھنا اور معبد کے سامنے ہلانا وغیرہ۔ چنانچہ گنتی (۸: ۱۰-۱۶) میں ہے۔

پھر لاویوں کو خداوند کے آگے لا۔ تب بنی اسرائیل اپنے ہاتھ لاویوں پر رکھیں ۱۱ اور ہارون لاویوں
کو بنی اسرائیل کی طرف سے ہلانے کی قربانی کے لئے خداوند کے حضور گزرانے تاکہ وہ خداوند کی خدمت کرنے پر
ہیں ۱۲ پھر لاوی اپنے اپنے ہاتھ بچھڑوں کے سروں پر رکھیں اور تو ایک کو خطا کی قربانی اور دوسرے کو سوختنی
قربانی کے لئے خداوند کے حضور گزراننا تاکہ لاویوں کے واسطے کفارہ دیا جائے ۱۳ پھر لاویوں کو ہارون اور

اس کے بیٹوں کے آگے کھڑا کرنا اور ان کو ہلانے کی قربانی کے لئے خداوند کے حضور گذراننا۔ یوں تو لاویوں کو بنی اسرائیل سے الگ کرنا اور لاوی میرے ہی ٹھہریں گے۔ اس کے بعد لاوی خیمۂ اجتماع کی خدمت کیلئے اندر جایا کریں۔ سو تو ان کو پاک کر اور ہلانے کی قربانی کے لئے ان کو گذران۔ اس لئے کہ وہ سب کے سب بنی اسرائیل میں سے مجھے بالکل دیئے گئے ہیں کیونکہ میں نے ان ہی کو ان سبھوں کے بدلے جو اسرائیلیوں میں پہلوٹھی کے بچے ہیں اپنے لئے لے لیا۔

ان سے ہمارے مذکورہ دعویٰ کی پوری تائید ہوتی ہے اور اس کے شواہد تورات میں بہت ہیں یہاں ہم نے صرف بقدر ضرورت پر اکتفا کیا ہے۔ آگے جگہ جگہ تفصیلات ملیں گی۔

(ب) غیب کے اسرار و احوال کبھی کبھی رویا کی شکل میں منکشف ہوتے ہیں اور یہ رویا کبھی تو سپیدہ صبح کی مانند بالکل روشن اور آشکارا ہوتی ہے اور کبھی اس پر خفا اور حجاب کے پردے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بہت حد تک کلام سے مشابہ ہوتی ہے۔ جو کبھی تو نہایت تصریح کے ساتھ اپنے مفہوم کو بتا دیتا ہے اور کبھی استعارہ و تمثیل کے مجازی اسلوب اختیار کر لیتا ہے۔ پس یہ دوسری قسم کی رویا تاویل کی محتاج ہوتی ہے اور تاویل بعض اوقات اس قدر دقیق ہوتی ہے کہ صاحب رویا سے مخفی رہ جاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دونوں ساتھیوں اور پھر بادشاہ نے جو خواب دیکھا تھا۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ اس کی تاویل سمجھنے سے وہ قاصر رہے۔ تورات میں بخت نصر اور دانیال نبی کے اسی قسم کے خواب مذکور ہیں جن کی تاویلیں ان پر بہت بعد میں کھلیں۔ یہی صورت حالات بعض مرتبہ انبیاء علیہم السلام کو پیش آجاتی ہے۔ فہم تاویل ایک مخصوص علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ایک مخصوص بصیرت و معرفت پر مبنی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی علم کی طرف اشارہ فرمایا ہے وعلمنی من تاویل الاحادیث اور میرے پروردگار نے مجھے باتوں کی تاویل سکھائی ہے۔

ج۔ وحی، خواہ رویا کی شکل میں ہو، یا عالم بیداری میں، جہاں تک کہ اس پر یقین کرنے کا تعلق ہے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ اس بات کے احساس کے لئے کہ ہمارے اندر کوئی قوت موجود ہے، یہ بات کافی ہے کہ وہ قوت فعلاً یا انفعالاً ظاہر ہو، اس کے بعد اس پر یقین کرنے کے لئے ہم کسی خارجی دلیل

محتاج نہیں ہیں کیونکہ اس کی سب سے زیادہ قریب ترین دلیل ہمارے سامنے آگئی۔ ہمارے اندر سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں موجود ہیں، اس کی سب سے زیادہ مضبوط دلیل یہ ہے کہ ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے علم و یقین کے لئے اس دلیل کے ماسوا ہم کو کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہی حال صاحب وحی کا ہوتا ہے۔ اس کو جو حالت پیش آتی ہے اس پر یقین کرنے کے لئے وہ کسی دلیل خارجی کا منتظر نہیں رہتا۔ البتہ ایک عام شک و اضطراب کی کیفیت سے وہ ضرور دوچار ہوتا ہے اور اس کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بار بار کا تجربہ و مشاہدہ اس کے سامنے آجائے۔ پس وحی، خواہ بیداری کی حالت کی ہو یا خواب کی، اپنے ساتھ ہی یقین و طمانیت کی ٹھنڈک رکھتی ہے۔ اس میں شک و اضطراب کی خلش نہیں ہوتی۔ جس طرح ہم عالم بیداری میں ایک محسوس حقیقت اور ایک خیال میں فرق کرنے سے عاجز نہیں رہتے، دونوں کو بغیر کسی اشتباہ کے، الگ الگ پہچان لیتے ہیں، اسی طرح خواب جو از قبیل خیال ہے اور وہ رویا جو از قسم وحی ہے دونوں ہمارے سامنے دو بالکل نمایاں حالتوں میں ہوتے ہیں اور ہم دونوں میں بآسانی تمیز کر سکتے ہیں۔ اور علوم نبوت کا یہ دروازہ کھلا ہوا چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وحی کے احوال و معاملات کا ایک ہلکا سا عکس آج بھی اہل نظر دیکھ سکیں گو ان دونوں کی حقیقتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

د۔ خدا کے حضور میں قربان کرنے یا نذر گذراننے کے لئے ضروری تھا کہ پہلوٹھا بچہ نذر گذرانا جائے خواہ آدمی کا بچہ ہو یا حیوانات کا۔ یہاں تک کہ زمین کی عام پیداوار میں بھی یہ شرط ضروری تھی کہ فصل کا اولین ثمر پیش کیا جائے۔ یہ قدیم ترین شریعت ہے۔ جو آدمؑ کے وقت سے موجود ہے اور یہی حکم توریت میں بھی نازل ہوا پیدائش ۴: ۴ میں ہے۔

"اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا۔"

یہ آدمؑ کے وقت کی بات تھی۔ بعینہ یہی حکم توریت نے دیا۔ گنتی (۱۸: ۱۷-۱۸) میں ہے۔

"اس نے کہ بنی اسرائیل کے سب پہلوٹھے کیا انسان کیا حیوان میرے ہیں میں نے جس دن ملک مصر کے پہلوٹھوں کو مارا اسی دن ان کو اپنے لئے مقدس کیا۔ اور بنی اسرائیل کے سب پہلوٹھوں کے بدلے میں نے لاویوں کو لے لیا ہے"

خروج ۱۳: ۱-۲ میں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ سب پہلوٹھوں کو یعنی جو بنی اسرائیل میں خواہ انسان ہو خواہ حیوان پہلوٹھی کے بچے ہوں ان کو میرے لئے مقدس ٹھہرا کیونکہ وہ میرے ہیں"

۸۔ پہلوٹھی کے ہونے کی فضیلت ایک ایسی فضیلت تھی جو کسی حالت میں باطل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر پہلوٹھی کا بچہ ایسی بیوی سے ہو جس سے نہایت نفرت ہی ہو اور دوسرا بچہ محبوب بیوی سے ہو جب بھی فضیلت پہلوٹھی ہی کے بچہ کو حاصل رہے گی۔ کیونکہ وہ اس کی قدرت کی ابتدا ہے اور پہلوٹھے کا حق اسی کا ہے۔ (استثنا ۲۱: ۱۵-۱۷)

۹۔ جو خدا کی نذر کر دیا گیا۔ وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اس کا حصہ خدا ہی ہے۔ استثنا ۱۰: ۸-۹ میں ہے

"اس وقت خداوند نے لاوی کے قبیلہ کو اس غرض سے الگ کیا کہ وہ خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھایا کرے اور خداوند کے حضور کھڑا ہو کر اس کی خدمت کو انجام دے اور اس کے نام سے برکت دیا کرے۔ جیسا آج تک ہوتا ہے اسی لئے لاوی کو کوئی حصہ یا میراث اس کے بھائیوں کے ساتھ نہیں ملی کیونکہ خداوند اس کی میراث ہے جیسا خود خداوند تیرے خدا نے اس سے کہا ہے"

دوسری جگہ (۱۹: ۱-۲) ہے۔

"لاوی کاہنوں یعنی لاوی کے قبیلہ کا کوئی حصہ اور میراث اسرائیل کے ساتھ نہ ہو۔ وہ خداوند کی آتشیں قربانیاں اور اسی کی میراث کھایا کریں، اس لئے ان کے بھائیوں کے ساتھ ان کو میراث نہ ملے، خداوند ان کی میراث ہے۔ جیسا اس نے خود ان سے کہا ہے"

توریت میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ ہم نے صرف چند کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔

ذ۔ نذر کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کو سات مرتبہ مذبح کے سامنے پھرایا جائے اور اسکے [illegible] پہلے صرف مذبح کے سامنے اس کا سر مونڈا جائے۔ دیکھو گنتی (۶: ۵-۶)

ح۔ جو خدا کی نذر یا معبد کا خادم بنایا جاتا اس کے لئے ایک مخصوص اصطلاح "خداوند کے حضور" یا "خداوند کے آگے" کی قائم ہو گئی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ معبد کے سامنے یا خداوند کی خدمت میں ہے۔

پیدائش (۱۷: ۱) میں ہے

"جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو۔"

استثنا (۱۰: ۸) میں ہے۔

"یہی لاوی خداوند کے حضور کھڑے ہوں اور اس کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیں"[۵]

خروج (۲۸: ۳۵) میں ہے۔

"اس جبہ کی گھنٹیوں [illegible] کو ہارون خدمت کے وقت پہنا کرے تاکہ جب وہ پاک مقام کے اندر خداوند کے حضور جائے یا وہاں سے نکلے تو اس کی آواز سنی جائے۔"

نیز خروج (۲۹: ۱۱) میں ہے۔

"پھر اس بچھڑے کو خداوند کے آگے خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر ذبح کرنا۔"

پھر اسی باب کی آیت ۴۲ میں ہے۔

"ایسی ہی سوختنی قربانی تمہاری پشت در پشت خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر خداوند کے آگے ہمیشہ ہوا کرے"

آیت ۲۳ میں ہے

"اور بے خمیری روٹی کی ٹوکری میں سے جو خداوند کے آگے دھری ہو گی"

آیت ۲۶ میں ہے۔

"... اور تو ہارون کے تخصیص کے مینڈھے کا سینہ لیکر اس کو خداوند کے روبرو ہلانا"

---

[۵] یہاں مولوی صاحب مصنف سے غالباً سہو ہو گیا ہے۔ میں نے اصل کتاب کی مراجعت کی لیکن عبارت میں پتہ نہ چل سکا۔ (مترجم)

کتاب مقدس میں اس طرح کی عبارتیں بہت مل سکتی ہیں۔ اور علمائے اہل کتاب نے خداوند کے آگے اور خداوند کے سامنے کے یہی مفہوم بیان کیے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہی مقام ہے جو مولیٰ چاہتے ہیں کو خداوند نے اس کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ دیکھو استثنا ۱۲:۵، ۱۱، ۱۴، ۱۸، ۲۱، ۲۶، پیدائش ۲۲:۲، ۱۴، استثنا ۱۲:۵ وغیرہ۔

جو قربانیاں عیدین خاص مواقع پر قربانیوں کے ذبح کے لیے مقرر خاص مذبحین تین تھیں دیکھو خروج باب ۸۔ (دیکھو خاص قربانی "قدس الاقداس" کی ادائگی دیکھو احبار ۱۶:۱۴ و ۲۵، حزقی ایل ۴۰:۷، ۴۳)

مقدس کے اندر آنے کے لئے یہ ضروری تھی کہ جنوب کی طرف توجہ ہو کر کی جائے اور جو قربانی کرنا چاہتے ان کو ضروری تھا وہ شمالی دروازے سے اندر داخل ہوں (خروج ۴۰: ۲۰، ۲۵) میں ہے۔

"اور اس نے اس میز کو خیمۂ اجتماع کے اندر مسکن کی شمالی سمت میں پردہ کے باہر رکھا اور اس پر خداوند کے حضور روٹی کو ترتیب سے رکھا جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمۂ اجتماع کے اندر میز کے سامنے مسکن کی جنوبی سمت میں شمعدان کو رکھا اور چراغ خداوند کے آگے روشن کر دیے جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور سونے کی قربان گاہ کو خیمۂ اجتماع کے اندر پردہ کے سامنے رکھا اور اس پر خوشبودار مصالحہ کا بخور جلایا جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور اس نے مسکن کے دروازہ پر پردہ لگایا اور خیمۂ اجتماع کے مسکن کے دروازہ پر سوختنی قربانی کا مذبح رکھ کر اس پر سوختنی قربانی اور نذر کی قربانی چڑھائی جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا۔"

ایک یہودی عالم نے ہیکل پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام The Temple ہے اسمیں اس نے یہودیوں کے تمام مراسم بتفصیل بیان کیے ہیں اور اس امر کا بھی ذکر کیا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور نیچے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "ہم اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بیان کر سکتے۔ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ شمال ٹھنڈ اور تاریکی کی سمت ہے یا یہ وجہ ہو کہ تیہ کے زمانہ سفر میں ان کے معبد کا رخ فلسطین کی طرف تھا" غرض یہ ثابت ہے کہ مسکن کا دروازہ شمال میں تھا اور اس کا قبلہ اور شمعدان کی جگہ جنوب میں۔

صحف یہود پر غور کرنے کے لئے چند بنیادی اصول

۳- یہ بات طے شدہ ہے کہ یہود نے اپنے صحیفوں میں بہت کچھ کمی بیشی اور تبدیلیاں کر دی ہیں، بہت سے مقامات کو ان کی جگہ سے ہٹا دیئے ہیں، پس جس طرح ایک جج کے لئے جھوٹی شہادتوں کے طومار میں سے اصل واقعہ کی صحیح حقیقت کو دریافت کرنا مشکل ہوتا ہے اسی طرح ان صحیفوں سے مسائل کا استنباط نہایت دشوار ہے۔ علماء کو اس میں بڑی حیرانیاں پیش آتی ہیں۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا علمائے اہل کتاب نے اعتراف کیا ہے اور اپنی کتابوں میں اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ .... ان صحیفوں کا تناقض بالکل واضح اور قدیم زمانہ سے معروف و مسلم ہے۔

اس معاملہ پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ خود ان کے صحیفوں کی بعض شہادتیں اصل حقیقت کو بے نقاب کر دینے کے لئے کافی ہونگی۔ دیکھو یرمیاہ نبی ان کے جھوٹ پر کس طرح ماتم کرتے ہیں۔

"نبیوں کی بابت، میرا دل میرے اندر ٹوٹ گیا۔ ...... خداوند اور اس کے پاک کلام کے سبب سے میں متوالا سا ہوں ...... کہ نبی اور کاہن دونوں ناپاک ہیں ..... وہ تم کو بطالت کی تعلیم دیتے ہیں وہ اپنے دلوں کے الہام بیان کرتے ہیں نہ کہ خداوند کے منہ کی باتیں ...... تم آنے والے دنوں میں اسے بخوبی معلوم کرو گے۔ میں نے ان نبیوں کو نہیں بھیجا پر یہ دوڑتے پھرے۔ میں نے ان سے کلام نہیں کیا پر انہوں نے نبوت کی ...... اسلئے دیکھ میں ان نبیوں کا مخالف ہوں خداوند فرماتا ہے جو ایک دوسرے سے میری باتیں چراتے ہیں ...... کیونکہ تم نے زندہ خدا رب الافواج ہمارے خدا کے کلام کو بگاڑ ڈالا ہے۔ (یرمیاہ ۲۳:- ۹ - ۳۶)

"تم کیونکر کہتے ہو۔ ہم تو دانشمند ہیں اور خدا کی شریعت ہمارے پاس ہے؟ لیکن دیکھ لکھنے والوں کے باطل قلم نے بطالت پیدا کی ہے۔ دانشمند شرمندہ ہوئے۔ وہ حیران ہوئے اور پکڑے گئے دیکھ انہوں نے خداوند کے کلام کو رد کیا۔ ان میں کیسی دانائی ہے؟" (یرمیاہ ۸ :- ۸ - ۹)

اسی حقیقت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اشارہ فرمایا ہے (دیکھو یوحنا ۱۰: ۸)

"جتنے مجھ سے پہلے آئے سب چور اور ڈاکو ہیں"

اس عبارت کی روایت یہ جو میں کچھ نقص رہ گیا ہے۔ "جتنے مجھ سے پہلے آئے" کی تعمیم صرف ان لوگوں تک محدود ہے جو انبیاء صادقین کے بعد اور حضرت مسیح علیہ السلام سے کچھ پہلے آئے۔

علاوہ ازیں جو شخص غور کرے گا اس پر یہ حقیقت اچھی طرح آشکارا ہو جائے گی کہ یہ سب مختلف الماخذ روایات کا مجموعہ ہیں اور یہ ساری روایات کی خصوصیت ہے اکثر باہمگر متناقض۔ چنانچہ بعض فرقوں کے نزدیک جو صحیفے مسلم ہیں دوسروں کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ ایک معلوم و مشہور بات ہے اور علمائے اہل کتاب نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ان صحیفوں پر کبھی حسن ظن کے ساتھ نظر نہ ڈالی جائے بلکہ نقد و انتقاد کی پوری سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے اور حق و باطل کے مابین امتیاز کی کوشش کی جائے۔

اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل اصول ضروری ہیں۔

ا۔ جو باتیں یہود کے نفس و ہوا کے موافق پڑتی ہیں ان پر بڑا اعتبار نہ کیا جائے۔ اس بارہ میں انکی قدر روایات لائق نقص ہیں کیونکہ ان کی تبدیلیاں اور تحریفات معلوم ہیں۔

ب۔ تحریف کرنے والے بعض اوقات ادھر اُدھر کی تبدیلیاں کر دیتے ہیں لیکن حق کے تمام نشانات نہیں مٹا سکتے باقی رہ جاتے ہیں بعض چیزیں ان کی نگاہوں سے بچ کر محفوظ رہ جاتی ہیں اور وہ نادانستہ طور پر اپنی خواہش کے بالکل خلاف ان کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ پس نص کے اقتضاء و اشارات کی روشنی میں انہی نشانات کو پکڑنا چاہئے۔ اور پھر ان امور کا سراغ لگانا چاہئے جو ان کی تحریفات سے مجروح ہوئے ہوں گے۔

ج۔ ہر ٹھیک بات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے اردگرد حقائق کا ایک حصار رکھتی ہے۔ جھوٹ کو یہ حیثیت حاصل نہیں۔ پس آیات و روایات کی تطبیق اور واقعہ کے اجزاء و متعلقات کو جمع کر کے آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حق کیا ہے۔

د ۔ قوموں کے احوال و معاملات جو اب علم کی روشنی میں آگئے ہیں، وہ بھی اس کشف و تحقیق کی راہ میں آدمی کی رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ چند عقلی اصول ہیں جن کو صحف یہود پر نقد و نظر کرتے وقت سامنے رکھنا چاہئے۔ ان کے بغیر اس خارزار میں قدم رکھنا خطرہ سے خالی نہیں۔

(باقی)

دائرہ حمیدیہ کی عربی مطبوعات

تفسیر سورہ عبس۔ اس میں انبیاء کے خلق عظیم انکی عصمت اور ان کے مواقع عتاب کے متعلق نہایت اہم مباحث ہیں۔ قیمت ۔/۴

تفسیر سورۃ التین:۔ اس میں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۔/۴

تفسیر سورۃ الکوثر۔ کوثر کی حقیقت کے متعلق اسقدر مدلل لکھا ہے کہ بحث کا کوئی گوشہ محجوب نہیں رہ گیا ہے۔ نماز اور قربانی کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کی تفصیل طویل اور نہایت ایمان افروز ہے۔

قیمت ۔/۴

تفسیر سورۃ الفیل۔ اس کا اردو ترجمہ الاصلاح ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکا ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ قیمت ۔/۸

تفسیر سورۃ اللہب:۔ اسمیں ہم عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اسکی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت فکر انگیز ہیں۔ قیمت ۔/۴

الرای الصحیح فی من ہو الذبیح:۔ اس میں اہل کتاب کے دعویٰ کے خلاف قرآن اور تورات کے محکم دلائل سے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے۔ قیمت ۔/۱۰

امعان فی اقسام القرآن۔ اسمیں ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کی قسمیں استدلال اور شہادت کیلئے ہیں۔ قیمت ۔/۸

منیجر

مذاکرہ

"تحقیق قربانی" اور "تفسیر بیان للناس"

از امین احسن اصلاحی

ناظرین کو شاید یاد ہوگا کہ معاصر بلاغ امرتسر کے ایک مضمون "تحقیق قربانی" اور خواجہ احمد الدین صاحب مرحوم کی "تفسیر بیان للناس" پر الاصلاح بابت ماہ مارچ ۳۷ء اور اگست ۳۷ء میں تنقیدیں نکلی تھیں۔ الاصلاح کے عام دستور کے مطابق یہ تنقیدیں نہایت مختصر تھیں۔ چند لفظوں میں، بغیر کسی نفاق و مداہنت کے، اپنی صاف صاف رائے لکھ دی گئی تھی۔ ہماری یہ صاف گوئی معاصر بلاغ کے کارکنوں اور خواجہ احمد الدین صاحب مرحوم کے متبعین کو بہت بری لگی اور اس پر انھوں نے عتاب اور اظہار خفگی کے خطوط لکھے۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ نے سندھ سے بھی ہم کو خطوط لکھے اور مطالبہ کیا کہ ہم بلاغ کے مضمون "تحقیق قربانی" کا مفصل جواب لکھیں اور گن گن کے بتائیں کہ خواجہ صاحب کی تفسیر میں کیا کیا غلطیاں ہیں۔ یہ غصہ اور مطالبہ ایک حد تک بجا تھا۔ کسی کی کتاب یا مضمون پر جب ہم مخالفانہ نکتہ چینی کرینگے تو خواہ مخواہ وہ چڑھے گا۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں تنقید اور مدح و منقبت ہم معنی خیال کی جاتی ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ہم بھی اس معاملہ میں کچھ مجبور تھے، اور ہم نے اپنی مجبوریوں کو ان دوستوں پر ظاہر بھی کر دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کو انھوں نے باور نہیں کیا۔ چنانچہ سندھ والے بزرگ نے اپنے وہ تمام خطوط اور ہمارے معذرت نامے بلاغ کی جنوری اور فروری کی اشاعتوں میں نہایت شاندار مقدمات و تمہیدات اور شروح و حواشی سے آراستہ کر کے شائع کر دیئے ہیں اور اس پر جگہ جگہ بلاغ کے اڈیٹر صاحب نے بھی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ اور چونکہ انھوں نے اپنی دانست میں اپنے ایک اور حریف کو بھی زیر کر لیا ہے، اسلئے

ب و لہجہ میں غصہ کی جھنجلاہٹ کے ساتھ ساتھ فاتحانہ غرور کی تمکنت بھی نمایاں ہے اور اس میں کہیں کہیں شاعری کی بھی جھلک ہے اور ظاہر ہے کہ اس موقع پر ان کی تحریر میں یہ رنگ نمایاں ہونا قدرتی ہے۔

بلاغ کے یہ پرچے پڑھنے کے بعد ہمارے بعض کرم فرما بزرگوں نے ہم سے اس امر کی وجہ دریافت کی ہے کہ اس چیلنج کے جواب میں ہم نے خاموشی اور اغماض کی روش کیوں اختیار کی۔ ان کے اطمینان کے لئے بعض باتیں آج مجبوراً زبان قلم پر آتی ہیں۔ امید ہے ہمارے ان دوستوں کو ناگوار نہ ہوں گی۔

تفسیر "بیان للناس" اور مضمون "تحقیق قربانی" کے متعلق الاصلاح کو یہ شکایت ہے کہ ان میں قرآن کی آیتوں کی تاویل قواعد لغت و زبان سے بالکل بے قید ہو کر کی گئی ہے اور یہ بے قیدی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ کوئی شخص جس نے چند دن بھی کسی عربی مدرسہ میں بسر کئے ہوں، ان کے مطالعہ میں اپنا وقت بغیر انتہائی نفرت و اکراہ کے ضائع کرنا پسند نہ کرے گا۔ ہم نے "تفسیر بیان للناس" جب بقصد تبصرہ پڑھنی چاہی تو چند صفحے پڑھنے کے بعد مصنف کی جسارت سے سخت روحانی اذیت ہوئی اور اغلاط کا طومار ایسا بے پایاں تھا کہ ان کے صرف ایک مختصر حصہ کو بھی جمع کیجئے تو الاصلاح کے لئے ناقابل تحمل ہو اگر صرف چند کی طرف اشارہ کر کے گذر جائیے تو گویا کتاب کے حق میں ایک مخفی سفارش۔ اسلئے ہم نے دو لفظوں میں بات ٹال دی کہ عرشی صاحب کتاب کے متعلق ہماری رائے معلوم کرنا چاہتے تھے وہ فرض ادا ہو گیا۔ زیادہ کریدی اور بحث و مناظرہ سے کیا حاصل! لیکن کارکنان بلاغ اور بالخصوص جناب محمد شفیع صاحب (سندھ) نے اس کے بعد لمبے لمبے خطوط کی بوچھار شروع کر دی اور متقاضی ہوئے کہ ان کو تفسیر کی غلطیاں گن گن کر بتائی جائیں۔ مجبور ہو کر کتاب دوبارہ نکلوائی اور بعض صفحات پڑھے۔ لیکن پورے یقین کے ساتھ محسوس کیا کہ اس کتاب کے متعلق جو جملے الاصلاح میں لکھ دئیے گئے ہیں وہ صحیح سے صحیح تنقید ہے، دو چار غلطیاں اس کتاب کی بتائی جاتی ہیں جس میں سو پچاس غلطیاں ہوں۔ یہ کتاب کتاب نہیں ہے، اغلاط اور خرافات کا ایک ڈھیر ہے اور طے کر لیا کہ کسی مناسب فرصت میں محمد شفیع صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ عربی زبان سے بالکل ناواقف ہیں اس قسم کے فتنہ میں نہ پڑیں اور یہ مخفی خواہش دل میں اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ انھوں نے اپنی تیس

"طالب حق" ظاہر کیا تھا اور ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ مضمون نگاری اور مناظرہ کے شائق ہیں، اور بعجزی کے ساتھ [illegible] عالم [illegible] کے فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں تو شاید ان کے خطوط کے جواب میں جو وقت ضائع ہوا وہ بھی کسی بہتر مصرف کے لئے بچا لیا جاتا۔

شیخ صاحب کے علم و فضل کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اپنے دوسرے نامہ میں جو اڈیٹر الاصلاح کے [illegible] ایک [illegible] قرآن مجید کی ایک آیت بھی نقل فرمائی تھی جس کا املا یوں تھا انا للّٰہ وان علیہ راجعون۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے ساتھ انھوں نے جو خط لکھا اس کا حال یہ تھا کہ اس کی سطر سطر استہزا، تحکم، طنز وادعا و غرور وغیرہ کی آئینہ دار تھی۔ اور مطالبہ یہ تھا کہ اڈیٹر الاصلاح بتلائے کہ مولوی احمد الدین صاحب نے اپنی تفسیر میں نحو اور ادب کی کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ ہم اس خط کو پڑھ کر سخت حیران ہوا اور جی میں آیا کہ لکھ دوں کہ سیبویہ اور امرء القیس کی ہمسری کے شوق کو چھوڑ کر پہلے کسی مکتب میں ناظرہ پڑھئے۔ اس کے بعد میدان اجتہاد میں نزول اجلال فرمائیے گا۔ لیکن چونکہ اس طرح کے ادعا و غرور کی شایان اس عہد میں نادر نہیں ہیں اس لئے افسوس کے ساتھ ان کا خط رکھ لیا اور شذرات میں ان کی ذات کو نہیں صرف ان کی ذہنیت کو مخاطب کر کے ایک نوٹ لکھ دیا کہ ایسے لوگوں کے لئے بہترین راہ تقلید و اتباع کی ہے۔ اجتہاد کا شوق نہایت مہلک ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس عمدہ نصیحت کو قبول کر لیتے۔ غصہ کے پورے ہیجان اور انتقام کے انتہائی جوش میں پندرہ سولہ صفحہ کا ایک اور خط لکھ مارا اور تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان مناظرہ میں اتر آئے۔

ع مناظرہ الاصلاح کا راستہ نہیں۔ مناظرہ میں آدمی ہمیشہ حریف کے تعاقب میں رہتا ہے اور حریف اگر موضوع بحث سے بالکل نابلد ہو (جیسے شیخ صاحب تھے) تو پھر سارا زور بالکل غیر متعلق اور دور از کار باتوں میں ضائع ہوتا ہے اور وقت اور کاغذ کا یہ زیان وہ شخص کبھی نہیں گوارا کر سکتا جس کی زندگی کا ہر لمحہ صرف طالب العلمانہ کاموں سے گھرا ہوا ہو۔ ان مختلف اسباب کی وجہ سے شیخ صاحب کی بار بار کی دعوت مبارزت کے باوجود ہم نے مناظرانہ رویہ اختیار کرنے سے گریز کیا اور سوچا کہ جہاں تک قربانی کے معاملہ کا تعلق ہے، آہستہ آہستہ مختلف صحبتوں میں

تمام مباحث ان صفحات میں پیش کر دیئے جائیں گے۔ (چنانچہ اس کا آغاز الاصلاح میں کر دیا گیا ہے) اور جب یہ متفرق مباحث لوگوں کے سامنے آجائیں گے تو ایک سیر حاصل بحث اس مسئلہ پر کر دی جائے گی۔ قطع نظر اس سے کہ محققین بلاغ کیا کہتے ہیں۔ رہ باقی رہی خواجہ صاحب کی تفسیر تو اس کے متعلق ایک بزرگ کی بیان کی ہوئی ایک حکایت بار بار یاد آتی ہے اور آج بادل ناخواستہ ہم اپنے ان دوستوں کو بھی سنا دینا چاہتے ہیں۔

یک بزرگ کسی باورچی کی دوکان سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ باورچی بدسلیقہ اور پھوہڑ تھا، روزانہ سالن میں دو چار مری ہوئی مکھیاں نکلتیں۔ وہ بیچارے خفا ہوتے اور سالن واپس کر دیتے۔ آئے دن کا یہی قصہ تھا۔ یک دن انھوں نے دیکھا کہ سالن کا پورا پیالہ مری ہوئی مکھیوں سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے صبر و شکر کر کے رکھ لیا۔ باورچی نے عرض کی حضور جب سالن میں دو چار مکھیاں ہوتیں تب تو آپ خفا ہو جاتے اور بہ نہ واپس کر دیتے اور آج کہ پورا پیالہ مکھیوں سے بھرا ہوا ہے، آپ کچھ نہیں بولے۔ آخر کیا بات ہے؟ فرمایا بھی، جب تک دو چار مکھیاں ہوتی تھیں، اس توقع پر خفا ہوتا تھا کہ ممکن ہے تم کو کچھ دھیان ہو اور احتیاط کرو لیکن اب جبکہ تم مکھیوں ہی کا قورمہ پکا کے لائے ہو تو تم سے کیا توقع اور کیا شکایت !!

ہمارے محترم عرشی صاحب اور شفیع صاحب یقین کریں کہ بعینہ یہی صورت حال ہم کو پیش آئی۔ دو چار غلطیاں ہوں تو اس پر ٹوکئے اور اعتراض کیجئے۔ نہ تو غلطیوں کا ہونا مستبعد اور نہ اعتراض و نکتہ چینی کوئی گناہ۔ لیکن اگر کوئی شخص غلطیوں ہی کو کیش و مشرب قرار دے لے تو اس سے کیا لڑیئے۔ پس خواجہ صاحب کی تفسیر تفسیر نہیں ہے۔ یہ "مکھیوں کا قورمہ" ہے جس پڑھے لکھے کے پاس پہنچ گئی وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کو معاف فرمائے اور آپ لوگوں کو توفیق دے کہ تفسیر نگاری کا شغل چھوڑ کر کوئی اور دھندا اختیار کریں۔

بلاغ میں چونکہ کوئی چیز طالب علمانہ ذوق کی نہیں ہوتی اس لئے اڈیٹر الاصلاح کو اس کے مطالعہ کا موقع کبھی مشکل ہی سے ملتا ہے جنوری اور فروری کے پرچوں میں چونکہ بعض متعلق باتیں تھیں اس لئے سامنے

موجود ہیں۔ آپ لوگوں کی تعدی کی بلند آہنگی سنکر آدمی سہم جائے لیکن ہم نے ہمت کرکے فروری کا پرچہ اٹھایا اور تفسیر بیان القرآن کے چند صفحے جو اس میں شائع ہوئے ہیں دیکھے۔ آپ لوگ چاہیں تو صرف اس ایک ہی پرچہ کے چند صفحات تک مترجم کی متعدد ادبی اور نحوی بےخبری کی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں اور یہ صرف وہ غلطیاں ہیں جن میں مترجم بالکل منفرد ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بهن من ازواج ولو اعجبک حسنهن الا ما ملکت یمینک الآیہ

اس آیت کا ترجمہ مترجم نے یہ کیا ہے۔

" تیرے واسطے کوئی عورت حلال نہیں اور نہ یہ حلال ہے کہ ان کے بجائے دوسری بیویاں تبدیل کرے اگرچہ تجھے ان کا حسن خوش لگے مگر ہی تیرے ہاتھ جن کے مالک ہوگئے۔"

اس آیت میں مترجم نے "من بعد" کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہے کہ "الا ما ملکت" کا جو مطلب مترجم لینا چاہتا ہے وہ "من بعد" کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ "الا ما ملکت" سے مترجم کے نزدیک وہی بیویاں مراد ہیں جو بروقت آنحضرت کے حبالہ عقد میں ہیں ورا ستثنا بغرض حصر ہے یعنی جو بیویاں تمھارے نکاح میں ہیں صرف وہی بیویاں تمھارے لئے جائز ہیں۔" مترجم کو یہ مطلب لینے کے لئے ضروری ہوا کہ "من بعد" کو قرآن مجید سے خارج کردے کیونکہ "من بعد" کے باقی رکھنے کے بعد مترجم کو ترجمہ یوں کرنا پڑتا کہ "تیرے لئے کوئی عورت حلال نہیں ہے ان کے بعد...... مگر یہی تیرے ہاتھ جن کے مالک ہوگئے۔" ظاہر ہے کہ اس ترجمہ کے بعد آیت خود بول اٹھتی کہ مترجم نے جو مطلب لیا ہے بالکل غلط ہے کیونکہ یہ کہنے کے کوئی معنی ہی نہیں کہ "تیرے لئے ان عورتوں کے بعد نہیں جائز ہیں مگر یہی عورتیں"۔ اس میں "الا ما ملکت" کا ٹکڑا بالکل بے فائدہ اور زائد ہو جاتا ہے اور قرآن مجید حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے۔ پس قرآن کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے کے لئے مترجم مجبور ہوا کہ بے دریغ ایک سنگین قسم کی تدلیس کا مرتکب ہو اور

یحرفون الکلم عن مواضعہ کی ایک مشئوم مثال قائم کرے۔ حالانکہ اگر مترجم چاہتا تو "من بعد" کو باقی رکھتے ہوئے بھی اپنی تاویل کو فاہر فریب بنالیتا۔ لیکن اس ظاہر فریبی کیلئے بھی عربی دانی کی ضرورت تھی اور یہ بھی اسی وقت تک قائم رہتی جب تک کسی عربی کے طالب علم کی نظر سے محفوظ رہتی۔

۲- فاذا طعمتم فانتشروا ولامستانسین لحدیث ط

اس ٹکڑے کا ترجمہ مترجم نے یہ کیا ہے۔

"پس جب کھا چکو تو چلے جاؤ اور حدیثیں سننے کے لئے دل لگا کر نہ بیٹھے رہا کرو۔"

اس میں مترجم نے "حدیث" کا ترجمہ "حدیثیں" کیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا لفظ ہماری مصطلحہ حدیث کے لئے کلام عرب یا قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا ہے۔ اس لئے یہ ترجمہ کلام عرب سے نہایت جہل و بیخبری کا نتیجہ ہے۔ اور ساتھ ہی یہ قاعدہ زبان سے بھی بیخبری کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ اگر قرآن مجید نے یہ اصطلاح اختیار کر لی ہوتی تو لحدیث نہ فرماتا للحدیث فرماتا۔ پھر یہ "سننے کیلئے" کس لفظ کا ترجمہ ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ "مستانسین" کو مترجم نے اردو مصدر "سننا" سے مشتق سمجھ لیا ہو!! یہ بات ہم کو کھٹکتی ہے۔ امید ہے عرشی صاحب یا شفیع صاحب اس پر روشنی ڈالیں گے۔

ہمارے نزدیک مترجم نے یہاں تالیف کلام بھی نہیں سمجھی ہے۔ صحیح تالیف یہ ہے کہ وہ مستانسین کا عطف غیر ناظرین اناہ پر ہے۔ مگر چونکہ بعض ارباب تفسیر نے ایک ضعیف مذہب یہ بھی نقل کیا ہے اور بعض اردو مترجمین قرآن نے، جو عربیت سے زیادہ ترجمہ کی روانی کے شائق ہیں، اسی کو اختیار بھی کر لیا ہے۔ اس لئے اس بارہ میں ہم مترجم پر اعتراض نہیں کرسکتے۔ مترجم کا دماغ ایک غلط سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اسلئے جہاں کہیں وہ اپنا اجتہاد چھوڑ کر دوسرے مترجمین و مفسرین کی باتیں لیتا ہے تو بالعموم انھیں باتوں کو اٹھاتا ہے جن میں ان سے مسامحت ہو گئی ہے۔

اس سے ان منکرین حدیث کی ذہنیت کا ایک عجیب و غریب پہلو آشکارا ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ عہد نبوت

نہ ہوتے تو لوگوں کو آنحضرت کی باتیں سننے سے روکتے ۔ حالانکہ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں یہ کام یہود، منافقین اور کفار کا بتلایا گیا ہے اور متعدد آیتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ قرآن مجید ملازمت وصحبت نبی پر زیادہ سے زیادہ حث وتحریض فرماتا ہے اور کبھی کبھار جب یہ صورت پیش آئی کہ آنحضرت کسی اہم امر میں مشغول ہونے کی وجہ سے کسی طالب استماع حدیث وتزکیہ سے ذرا بھی بے خبر غفلت ہوئے تو آپ کو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا ۔ اس حقیقت کی ایک نہایت واضح شہادت سورہ عبس میں ہے ! اور جو لوگ آنحضرت کی مجالس سے بیزار ہوتے تھے ، یا آپ کی باتیں سننے کے شائق نہ تھے ، یا مجالس سے چپکے سے کھسک جاتے تھے ، یا لوگوں کو ورغلاتے تھے کہ آپ کی باتیں نہ سنیں ان کو نہایت ترش الفاظ میں تہدید فرمائی گئی ہے ۔ اور انکی مذمت میں قرآن مجید کی اتنی آیتیں اتری ہیں کہ ان سب کو جمع کرنے کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے بلکہ ہم پورے یقین کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کی زیادہ سے زیادہ صحبت کو تفقہ فی الدین کا اصل سرچشمہ قرار دیا گیا ہے ۔ منجملہ مقاصد ہجرت کے ایک اہم مقصد انکا یہی تھا ۔ خود سکونت مدینہ کی فضیلت بھی زیادہ تر اسی پہلو سے تھی ۔ یہ تمام باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں ۔ پھر ان کی موجودگی میں یہ بات کتنی عجیب ہے کہ قرآن مجید میں اس بات کیلئے آیت اترے کہ مسلمان آنحضرت کے پاس حدیثیں سننے کے لیے نہ جمع ہوں ۔ یا للعجب !!

۳ ۔ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

اس آیت کا ترجمہ مترجم نے یوں کیا ہے ۔

" تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ کرتے ہیں تو اے ایمان دارو ، تم بھی ہر وقت اس (نبی) کی خبر میں لگے رہو ، اور سلامت رکھو اسے سلامت رکھنا "

اسکے بعد لفظ صلوٰۃ کی تحقیق یہ بیان فرمائی ہے ۔

" صلوٰۃ ۔ یعنی ٹیڑھے بانس کو آگ پر سیدھا کرنا ، بغرض اصلاح کرنا ہے "

پس مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور فرشتے نبی کی اصلاح کرتے ہیں اور چونکہ اصلاح خیر خواہی کا کام ہے اس لئے

ایک قدم آگے بڑھکر اصلاح کے معنی بھلائی کرنے کے ہوگئے، چنانچہ مومنین کو جو حکم ہوا کہ صلوا علیہ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیغمبر کی بھلائی میں لگے رہو۔

مترجم کی ذہانت قابل داد ہے۔ لیکن اس نے اپنی اس "تحقیق انیق" کی تائید میں نہ کسی لغت کا حوالہ دیا ہے، نہ کلام عرب سے کوئی شہادت پیش کی ہے۔ ہمارے سامنے لسان، صحاح، جمہرۃ اللغۃ، اقرب الموارد، صراح، منجد وغیرہ ہیں۔ ان میں صلوٰۃ کے یہ معنی کہیں نہیں لکھے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مصنف نے یہ معنی اپنے جی سے گڑھ لئے ہیں۔ ہاں صلی اللحم یصلیہ بمعنی شواہ اور صلی النار وبالنار یصلی صلیا بمعنی قاسی حرھا واحترق بھا ودخل فیھا ملتے ہیں لیکن یہ یائی ہے واوی نہیں ہے۔ وشتان بینھما

اسی سے محاورہ ہے صلّی عصاہ علی النار یا بالنار جس کے معنی ہیں اس نے لٹھیا کو آگ پر نرم کرکے سیدھا کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی محاورہ پر کہیں مصنف کی نظر پڑگئی ہے۔ لیکن عربی زبان کے قواعد نہ جاننے کی وجہ سے اولاً تو وہ دونوں کے فرق کو نہ سمجھ سکا، ثانیاً اس محاورہ کا صحیح استعمال بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ صرف ایک دھندلا سا مفہوم اس کے دماغ نے اٹھایا اور وہی تفسیر میں داخل ہوگیا۔

حالانکہ اگر یہ محاورہ ہے، اور بے شک ہے، تو اس کو استعمال اسی طریقہ پر ہونا چاہئے جس طریقہ پر اہل زبان نے استعمال کیا ہے، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ خواجہ صاحب جس طرح چاہیں اس کو ذبح کردیں۔

پس دیکھنا چاہئے کہ اس کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ اس کا طریقہ استعمال ہے صلی العصا علی النار یا بالنار (اس نے اپنی لٹھیا آگ پر سینک کر سیدھی کی) اس میں غور کرکے دیکھو۔ حرف جار (علی یا ب) لفظ عصا پر داخل نہیں ہے، نار کے لفظ پر داخل ہے اور معنی کے لحاظ سے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ ایک چیز وہ ہے جس کی سینک کر اصلاح کی جائے گی۔ اور ایک شے وہ ہے جس پر وہ سینکی جائے گی۔ پس علی یا ب اس کو داخل ہونا چاہئے جس کے ذریعہ فعل واقع ہو۔ نہ کہ مفعول پر۔

طریقہ استعمال اور محاورہ کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب خواجہ صاحب کی تحقیق کی روشنی میں

یصلون علی النبی کے معنی پر غور کرو۔ وہ ترجمہ کرتے ہیں۔ "تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ کرتے ہیں" اور صلوٰۃ کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ "نبی کی اصلاح کرتے ہیں" حالانکہ ان کے پیش کردہ محاورے کے مطابق ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ "اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر گرم کرکے یا سینک کر اصلاح کرتے ہیں"۔ باقی رہی یہ بات کہ کس کی اصلاح کرتے ہیں، کس کو سینکتے اور تپاتے ہیں تو یہ بتانا بھی خواجہ صاحب کے ذمہ باقی رہا جاتا ہے، کیونکہ از روئے محاورہ ضروری ہو... یہاں صلون کا مفعول ضروری ہے۔ اطمینان کے لئے قیس بن زہیر کا ایک شعر لیجیے

فلا تعجل بامرک واستدمہ　　　فما صلی عصاہ کمستدیم

(یعنی اپنے معاملہ میں جلدی نہ کرو ... جو لکڑی کو سیدھی کرتا ہے جو لگا رہتا ہے۔)

دیکھئے شاعر نے صلی عصاہ کہا صلی علی عصاہ نہیں کہا ہے۔ پس خواجہ صاحب جو معنی بیان فرماتے ہیں وہ اگر صحیح ہو سکتے تھے تو صرف اس شکل میں کہ یصلون علی النبی کے بجائے یصلون النبی ہوتا۔ کاش کہ ان بلاغ کو چاہیے کہ لغت و کلام عرب میں اس محاورہ کا تتبع کریں۔

ہم خواجہ صاحب کی خاطر سے تھوڑی دیر کے لئے لغت اور ادب کے رسوم و قیود کو توڑ دیتے ہیں۔ اور یہی معنی تسلیم کر لیتے ہیں جو خواجہ صاحب فرماتے ہیں لیکن ایک بات ضرور دریافت کریں گے کہ یا ایہا الذین امنوا صلوا علیہ کے کیا معنی ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ کو تو حق ہے کہ پیغمبر کو آزما کر، فتنوں میں ڈالکر تجربوں میں تپا کر مصائب میں جانچ کر اس کی اصلاح کرے۔ لیکن کیا مومنین کو بھی حق ہے کہ اس کو طرح طرح کے فتنوں میں ڈالکر اس کی اصلاح و تربیت کریں۔ اگر لفظ اپنے ان تمام حقائق سے مجرد ہو گیا ہے تو کیا سطح تحریر کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ اور کیا ایسا لفظ جس کی سپرٹ یہ ہو ایسے موقع پر وقار نبوت اور بلاغت نظام کے لئے مناسب ہوگا؟ پیغمبر کا درجہ آپ کتنا ہی نیچا کر دیجئے لیکن امت کا درجہ تو خدا کے برابر نہیں کر دے سکتے!! عربی زبان سے ناواقفیت ہو تو ہو خدارا ایک عام آدمی کا ذوق تو پیدا کیجئے!

پھر عدی بن رقاع کا شعر ہے۔

صلی الالٰہ علی امرئ ودعتہ   واتم نعمتہ علیہ وزادھا

اعشیٰ کہتا ہے

علیک مثل الذی صلیت فاغتمضی   نوما فان لجنب المرء مضطجعا

خواجہ صاحب کی تحقیق کی روشنی میں ان شعروں کے کیا معنی ہوں گے؟

اس مادہ کے اصل معنی پر اہل لغت نے ایک حد تک بحث کی ہے لیکن سب سے زیادہ تشفی بخش تحقیق استاذ امام کی ہے۔ ان دوستوں میں کوئی ان مباحث کا اہل نہیں ورنہ جی چاہتا ہے کہ اس لفظ کی اصل حقیقت پیش کیجائے۔ مگر اس وقت تو اصلی بحث یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا یہ ترجمہ از روئے لغت و محاورہ کلام ونیز قواعد زبان صحیح بھی ہے یا نہیں۔ بوجوہ مذکورہ بالا ہمارے نزدیک نہ صرف غلط بلکہ جہالت اور بیخبری کی ایک عبرت انگیز مثال ہے!

اور ہاں حضرات! یہ سلموا تسلیما اور "سلامت رکھو اسے سلامت رکھنا" کے کیا معنی؟ "سلم الشئ من الآفۃ" کسی شے کو کسی آفت سے بچانے کے معنی میں مستعمل ہے۔ مگر اس کا مطلب کیا ہوا؟ رسول امت کی تحویل میں تو ہے نہیں کہ لوگوں پر اس کو حفاظت سے رکھنے کی ذمہ داری ہو؟ رہیں اس کی تعلیمات تو یقینا حدیث اور سنت کے لئے تو یہ حکم ہو نہیں سکتا، اس سے آپ لوگوں کو انکار ہے؛ باقی رہا قرآن تو اس کی نسبت خدا نے خود فرمایا ہے کہ "ہم نے اس کو اتارا ہے وانا لہ لحافظون اور ہم اس کے محافظ ہیں۔ اس کی ذات کے لئے یہ وعدہ موجود ہی ہے کہ واللہ یعصمک من الناس۔ اور قرآن مجید میں یہ بات بھی متعدد مقامات میں واضح کردی گئی ہے کہ خدا، اس کا دین، اور اس کے رسول ہمارے رحم و کرم کے محتاج نہیں ہیں ہم ہی ان کے محتاج ہیں بل انتم الفقراء، پھر اسے "سلامت رکھو سلامت رکھنا کا کیا مطلب ہے؟ ممکن ہے صلوا علیہ میں امت کو جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ) پیغمبر کو سینک کر اور تپا کر اصلاح کرو تو اس کے ساتھ سلموا تسلیما بطور بدرقہ اس لئے کہہ دیا گیا ہو کہ سینکنا اور تپانا کہیں حد سے متجاوز نہ ہوجائے بلکہ بچا بچا کر ہو۔ اُس مہارت و کاروانی کے ساتھ جو حجام و سندان کی بازی میں شرط ہے! یہ ایک ذہنی مغولہ ہے۔

سمجھ و ادراک سے بالا۔ پتہ یہ ہے کہ ان باریک نکتوں تک پہنچنا کچھ مصنف بیان القرآن ہی کے لئے مقدر تھا۔ لغت کے فقرے معقول ہیں اور اعراب والے رفع و نصب کے چکر میں گم ہیں۔ اور

دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

کیا ان جملوں کا مفہوم کوئی بتا سکتا ہے کہیں محض ... صلوۃ نہیں ہے بلکہ صلوا علیہ ہے ... تو تنبیہ کیا کہ دہرایا نہیں؟

۴۔ ملعونین: اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا ؀

مترجم نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

ملعون بنکر (عیب یا عیب دار بنکر) (اگر شرارت کرکے کبھی کہیں ظاہر ہو جائیں گے پھر) جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے (یعنی قید کی سزائیں بھگتیں گے) (اور بعض دفعہ سنگین جرائم وغیرہ میں) قتل بھی کئے جائیں گے خوب قتل کرنا۔

اس ترجمہ میں چند در چند غلطیاں ہیں۔

الف۔ ملعونین کا مفہوم عیب کر یا عیب دار بنکر بالکل غلط ہے۔ لغت اور استعمالات سے اسکی تائید نہیں ہوتی۔ لعنت ترین مذہبی سزا ہے جو کسی جماعت یا فرد کو خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس کی اصل ابعاد اور طرد ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو ملعون ہوتا ہے وہ جماعت سے کاٹ دیا جاتا ہے اور معذب ہوتا ہے۔ چھپنا اور عیب بدلنا خود ان کا فعل ہے اور لعنت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ "ملعونین" کا نتیجہ قرآن نے اخذوا وقتلوا تقتیلا کہکے خود بیان فرما دیا اس میں مصنف کے اقوال کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ب۔ "اخذوا وقتلوا تقتیلا" کی تشریح مترجم نے اس طرح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف سزائیں مختلف نوعیت کے مجرمین اور مختلف حالات کے لئے ہیں حالانکہ اسالیب زبان کے اعتبار سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہاں حرف عطف واؤ ہے جو اصلاً جمع کے لئے ہے پس اخذ و تقتیل دونوں ایک ہی کے لئے ہونا چاہیے۔ اگر مختلف حالات کے لحاظ سے یہ دو مختلف سزائیں ہوتیں تو اسلوب کلام

کچھ اور ہوتا ہے مثلاً مائدہ میں فرمایا ہے۔

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض

دارالندوہ میں بیٹھ کر کفار آنحضرت کے خلاف مشورے کرتے تھے ان کی مختلف تجویزوں کو یوں بیان فرمایا۔

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک۔

اس کے شواہد بے شمار ہیں لیکن اختصار مانع تفصیل ہے۔ فافہم

ج قتلوا تقتیلا کا ترجمہ مترجم نے ایسا کیا ہے جس سے کمیت فعل ظاہر ہوتی ہے حالانکہ یہ کیفیت فعل کو بتا رہا ہے یعنی شر تقتیل کو۔ لیکن اس کا تعلق ذوق زبان سے ہے اور ہم اس سے اس لئے درگذر کرتے ہیں کہ اس کے ترجمہ میں بعض دوسرے مترجمین سے بھی مسامحت ہو گئی ہے اور مترجم نے انہی کی عامیانہ تقلید کی ہے۔

۵۔ وما یدریک لعل الساعۃ قریبا

اس کا ترجمہ مترجم نے یہ کیا ہے:۔ "تجھے کیا معلوم کہ وہ گھڑی قریب ہی ہو"۔

مترجم کے ترجمہ میں لفظ "کہ" بتا رہا ہے کہ وہ لعل الساعۃ الخ کو وما یدریک کا مفعول سمجھ رہا ہے حالانکہ یہ اس کا مفعول نہیں ہو سکتا۔ اس کا مفعول محذوف ہے۔ اس کا پتہ مقابلہ سے چلتا ہے ایک جگہ ہے وما یدریک لعل الساعۃ قریب یعنی ما یدریک ان الساعۃ بعید فلعلھا قریب۔ دوسری جگہ ہے وما یدریک لعلہ یزکی۔ اس میں بھی مفعول محذوف ہے۔ اور مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنی کیف العلم بک انہ لو یجئ لما یسر لہ من التزکی او التذکر فلعلہ یزکی۔ اس لئے ترجمہ میں "کہ" ہرگز نہ ہونا چاہئے ورنہ لعل الساعۃ تکون قریبا مفعول بن جائے گا۔ اور حذف کا نشان گم ہو جائے گا۔ عربی جاننے والے اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ لعل الساعۃ کو مفعول ان لینے میں آیت کا

مطلب بالکل خبط ہو جاتا ہے۔ ترجمہ میں آپ کو اختیار ہے کہ آپ محذوف کو کھولیں یا نہ کھولیں لیکن جس کی ترکیب غلط سمجھ رہے ہیں اس کا ترجمہ کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے۔

۶۔ یوم تقلب وجوھھم الآیۃ کا ترجمہ بلا کسی قرینہ کے حال کا کیا ہے۔

۷۔ قولوا قولاً سدیداً

اس کا ترجمہ مترجم نے یہ کیا ہے:۔ "قول کو پختہ کرو"

یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ باعتبار نحو بھی۔ باعتبار زبان بھی۔ "پختہ کرو" کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ السداد کے معنی ہیں القصد فی القول والوفق والاصابہ۔ اسی سے ہے سدید اور سداد بمعنی الصواب من القول۔ یقال انہ لیسدّ فی القول ای یصیب السداد یعنی القصد۔ ویقال قل قولاً سدداً وسداداً وسدیداً ای صواباً۔ اعشی کا شعر ہے۔

ماذا علیھا وماذا کان ینقصھا ... یوم الترحل لو قالت لنا سددا

اس کا کیا نقصان تھا اور کیا بگڑ جاتا اگر کوچ کے دن ہم سے سیدھی بات کہتی۔

۸۔ انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان الآیۃ

اس میں لفظ حمل کی تحقیق ارشاد ہوتی ہے۔

"حمل کے معنی یہ بھی ہیں کہ انھوں نے اس کے حکم "اٹھادینے" سے یعنی "نہ ماننے" سے انکار کیا کہ بھلا آپ کا حکم ہو اور ہم اٹھائیں؟ یعنی ہٹا دیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا مگر اس صاحب اختیار نے ذمہ لیکر حکم اٹھا دیا یعنی عدول حکمی کردی اور ظالم و جاہل بنا۔"

"حمل" کے معنی حکم اٹھا دینا یعنی نہ ماننا عربی لغت میں کہیں موجود نہیں ہے۔ بلکہ حکم اٹھا دینا بمعنی حکم ہٹا دینے کے شاید پنجاب کی بولی میں آتے ہوں تو آتے ہوں ورنہ اردو میں بھی کوئی اچھا محاورہ

نہیں ہے۔ مگر چونکہ اڈیٹر الاصلاح اردو کا اسکالر نہیں ہے اس لئے اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ البتہ عربی کے متعلق پوری ذمہ داری کے ساتھ دعوی کرتا ہے کہ حمل کے یہ معنی ہرگز نہیں آتے اور اس پر تمام عرب و عجم سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہے۔

ہاں ابو اسحاق زجاج رحمہ اللہ نے اس آیت کی تاویل میں ندرت پیدا کرنے کے لئے حمل کے معنی لغت کے بالکل خلاف گڑھے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہی بات مصنف تفسیر بیان للناس کے دماغ میں پہنچکر کچھ اور مسخ ہو گئی ہو اس نے حمل الامانۃ کے معنی خان الامانۃ کے لئے ہیں لیکن وہ اپنی اس رائے میں بالکل منفرد ہے۔ اہل لغت و ارباب تاویل میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں۔ ابو منصور کہتے ہیں وما علمت احدا شرح من تفسیر ھذہ الایۃ ما شرحہ ابو اسحاق۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا کہ اس نے اس آیت کی وہ تاویل کی ہو جو ابو اسحاق نے کی ہے۔ خواجہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے زجاج کی غلطی کو زندہ کیا اور وہ بھی کچھ اور مسخ کر کے۔

زجاج نے حمل الامانۃ کے جو معنی بتائے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہیں۔ کلام عرب کا پورا دفتر اس کے خلاف شہادت ہے۔ اس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو چیز پیش کی جا سکتی ہے یہ شعر ہے۔

اذا انت لم تبرح تودی امانۃ   وتحمل اخری افرحتک الودائع

لیکن اس شعر کے قائل کا پتہ نہیں اور مجہول النسب شعر سے استناد بالخصوص قرآن کے معاملہ میں ارباب تاویل کے اصول کے خلاف ہے۔ پھر اس شعر سے بھی کسی طرح زجاج کے دعوی کی تائید نہیں ہوتی۔ زجاج کے نقطۂ نظر سے شعر کے معنی یہ ہیں۔

"جبکہ تو برابر ایک امانت ادا کر یگا اور دوسری دبا بیٹھیگا تو آہستہ آہستہ غیر ادا شدہ امانتوں کا بوجھ تجھکو دبا لیگا"

حالانکہ یہ ترجمہ کرنے میں لغت سے انحراف کے باوجود شعر میں کوئی خوبی نہیں پیدا ہوتی شعر کا صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے۔

جبکہ یہ بھی ایک امانت قبول کرتا ہے اور دوسری قبول کرتا ہے تو یہ امانتیں تجھکو خوش کرینگی کیونکہ اس طرح تیرے

دونوں کا وزن کیا آسان ہے اپنی پیٹ پھیر کر ... کر تار ہتا ہوں

پس ہمارے نزدیک زجاج کا قول غلط ہے۔ قرآن کی تاویل ہمیشہ معروف معنی کے اعتبار سے کرنی چاہیے۔ غریب اور شاذ معنی بھی نہ لینے چاہئیں چہ جائیکہ ایسے معنی جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔

ہم نے تفسیر بیان للناس کے صرف اتنے حصہ پر نظر ڈالی ہے جو فروری ۱۹۳۹ء کے بلاغ میں شائع ہوئی ہے اور غلطیاں صرف وہ بتائی ہیں جو نحو اور ادب کی موٹی موٹی غلطیاں ہیں اور ترجمہ سے تعلق ہیں۔ باریک غلطیاں اس لئے چھوڑ دی ہیں کہ عام اردو داں طبقہ جو عربی زبان کی نزاکتوں سے بیخبر ہے ان سے محظوظ نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں تفسیر و تاویل کی غلطیوں سے بالکل اغماض کیا ہے کیونکہ اس اعتبار سے شاید ہی اس تفسیر کی کوئی بات صحیح ہو۔ سرتا سر حدیث خرافہ ہے اور الاصلاح کے صفحات خرافات کی تردید کیلئے نہیں ہیں۔

ہم نے ان غلطیوں کو بھی چھوڑ دیا ہے جو مصنف کے غلط پسند دماغ نے دوسرے مترجمین و مفسرین کی مسامحات کی عامیانہ تقلید سے جمع کر لی ہیں حالانکہ وہ بھی بہر حال غلطیاں ہیں اور محض اس لئے صحیح نہیں ہوجائیں گی کہ خواجہ صاحب کے علاوہ لوگ بھی ان کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ورنہ "فی قلوبھم مرض" "لا یجاورونک فیھا الا قلیلا" "بغیر ما اکتسبوا" وغیرہ اور بعض دوسری آیات کے ترجمے بھی قابل توجہ تھے۔

تحقیق قربانی والا مضمون، دفتر میں تلاش کرایا مگر ملا نہیں۔ بلاغ کے دفتر کو خط لکھا ہے۔ اگر مل گیا تو انشاء اللہ آئندہ نمبر میں اس کے عجائب بھی پیش کروں گا۔ افسوس ہے کہ الاصلاح کی اشاعت

کی بالکل آخری تاریخیں آگئی ہیں اور صفحات بالکل رک گئے، نیز طبیعت اچھی نہیں ہے اس لئے زیادہ تدقیق سے نگاہ نہ ڈال سکا ورنہ خواجہ صاحب تو ہر آیت کے ترجمہ میں اپنی قابلیت کے اتنے دلائل فراہم کر دیتے ہیں کہ آدمی ایک ایک آیت کے اسرار و معارف کی تلاش میں صبح کر دے سکتا ہے۔ اخیر میں اس جماعت کے جدید ائمہ سے التماس ہے کہ وہ خالدین فیھا کی تفسیر، تفسیر بیان للناس میں ضرور پڑھ لیں۔ ہم کو تو پڑھکر وہ مصرع یاد آگیا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اڈیٹر بلاغ کو فارسی شعروں کے پڑھنے کا شوق ہے۔ خواجہ حافظ کا ایک شعر انکی نذر ہے۔

شرح مجموعہ گل مرغ سحری داند
کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

دائرہ حمیدیہ کی ایجنسی

لاہور میں

لاہور میں دائرہ حمیدیہ کی تمام اردو مطبوعات اور الاصلاح کی ایجنسی قائم ہو گئی ہے۔ وہاں سے مندرجہ ذیل کتابیں اپنی اصلی قیمت پر ملیں گی جو لوگ مزید مصارف کے متحمل نہیں ہو سکتے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

تفسیر سورہ فیل	۸/	تفسیر سورہ اخلاص	۵/
تفسیر سورہ کوثر	۸/	تفسیر سورہ کافرون	۴/
تفسیر سورہ لہب	۶/	الاصلاح فی پرچہ	۶/

ملنے کا پتہ:- محمد عمر خان نیو سٹوڈنٹ کالج بک اسٹال چوک نیلا گنبد انارکلی کچہری روڈ لاہور۔

مقالات

عربوں اور ترکوں کے اختلاط پر ایک تاریخی نظر

از مولوی عبداللطیف صاحب اعظمی

عربوں اور ترکوں میں اسلام سے قبل کسی قسم کا تعلق نہیں تھا اور نہ کوئی شخص یہ تصور کر سکتا تھا کہ جزیرۂ عرب اور وسط ایشیا کی دو بالکل مختلف النسل اور مختلف المقام قوموں میں کبھی وہ ربط پیدا ہو جائے گا، جو ظہورِ اسلام کے بعد ترکوں اور عربوں میں پیدا ہوا۔

ترک عربوں سے اخلاق، آداب، معاشرت اور زبان وغیرہ میں بالکل مختلف تھے۔ ترکی زبان نہ صرف یہ کہ عربی الفاظ سے بالکل خالی تھی بلکہ ترکیبوں اور اسلوبوں میں بھی عربی سے اسقدر بیگانہ تھی کہ نہ ترک عربی سمجھ سکتے تھے نہ عرب ترکی۔

جب عرب اسلام کو لیکر جزیرۂ عرب سے نکلے تو ایک مختصر مدت میں معمورۂ ارض کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے ترک ممالک کو فتح کیا۔ ماوراء النہر کو عبور کر کے بخارا، سمرقند، فرغانہ اور اشروسنہ وغیرہ پر اسلامی پرچم لہرایا۔ ان مفتوحہ ممالک میں قبائلی زندگی کا رواج تھا۔ امرا یا ملوک کو یہ خاقان یا اخشید کہتے تھے۔ مفتوحہ قوم تمامتر بتوں اور سورجوں کو پوجتی تھی، عربوں نے ان میں ایک جدید تمدن اور نئی معاشرت کی طرح ڈالی۔ ان میں بڑے بڑے اشخاص پیدا ہوئے، جنھوں نے صدیوں تک نہایت شاندار حکومت کی۔

ترکوں کے لحاظ سے عربوں کے عہد حکومت کو دو دوروں ہی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) دور خدمت یعنی ابتدائے اسلام میں ترکوں کا عربوں کی فوج میں داخل ہونا اور ان کی خدمت کرنا (۲) ترکوں کی سیادت عربوں پر۔

عہد اسلام میں عربوں کی سیادت آزادی اور بہادری عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جو کچھ کمی تھی، شیرازہ بندی کی تھی قبول اسلام کے بعد یہ کمی پوری ہوگئی۔ اسلام نے انھیں ایک علم کے نیچے جمع کر دیا اور اونٹوں کی مہاروں کے بجائے، عالم کی زمام قیادت ان کے ہاتھ میں دیدی۔ چنانچہ وہ پہلی صدی ہجری ہی کے اندر اندر، دنیا کے طول و عرض میں چھا گئے۔ اکثر و بیشتر مقامات پر انھیں کی تہذیب تھی اور انھیں کا تمدن۔

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں ثابت کیا ہے کہ حکومت کے قیام اور بقا کے لئے عصبیت ضروری ہے۔ جب تک قوم میں عصبیت ہوتی ہے، وہ ترقی کے منازل طے کرتی ہے۔ جہاں اس کی عصبیت میں ضعف پیدا ہوا، حکومت پر زوال طاری ہوجاتا ہے۔ عربوں کی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو ابن خلدون کا نظریہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا ہے۔ عربوں کی شاندار حکومت کے زوال کا سب سے بڑا سبب عربی عصبیت کا ضعف ہے۔

تاریخ کے طالب علم سے یہ راز مخفی نہیں کہ دولت عباسیہ کے قیام میں سب سے بڑا ہاتھ عجمیوں کا تھا۔ انھیں کی مدد سے اموی خلافت کو مٹا کر، عباسی حکومت قائم کی گئی تھی۔ یہ عجمی عنصر ابتدا میں پشت پناہی کرتا تھا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اس میں عجمیت کی اسپرٹ ابھر آئی۔ اور اس نے عربوں کی سیادت کے جوئے کو اتارنے کی کوشش شروع کی۔ شعوبیہ کی تحریک اس سلسلہ کی ایک مشہور کڑی ہے۔

عربی سیادت کے خلاف، ایرانیوں کی جدوجہد سب سے نمایاں تھی۔ وہ خسرو پرویز اور انوشروان کے شاندار عہد کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہی حال روم کا تھا، مغرب اور مصر بھی آزادی کے خواہاں تھے۔ لیکن عربوں کی سیادت کا خاتمہ اس وقت ہوا، جب امین اور مامون میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور قدرت نے مامون کے

ہی میں فیصلہ دیا۔ امین اور مامون کی جنگ درحقیقت دو بھائیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ عربی اور عجمی عصبیت کی جنگ تھی۔ مامون کی کامیابی کے بعد عربوں کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور خلفا کی حکومت کا دار و مدار محض عجمیوں پر باقی رہ گیا خصوصاً ترکوں پر۔

ترکوں کی ملازمت اسلامی فوج میں | ترکوں اور عربوں کے درمیان سب سے پہلے ولید اول کے عہد میں تعلقات پیدا ہوئے۔ جسے بنو امیہ کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں خوارزم، بخارا، سمرقند، شاش، فرغانہ، خجند، کاشان اور کاشغر قتیبہ بن مسلم کی قیادت میں فتح ہوئے تھے اور وہاں عربوں کی حکومت قائم ہوئی تھی لیکن اس وقت تک ترکوں اور عربوں میں صرف فاتح اور مفتوح یا حاکم اور محکوم کا تعلق تھا، اسلامی فوج اور پھر دربارِ خلافت میں انھیں جب عباسیوں کے ایام زوال میں بار حاصل ہوا اور ان کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھا کہ اصل حاکم یہی ہو گئے خلیفہ کا نام صرف خطبوں میں باقی رہ گیا۔

سب سے پہلے منصور نے ان کی بہادری اور جنگی قابلیت کی وجہ سے انھیں فوج میں داخل کیا لیکن اس زمانہ میں انھیں کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ خراسانیوں اور عربوں کا غلبہ تھا۔ وہی حکومت پر چھائے ہوئے تھے لیکن جب رشید کے عہد میں ایرانیوں اور عربوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ امین کی خلافت کے کے بعد عربوں کی سطوت جاتی رہی اور حکومت پر ایرانی حاوی ہو گئے اور انھوں نے انتہائی ظلم و تعدی سے کام لیا نیز جدید تمدن نے بھی مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کے فتح و غلبہ کی قوت جاتی رہی تو مامون کے بھائی معتصم کو ایام ولیعہدی ہی میں اس کی فکر ہوئی ....

.. امین کے قتل سے ایرانیوں سے اعتماد جاتا رہا تھا۔ عربوں پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، ان کی عصبیت، جو ان کی زندگی اور بقا کی ضامن تھی ختم ہو چکی تھی، وہ جدید حضارت اور عیش و نشاط کے شکار ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی صولت و شوکت قطعاً ختم ہو چکی تھی، ایسی صورت میں اسے ترکوں کے سوا کہیں جائے پناہ نظر نہ آئی۔ وہ ابھی تہذیب و تمدن سے ناواقف تھے، عیش و نشاط کی لذتوں سے

بد تھے۔ ان میں بہادری بھی تھی، شجاعت بھی، مرنا اور مارنا جانتے تھے۔ چنانچہ اس نے سمرقند، اشروسنہ اور فرغانہ کے بہترین نوجوانوں کی ایک فوج تیار کی اور ان کے لئے سامرا میں چھاؤنی بنوائی۔ اس فوج کی وردی دوسر فوجوں سے ممتاز تھی، ان کی تربیت پر خاص توجہ مبذول کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ترک اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کی جہالت اور پراگندگی جاتی رہی۔ اب ان میں زندگی تھی، شیرازہ بندی تھی، تہذیب تمدن تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حکومت پر چھا گئے۔ بابک خرمی کے فتنوں کے فرو ہونے اور عموریہ کی فتح کے بعد ان کے اثر و نفوذ کی تکمیل ہو گئی اور خلافت کلی طور پر ترکوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ معتصم کے محبوب ترکی سرداروں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس "نو خیز" درخت سے کس قسم کے پھل آنے والے ہیں۔

معتصم کے بعد واثق تخت خلافت پر بیٹھا۔ یہ بجائے اس کے کہ ترکوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور اثر و نفوذ کو روکتا، انجام سے بے خبر ہو کر اپنے باپ کی پالیسی پر آنکھ بند کر کے عمل کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی عنصر اس قدر قوت پکڑ گیا کہ وہ جو چاہتے کرتے، جس کو چاہتے خلیفہ بناتے اور جس کو چاہتے ذلت کے ساتھ معزول کر دیتے۔

متوکل نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد ترکوں کے غلبہ کو کم کرنے کی کوشش کی، اس نے سوچا کہ جس طرح ہارون رشید نے عجمیوں کی قوت اور اثر و نفوذ کو کچلنے کے لیے برامکہ کو تباہ و برباد کیا تھا، اسی طرح جب تک انھیں کچلا نہ جائے گا، خلافت ان کے ہاتھ سے نکلنی مشکل ہے۔ چنانچہ اس نے ترکی سردار ایتاخ کو جو خلافت کے سیاہ و سپید کا مالک تھا حج کے لئے بھیجا اور واپسی میں اسے قتل کروا دیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جب تک خلافت کا مرکز سامرا رہے گا، ترکوں کے اثر سے حکومت محفوظ نہیں رکھی جا سکتی اس لئے ۲۴۳ھ میں دمشق کو دار الخلافہ بنایا۔ ترک اس پر راضی ہونے والے کب تھے۔ انھوں نے خلیفہ کو مجبور کیا کہ خلافت کا مرکز سامرا ہی رہے۔ ترکوں نے جب دیکھا کہ متوکل کی خلافت میں ان کی آرزوئیں ہم کنار تکمیل نہیں ہو سکتیں تو انھوں نے خلیفہ ہی کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد منتصر خلیفہ ہوا، مگر کہتے ہیں کہ باپ کے قتل کا اس قدر افسوس تھا کہ چھ مہینے زیادہ زندہ

زندہ رہا۔ اس کے بعد ۲۴۸ھ میں مستعین باللہ تخت خلافت پر بیٹھا اور اس کے بعد ۲۵۱ھ میں معتز باللہ۔

عباسی خلفا کی بے بسی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ معتز جب خلیفہ ہوا تو اس نے نجومیوں کو بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ خلیفہ کب تک زندہ رہے گا اور اس کی خلافت کب تک قائم رہے گی؟ مجلس میں بعض ستم ظریف بھی موجود تھے انھوں نے کہا: "ہم خلیفہ کی عمر اور مدت خلافت سے خوب واقف ہیں۔" لوگوں نے کہا تو انھوں نے جواب دیا "ترک جب تک چاہیں۔" اس جواب پر پورا ایوان قہقہہ سے گونج اٹھا۔ اسی زمانہ کے ایک عربی شاعر نے خوب کہا ہے۔

خليفة في قفص بين وصيف وبغا
يقول ما قالا له كما تقول الببغا

ترکوں نے انتہائی دردناک طریقہ پر جس خلیفہ کو قتل کیا، وہ معتز ہے۔ اسے حرم سرا سے اس بیدردی کے ساتھ گھسیٹ کر لائے کہ اس کی قمیص تار تار ہو گئی تھی اور شانے بری طرح زخمی ہو گئے تھے، ننگے پیر ٹھیک دوپہر کے وقت تمتماتے ہوئے پتھر کے فرش پر کھڑا کر دیا، وہ جلن سے بار بار ایک پیر اٹھاتا تھا اور دوسرا رکھتا تھا۔ اسی کو کافی نہیں کیا بلکہ قید خانہ میں بند کر دیا۔ تین دن کے بعد بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ترکوں کے یہ مظالم اس وقت تک باقی رہے، جب تک ان کی اپنی حکومت نہ قائم ہوئی اور عربوں کی "خدمت" اور حکومت کے بجائے عرب اور غیر عرب کی سیادت ان کے ہاتھ میں نہ آئی۔

ترکوں کی سیادت عہد دولت میں | ترکوں کی سیادت کا آغاز چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور امارتوں سے ہوا جو دولت عباسیہ کے ضعف کی وجہ سے مختلف مقامات پر قائم ہو گئی تھیں۔ مثلاً طولونیہ، ایلکیہ، اخشیدیہ، غزنویہ وغیرہ۔ بعض نے بعد میں مستو شہنشاہیہ حکومت کی صورت اختیار کر لی۔ مثلاً دولت سلجوقیہ۔ اس کا آغاز پانچویں صدی ہجری کی ابتدا سے ہوتا ہے اور ساتویں صدی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ فارس، ترکستان، ایشیائے کوچک، شام اور عراق اس کے زیر نگین تھے۔ اس کے بعد مصر اور شام میں غلام سلاطین کی حکومت قائم ہوئی اور آخر میں دولت عثمانیہ نے قدم جمائے۔

جس کے قیام کے ساتھ تاریخ اسلام ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس لئے کہ اس وقت عالم اسلام کی حالت البتہ خستہ تھی مغلوں کے پے بہ پے حملوں نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا، مسلمانوں نے قسطنطنیہ کی تسخیر کے لئے متعدد حملے کئے مگر سب ناکام رہے۔ عثمانی ترکوں نے قدم جماتے ہی قسطنطنیہ کو فتح کیا، یورپ میں گھسے اور ہنگری تک اسلامی حکومت قائم کردی، ہسٹریا کے دار الحکومت وائنا کا محاصرہ کیا، اور اس سے وقتاً فوقتاً جزیہ وصول کیا اور سواحل اسپین تک بحر ابیض پر قبضہ کیا۔ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھکر یورپ کی حکومتیں لرزہ براندام تھیں مشرق میں عراق تک اور جنوب و مغرب میں شام و مصر تک ترکوں کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ عباسیوں کی رہی سہی قوت بھی ختم ہوگئی اور انھوں نے نوجوان ترکوں کے لئے جگہ خالی کردی۔

عثمانی حکومت کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ سلطان سلیمان کے عہد میں (۹۲۶ھ سے ۹۷۴ھ تک) بوڈاپسٹ[۱] سے لیکر اسوان[۲] تک اور فرات سے لیکر آبنائے جبل طارق تک اسلامی پرچم لہراتا تھا، پورا مغربی عالم اسلامی دولت عثمانیہ کے علم کے نیچے جمع ہوگیا تھا، اور جدید ترکی کے قیام تک جمع رہا۔ خلافت اور سلطنت کے اجتماع کو اس قدر طویل زندگی حاصل ہوئی کہ اس قدر کسی اسلامی حکومت کو حاصل نہ ہوسکی، حتیٰ کہ عباسی حکومت بھی اپنے غیر معمولی طول عمر کے باوجود اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ صحیح معنی میں وہ صرف تین صدی تک قائم رہی، اس کے بعد محض نام کی تھی۔ حکومت عثمانیہ پہلی اسلامی سلطنت ہے، جس نے سلطنت اور خلافت دونوں کے فرائض ایک ساتھ انجام دیئے اور تمام مسلمانوں نے اسے تسلیم کیا۔

اس زمانہ میں عربی عصبیت تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ اندلس میں تھوڑی بہت باقی تھی، مصر میں فاطمی حکومت کے زیر سایہ کچھ فروغ ہوا تھا کہ کردوں اور اس کے بعد ترکوں نے اسے کچل دیا۔ اس کے بعد کچھ ایسا خاتمہ ہوا کہ آج تک اسے فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ عربی ممالک میں بعض سیاسی اور دینی اسباب کی بناء پر اس قسم کی بعض تحریکیں اٹھیں مثلاً نجد میں وہابی تحریک اور سوڈان میں درا ویش کی تحریک، لیکن وہ

---

[۱] ملوتیہ میں واقع ہے [۲] نیل پر واقع ہے۔

ذاتی حالات کے تحت پیدا ہوئی تھیں۔ اس لئے بہت جلد ختم ہو گئیں۔ محمد علی پاشا خدیو مصر نے انیسویں صدی کے اوائل میں ایک بہت بڑی اسلامی حکومت قائم کرنی چاہی۔ اس مقصد کے لئے اسلامی عصبیت کی ضرورت تھی۔ اس وقت ترک اور عرب دو بڑی مضبوط اور بااثر صاحب عصبیت قومیں تھیں، ترکوں کی عصبیت ان قوموں کے ساتھ تھی۔ اس لئے اس نے عربوں کی ہمدردی حاصل کی اور ان کی عصبیت پر حکومت کی بنیاد ڈالی … شریف مکہ … دوسرے روس، فرانس کی حمایت کی وجہ سے یہ تحریک بہت ترقی کر گئی اور عربی عصبیت کو ایک مرتبہ پھر نشو و نما پانے اور ابھرنے کا موقع ملا۔ مذہبی مدارس، مطابع اور اخبارات نے اسے خوب پھیلایا لیکن اس تحریک کا بھی جو حشر ہوا اس سے تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی واقف ہے۔

گو ترک عربوں سے کلی طور پر نجات پا چکے تھے۔ اب ان کی اپنی حکومت تھی، لیکن اجانب[1] کی تہذیب اجانب کی معاشرت اور اجانب کی سیادت ابھی تک قائم تھی، خصوصاً عربوں کو اسلام کی وجہ سے بہت زیادہ عزت اور برتری حاصل ہو گئی تھی۔ …. ان کا اقتدار نہ صرف عوام بلکہ خواص …. پر بھی مسلط تھا۔ وہ اس ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنی چاہتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ان کی زبان کو جو رسوخ حاصل ہو گیا تھا اسے کم کیا جائے۔ سلجوقی عہد سے سرکاری زبان فارسی اور علمی زبان عربی چلی آتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ دفتروں سے غیر ملکی زبانوں کو خارج کیا اور علمی اور مذہبی کتابیں تمام تر ترکی میں لکھی جانے لگیں یہ تغیر عثمانی عہد کے اوائل میں ہوا۔ دوسرا قدم "تحریک اتحاد تورانی" کی شکل میں اٹھایا گیا۔ یہ تحریک مشہور ادیب فوق آلب ضیا کی سرکردگی میں سالونیکا سے شروع ہوئی گو اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ٹھیٹھ ترکی زبان کو رواج دیا جائے اور غیر زبانوں کے کل الفاظ کو خارج کیا جائے جس طرح آج کل اردو کو آسان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسمیں

---

[1] یہاں اجانب کا لفظ ترکوں کی ذہنیت کے لحاظ سے لکھا گیا ہے۔ وہ غیر ترکی مسلمانوں کی تہذیب، معاشرت اور زبان سے ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے جو کوئی قوم ایک اجنبی قوم کے ساتھ کرتی ہے۔

وہ جذبہ بھی کار فرما تھا جو عربوں سے قطع تعلق اور ان کی ذہنی غلامی سے آزادی کیلئے ہر ترک کے دل میں پیدا ہوگیا تھا۔

اس سلسلہ میں تیسرا اور آخری قدم ۱۹۲۸ء میں اٹھایا گیا یعنی ترکوں کی کانگریس نے عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی حروف کو اختیار کرلیا۔ اس انقلاب کی بڑی وجہ یہ تھی کہ

"عربی اور ایرانی تہذیب کے غلبے سے آزاد ہونے کی یہی ایک صورت تھی۔"[۵]

گو یہ آخری قدم تھا اور "ذہنی محکومی و غلامی" کا جو ہوا ترکوں کو پریشان کئے ہوئے تھا، اس سے نجات مل چکی تھی لیکن اس کی تکمیل کمال اتاترک کے ہاتھوں ہوئی۔ اس میں ترکی عصبیت تعصب سے بدل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ہر چند ہم نے ترکی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کردیا ہے، ہر چند رسم الخط ترک کردیا گیا لیکن روزانہ کم از کم پانچ مرتبہ ہم ایک ..... ایسی زبان کے پڑھنے پر مجبور ہیں جو عربوں سے تعلق رکھتی ہے، اور اگر پڑھنا نہ چاہیں تو سننا تو پڑتا ہے۔ دن کو ممکن ہے، کاروبار کے ہنگامے میں نجات مل جائے، مگر صبح کے سناٹے میں جو صدا کانوں تک پہنچتی ہے، وہ اذان ہے جو عربی میں ہے۔ اس لئے اس نے "مکمل سوراج" کے لئے قرآن کو بھی ترکی میں بدلا۔ اذان بھی عربی میں باقی نہیں رہی۔ بعض مقامات کے نام بھی بدل دیئے گئے ہیں مثلاً انگورا سے انقرہ سمرنا سے ازمیر (Izmir) وغیرہ۔ ترکوں نے اپنی کامیابی کے بعد، عربوں سے قطع تعلق کی انتہائی صورت جو ہوسکتی تھی، وہ اختیار کی۔

ترکوں نے جو کچھ کیا محض "وطنیت" کے نشہ میں سرشار ہوکر۔ اس عجیب جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس پر مطلق غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس جنگ اور تفرقہ سے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔ مگر جب کبھی یہ نشہ کچھ کم ہوا ہے تو انھوں نے بار بار اس سوال پر بھی غور کیا ہے۔ کاش مسلمانوں کے یہ اختلافات کسی طرح ختم ہو جاتے تاکہ یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ عربوں اور ترکوں میں اتحاد کی بعض کوششیں کی گئیں۔ خالدہ ادیب خانم نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ

---

[۵] ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش صفحہ ۲۰۵

"جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ عثمانی سلطنت جتنی اب رہ گئی ہے، اس کا قائم رہنا بھی دشوار ہے، وہ اگرچہ بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی تھی تو صرف اسی صورت میں کہ ترکوں اور عربوں میں اتحاد ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں میں قومیت کی تحریک سر بسنت کر چکی تھی، مگر کہا جاتا ہے کہ انور پاشا نے، جو خود عربی نسل سے تھے، یہ تجویز پیش کی تھی کہ عربوں اور ترکوں کی متحدہ شاہی حکومت قائم کی جائے، اور اس کا دار السلطنت حلب کو قرار دیا جائے۔" (ترکی میں تہذیب و مذہب کی کشمکش ص ۹۰)

مگر مریض کی حالت نازک ہو چکی تھی، اب کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

حکمتِ غرب

مارکس اریلیس کے خیالات

(۳)

از جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے

یاد رکھئے کہ تمام باتیں صرف رائے ہیں۔ مونیمس کلبی (Montmis the Cynve) کا یہ مقولہ بالکل واضح ہے۔ اتنا ہی واضح ہے جتنا کہ مفید، بشرطیکہ ہم اس کے تمسخرانہ جملہ کو اسی حد تک قبول کریں جہاں تک اس کی تصدیق کیجا سکتی ہے۔

انسان کی روح بہت سے طریقوں سے مسخ ہو سکتی ہے لیکن اس کی بدترین پستی اس کا ایک قسم کی غیر طبعی شے بن جانا ہے۔ گویا تمھارے جسم میں ایک پھوڑی نکل آئی ہے۔ اس صورت میں وہ دنیا میں ایک سبزۂ بیگانہ کی مانند ہے۔ کیونکہ کسی افتاد پر سسکنا اور کوفت کرنا ایک ایسے ناسور میں مبتلا ہونا ہے جو اُس ہمہ گیر فطرت سے بالکل بے میل ہے، جس کے ہر جزو میں تمام دوسری فطرتیں شامل ہیں۔

علاوہ ازیں روح اس وقت بھی مسخ ہو جاتی ہے جب کسی کے خلاف اس میں نفرت یا ضرر رسانی کے لئے مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی روحیں ان لوگوں کی ہوتی ہیں جن پر غصہ کا جن سوار ہوتا ہے۔

تیسری صورت روح کے مسخ ہونے کی یہ ہے کہ وہ لذت یا الم کی نذر ہو جائے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ روح ۔۔ یا مکر اور قول و عمل میں یکسر کاذب بن جائے

پانچویں صورت یہ ہے کہ روح اپنی قوت یا تحریک طبعی کے رخ کو کسی مخصوص مقصد کی طرف متوجہ نہ کرے۔ اس کا عمل غیر منضبط اور وہ خود اپنے فعل سے بے خبر ہو۔ کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی روح کا فرض ہے کہ وہ مقصد پر نظر رکھے ہر اس شے کا مقصد جس میں زندگی اور عقل پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ وہ عقل کے ان قوانین سے ہم آہنگ رہے جو قدیم ترین نظام سیاسی یعنی فطرت میں پائے جاتے ہیں۔

حیات انسانی کا پیمانہ ایک ساعت ہے۔ یہ ایک مادہ ہے جس کا مد و جزر دوامی ہے۔ یہ ایک حس فانی ہے جو مبہم، ناصاف اور صرف ایک سایہ ہے۔ انسان کے جسم کا کالبد نجاست پذیر ہے۔ روح تلاش و تحقیق سے بالاتر ہے۔ قسمت ایک تیز رو چرخی ہے، شہرت صرف ایک فیصلہ ہے جس کی بنیاد فقدان عقل پر ہے۔ قصہ مختصر جن چیزوں کا تعلق جسم سے ہے انھیں پانی کی طرح قرار نہیں اور جن چیزوں کا تعلق روح سے ہے وہ خواب اور ابخرات ہیں۔ زندگی بذات خود ایک جنگ ہے یا اجنبی ملک میں ایک منزل۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہماری رہنمائی اور محافظت کون کرے گا؟ اس کا جواب صرف ایک ہے "فلسفہ"۔ صحیح اور سچا فلسفہ۔ صحیح اور سچا فلسفہ یہ ہے کہ ہم اپنے اندرونی اور یزدانی وصف پر کاربند ہوں، اس کی پاکی و حرمت برقرار رکھیں، اس کو عیش و نشاط اور کرب و اضطراب کی دسترس سے بالاتر رکھیں

ہمارے کسی عمل میں اتفاق و امکان کا شائبہ نہ ہونا چاہئے۔ ہمارا ہر عمل کذب سے پاک اور مکر سے بالاتر ہونا چاہئے۔ ہمیں اس کی مطلق پرواہ نہ ہونی چاہئے کہ کوئی کیا کرتا ہے اور کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ہم کو ہر انقلاب اور ہر مصلحت الٰہی یوں قبول کرنی چاہئے گویا یہ چیزیں اپنے ہی مولد سے نازل ہو رہی ہیں ہم کو موت کا انتظار ہمہ وقت مسرت کے ساتھ کرنا چاہئے اور ہمارا یہ یقین ہونا چاہئے کہ موت صرف ان عناصر کا منتشر اور پریشان ہو جانا ہے جن پر ہماری زندگی مشتمل ہے۔ اگر عناصر تباہ نہیں ہوتے بلکہ وہ صرف با

تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو ہمیں تبدیلی اور تباہی سے کیوں خوف زدہ ہونا چاہئے۔ یہ بات فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہے، اور کوئی بری چیز فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی ؛

باب دوم

صرف یہ یاد رکھنا کافی نہیں ہے کہ ہر نیا دن ہماری زندگی کا ایک حصہ گھس کر ختم کر دیتا ہے اور مجموعۂ حیات میں اتنی کمی ہو جاتی ہے۔ بلکہ ہم کو اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ اگر ہمارا رشتہ حیات عرصہ دراز تک قائم بھی رہے تو بھی یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ ہمارا دماغ اپنی قوت مدرکہ اور بالخصوص اس قوت تخیلی کو برقرار رکھ سکے گا جو انسانی اور یزدانی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ فرض کیجئے ضعیفی نے ایک شخص کو دور انحطاط کی آخری منزل پر پہنچا دیا ہے، لیکن ابھی تار نفس جسم سے جدا نہیں ہوا ہے۔ قوت بقا، قوت تخیل، قوت تحریک طبعی اس سے رخصت نہیں ہوئی ہے، تاہم یہ بات تو ہے کہ اپنے تئیں بروئے کار لانے، اپنے فرائض کی جملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے، ظاہری صورت و حالات کا تجزیہ کرنے، اہم مسائل بالخصوص یہ طے کرنے کے لئے کہ آیا زندگی کو خیر باد کہنے کے لئے وقت آگیا ہے یا نہیں، اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے لئے جو تربیت یافتہ ذہانت کی گہری توجہ کے محتاج ہیں، اس کی قوت ذہنی عرصہ دراز سے فنا ہو چکی ہے۔ پس ہم کو کمر ہمت باندھنی چاہئے صرف اس وجہ سے نہیں کہ ہر نفس کے ساتھ ہم موت سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ہماری ذہنی اور استدلالی قوتوں کا خاتمہ قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فطرت کی ضمنی کارفرمائیوں میں بھی ایک مخصوص پر کشش دلفریبی ہے مثلاً تنور میں روٹی پکاتے وقت روٹی کے چھلکے سے کچھ باریک ٹکڑے گر جاتے ہیں جس سے جگہ جگہ ایک قسم کا

فضا پیدا ہوتی ہے جو ہر چند اصول فن کے منافی ہے لیکن با ایں ہمہ اس میں ایک عجیب دلکشی ہوتی ہے اور طرفہ یہ کہ یہی خلا اشتہا کی حس کو اکساتے ہیں۔ بعینہ یہی بات انجیر میں پائی جاتی ہے جب وہ بالکل پک کر بیچ سے پھٹنے لگتی ہے۔ بالکل یہی قصہ زیتون کا ہوتا ہے، جب وہ پک جاتا ہے اور اس کے گرنے کا زمانہ قریب آجاتا ہے تو اس میں ایک پراسرار خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔

ٹھیک یہی چیز ہم اناج کی بالیوں میں دیکھتے ہیں جب وہ مادر زمین کی طرف سرنگوں ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ شیر کی گھنی بالوں والی آنکھوں کی پلکیں اور جنگلی سور کے جھاگ فشاں جبڑے بھی یہی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کی بے شمار چیزیں ہیں جو بجائے خود حسن و خوبصورتی سے بعید سمجھی جاتی ہیں لیکن چونکہ وہ قدرت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے وہ فطرت کے لئے زینت بخش اور دیکھنے والوں کے لئے فرحت بخش ہیں۔ پس وہ شخص جو فطرت کی کیفیات کو محسوس اور ان پر بہ نظر امعان غور کر سکتا ہے اس کو معلوم ہوگا کہ فطرت کی کائنات بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس کا وجود باعث مسرت ہو۔ ایسا شخص زندہ شیر دل کے کھلے ہوئے جبڑوں کی تعریف و تحسین شیر قالین یا شیر برمریں کے جبڑوں سے کم نہیں کریگا۔ ایسے شخص کو پیرانہ سالی کی جھریوں میں حسن نظر آئے گا قطع نظر اس سے کہ اس حسن کا حامل مرد ہے یا عورت۔ وہ اپنے پرشباب غلاموں کے حسن کو پاکیزہ اور خالی از جذبات نگاہوں سے دیکھیگا۔ اسکی نگاہیں ایسی بہت سی چیزوں پر پڑیں گی جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ یہ ساری چیزیں تو صرف اسکو نظر آئیں گی جو فطرت اور اس کی کارفرمائیوں سے وابستہ اور ہم آہنگ ہے۔

ادبیات

رسالت اور خاصان رسالت

از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل اعظم گڑھی

اللہ رے وہ لغزشیں زندانِ کائنات — چھوٹیں تو ہم ہی جائیں اسیرانِ کائنات
اس آب و گل نے ٹکلے بھی بدلے ہزار رنگ — چھوٹا نہ دست شوق سے دامانِ کائنات
نکلی نہ آج تک ہوس دل کی آرزو — کافی ہوئی نہ وسعتِ دامانِ کائنات
کیونکر نہ چشم شوق ہو حیرانِ کائنات — اک میں ہوں اور حسن فراوانِ کائنات
یہ مہر و ماہ یہ گل و نسریں یہ برق و باد — بہروپ لئے ہیں سب سر و سامانِ کائنات
ہاں کھول دے دریچۂ خلوت سرائے دل — گر دیکھنا ہے جلوۂ پنہانِ کائنات
کی اپنی بازیافت تو سب کھل گیا طلسم — ڈھونڈھا کیا عبث سر و پایانِ کائنات
میں دیکھتا ہوں اب رگ فطرت کی جنبشیں — اللہ رے کیف بادۂ عرفانِ کائنات
اے مشت خاک دل تری ہمت کے میں نثار — تنکا ہے اور مبارزِ طوفانِ کائنات
جوش جنون شوق کا اللہ رے حوصلہ — کرنے چلا ہوں چاک گریبانِ کائنات
فیض ازل سے سیکھ کے مشاطگی کا فن — سلجھا رہا ہوں زلف پریشانِ کائنات
سنتی ہے ذرہ ذرہ سے اک داستاں مجھے — میں ہی تو ہوں جہاں میں بانئِ کائنات
خود نقش کا وجود ہے نقاش کی دلیل — ہو چشم دل تو کم نہیں برہانِ کائنات
جلوہ نقاب میں ہو حقیقت حجاب میں — یہ کشمکش ہے سلسلہ جنبانِ کائنات

دیکھے تو کوئی خامۂ فطرت کی شوخیاں
آدم کو دی حراستِ بستانِ کائنات

اک نقطۂ وادیٔ قدم و دو جہاں پہ حکمراں
اک ذرہ اور صاحبِ فرمانِ کائنات

آدم کا یہ فروغ ہے اس نور کا طفیل
روشن ہے جس کے دم سے شبستانِ کائنات

وہ تاجدارِ دہر وہ ارمانِ کائنات
وہ جانِ کائنات وہ جانانِ کائنات

وہ نونِ کلکِ صنعتِ فطرت کا شاہکار
مقصودِ کون و شمسۂ ایوانِ کائنات

مخلوق اور کمالِ الٰہی کا آئینہ
بندہ مگر وسیلۂ امکانِ کائنات

وہ جس کا نور باعثِ تکوینِ آب و گل
وہ جس کا نام زینتِ عنوانِ کائنات

جس کا قدوم بزمِ عناصر کا آب و رنگ
جس کا ظہور مطلعِ دیوانِ کائنات

وہ جس کا نطق وحیِ الٰہی کا ترجمان
وہ جس کا دین ناسخِ ادیانِ کائنات

وہ جس کی ذاتِ پاک سے ہستی کو ارتقا
وہ جس کے دم قدم سے بڑھی شان کائنات

وہ جس کی خاکِ پا سے مہر و مہ کو فروغ
وہ جس کے جانشین ہیں ارکانِ کائنات

گلزارِ دینِ پاک کا پہلا وہ آبیار
جانِ بہار جانِ چمن جانِ کائنات

وہ صادق و مصدّق و صدیقِ مصطفیٰ
بوبکر وہ گزیدۂ اعیانِ کائنات

ارکانِ شرع جس کی خلافت سے استوار
مرصوص جس کے فیض سے بنیانِ کائنات

وہ جس کا رتبہ سب سے فزوں انبیا کے بعد
ایماں ہے جس کا افضلِ ایمانِ کائنات

وہ جس کا سینہ مہرِ رسالت کا آئینہ
وہ جس کا چہرہ شمعِ فروزانِ کائنات

کافر نہیں کہ اس کی امامت میں شک کریں
خود جس کے مقتدی ہوئے سلطانِ کائنات

پھر ان کے بعد ملکِ خلافت کا تاجدار
وہ بوریا نشیں شہِ شاہانِ کائنات

وہ منبعِ حرارتِ ایماں وہ نورِ حق
فاروق یعنی مہرِ درخشانِ کائنات

جس کا جمال فتح مہمات کی کلید　　جس کی نگاہ جنبش مژگان کائنات
جس کو خدا سے مانگ کے پایا رسول نے　　یعنی عمر وہ خاصہ خاصان کائنات
تھا جس کے مشوروں پہ رسالت کو اعتماد　　وہ چارہ ساز خلق وہ درمان کائنات
وہ جس کی رائے وحی الٰہی کے فیض سے　　پیغام مرگ بادہ پرستان کائنات
وہ جس کا عدل مشعل ارباب سلطنت　　وہ جس کا عہد وجہ چراغان کائنات
ایراں میں بھی سنائی دیا شور الجبل　　حاجب ہوئے نہ کوہ و بیابان کائنات

ان دو کے بعد تاج خلافت کا مستحق　　وہ شمع اصطفا وہ امان کائنات
جس کے حیا و حلم پہ حیران ملائکہ　　وہ صدر بزم صدر نشینان کائنات
ختن نبی وہ صاحب نورین وہ غنی　　سیراب جس کے فیض سے پاکان کائنات
جس کی چمک سے تاج خلافت کو رفعتیں　　وہ آب دار گوہر عمان کائنات
فخر امم محیط کرم آفتاب فیض　　کشور کشائے مصر وہ خاقان کائنات
حسن صبیح مہبط انوار لم یزل .....　　قد بلند سرو خیابان کائنات
طاقت کے ساتھ صبر و تحمل کا یہ کمال　　کھاتے ہیں اس پہ رشک شہیدان کائنات

ان سب کے بعد اوج امامت کا آفتاب　　وہ بوتراب چارم ارکان کائنات
زوج بتول سید عالم کا ابن عم　　مرحب شکار شیر نیستان کائنات
وہ قاسم فیوض در علم مصطفےٰ　　معمور جس کا نغموں سے ایوان کائنات
روشن ہے جس کے فیض سے دنیا قلوب کی　　سر تا قدم وہ سر چراغان کائنات
وہ جس کی شمع خانہ جگر گوشۂ رسول　　وہ جس کے لال سنبل و ریحان کائنات

خاصان حق کے صدقے میں بخشا گیا نہیں
وہ کس محز بضاعت دکان کائنات

تلخیصات

قرآن کی قولی وعملی تفسیر

ایک انسان کے مافی الضمیر کی تشریح دوسرے کی زبان سے کتنا مشکل کام ہے، پھر جب کسی انسانی قول کی تشریح میں اتنی اشکال ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کی تشریح اس کے بندوں کی زبان وقلم سے جتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ قرآن پاک کی کوئی تفسیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی کیونکہ شارح کے لئے ضروری ہے، کہ وہ ماتن سے زیادہ علم رکھتا ہو، ورنہ کم سے کم اس کے برابر تو ہو اور اس کا تصور بھی کسی بندہ میں قرآن اور صاحب قرآن کی نسبت سے نہیں کیا جا سکتا۔

شارح اور مفسر کا کام یہ ہے کہ ماتن کے اختصار کی تفصیل اور اجمال کی توضیح کرے، اس کے کلام بے دلیل کی دلیل دے، اس کی بات پر کوئی شبہ یا اعتراض پیدا ہو تو اس کو دور کرے، اس کے لفظوں کی گرہ کھولے، ترکیبوں کی پیچیدگی کو صاف، اور مطلب کی دشواریوں کو حل کرے، قولوں میں کہیں تضاد نظر آئے تو ان میں تطبیق دے اور اس کے ایک قول سے دوسرے قول کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

یہ اور اسی قسم کے اور طریقے ہیں، جن سے انسانوں کے کلام کو سمجھتے اور ان کی دشواریوں کو حل کرتے ہیں، لیکن قرآن پاک کی تفسیر میں ان طریقوں کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی ہیں جو قرآن ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

قرآن خدا کا کلام ہے، جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کرکے ملک عرب میں، فصیح وبلیغ عربی زبان میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا، اس میں نظریئے بھی تھے، اور عملی تعلیمات بھی، اس نے ان نظریوں کو خدا کے بندوں کو سمجھایا اور ان عملی تعلیمات کو عملاً کرکے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا، اور بتایا

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے، واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دے دیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورہ کافرون

اس میں ہجرت اور برات کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔

کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴ر

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶ر

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

مینیجر

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے، اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہوں گے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلاقیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں چھاپ کر شایع کیا

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ یوں تو ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱۔ ۵۰

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے کتابت و طباعت جاذب نظر کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۲ صفحے قیمت: ۸۔ ۰

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللھب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بد دعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہِ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے کتابت و طباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۶۔

منیجر

جلد ۳ | ماہ محرم الحرام ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۸ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

شذرات

ادھر بعض اخبارات ورسائل میں، مولانا حسین احمد صاحب کے ایک فقرہ کی بدولت "قوم اور ملت" کے مسئلہ پر ایک لغوی اور مذہبی وسیاسی مباحثہ شروع ہوگیا ہے۔ ناظرین نے شاید اس سلسلہ کے بعض مباحث پڑھے ہوں۔ حال میں اس پر علامہ اقبال کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا ہے جو اس ذیل کا تازہ ترین فقہی شاہکار ہے اور قابل مطالعہ:

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ "اسلام بحیثیت ایک ہیئت اجتماعیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں"، ان کے اس فتویٰ کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہماری ہیئت اجتماعیہ کے اصول اتنے بے لچک ہیں تو پھر ہندوستان میں مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں کے نیچے سے اٹھانے کی کیا شکل اختیار کی جائے؟ جو لوگ اس پامالی کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے وجہ افتخار سمجھتے ہیں ان سے تو بحث نہیں مگر علامہ اقبال کو بتانا چاہئے کہ ہندوستان میں ہماری خلافت راشدہ کیسے قائم ہو؟ انگریزوں کی خوشامد کا تجربہ تو بہت ہو چکا۔ سرسید اور بک اور ماریسن کی روحیں ہم سے خوش ہوں گی کہ ہم نے کم از کم ہندوستان میں ان کے مشوروں کی قدر خدا اور رسول کے حکموں سے زیادہ کی۔ اب غالباً علامہ اقبال اس کا مشورہ تو نہ دیں گے۔ لیکن اگر انگریزوں سے جہاد کیا جائے تو ہندوستان کے ۲۲ کروڑ ہندوؤں سے کیا معاملہ کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ اس خلافت راشدہ کے قیام کے جتنے دشمن انگریز ہیں اس سے زیادہ ہندو، پھر کیا ان دونوں سے ایک ساتھ غزوہ شروع کر دیا جائے؟ اگر یہ مصلحت کے خلاف ہے تو ہندوؤں کے ساتھ کس بنیاد پر معاملہ کیا جائے؟ علامہ اقبال کو سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کا یہی پہلو متعین کرنا تھا۔ مگر انھوں نے سارا زور فرنگی نظریۂ وطنیت کی تردید میں صرف کر دیا اور اس بحث سے

منائے گئے، حالانکہ اگر وہ ہمکو کوئی ایسا راستہ بتا دیں جس سے ہم بغیر کچلے اور جھکے ہوئے دلی کے تخت تک پہنچ جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے نہ استعمال کریں، خواہ مخواہ کو اس دروازہ سے داخل ہوں جس میں جھک کر جانا پڑے۔ وہ ہمیں بس ایک ہی بات بتا کر ہمارے سب بڑے قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے ہادی اور منجی بھی بن جائیں۔ ع ولیس علی اللہ بمستنکر ٭ ان یجمع العالم فی واحد

وہ لوگ بھی عجیب مخلوق ہیں جو یا تو دمشق کا تخت لیں گے یا پھر ہندوستان کی ذلیل غلامی۔ انگریز کی محکومی میں ہر آزاد منش بھی نگل جائیں مگر جب کہا جاتا ہے کہ سیاسی و معاشی معاملات میں ہندوؤں سے اتحاد کیجئے تو مچھر کو بھی چھاننے کی کوشش کرینگے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ کے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا، اور مثال میں ابولہب ابوجہل کیساتھ اسلام کے طرز عمل پیش کرتے ہیں لیکن شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ اسی زمانہ میں ایک دفعہ صلح حدیبیہ کا بھی پیش آیا تھا۔ مدینہ کے یہودیوں سے آپنے جو معاہدہ کیا وہ بھی معلوم ہے پھر غیر مسلموں کی تمام جماعتوں کے ساتھ اسلام کا معاملہ یکساں نہیں۔ اہل عرب کیلئے صرف اسلام یا تلوار کی راہ تھی۔ اور یہود و نصاریٰ مجوس یا ستارہ پرستوں کے ساتھ شاید بربریوں کیساتھ بھی اس سے بالکل مختلف معاملہ ہوا۔ پھر بعض جماعتوں کے ساتھ ان سے بھی مختلف شکل اختیار کی گئی۔ مثلاً نصاریٰ بنی تغلب جزیہ دینے میں ہتک محسوس کرتے تھے اسلئے وہ چھوڑ کر رومیوں کے پاس چلے گئے، حضرت عمرؓ سے عرض کیا گیا کہ یہ بڑے بہادر ہیں دشمن ان سے آپکے خلاف فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جزیہ دینے میں یہ ہتک سمجھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے انکو واپس بلوا لیا اور جزیہ کے بجائے ان پر صدقہ عائد کر دیا۔ البتہ مقدار میں مسلمانوں کے لحاظ سے زیادہ۔ حالانکہ اس بارے میں اسلام کی تعلیمات بالکل بے لچک ہیں اور معلوم و مشہور۔

حبشہ کے معاملہ میں اور جو سلوک واقعہ مسلمانوں نے جو نجاشی کی وہ بھی اس ذیل میں لحاظ کے قابل ہے۔

بعض لوگ سینہ پر صلیب کا نشان (نکٹائی) لگانے میں بھی شاید کوئی عار نہ سمجھیں لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مجالس کی بعض چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتوں پر ایسا مولویانہ تشدد کا اظہار کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور اسکو اپنی دانست میں بڑی دینداری سمجھتے ہیں، حالانکہ فاروق اعظمؓ جنکا دینی معاملات میں تشدد ضرب المثل ہے، وہ بھی اتنے متشدد نہ تھے۔ شام کا واقعہ شاید سب کو معلوم ہو کہ آپ نکلے تو اذرعات کے باشندے اپنے دستور کے مطابق گاتے بجاتے اور کھیلتے کودتے استقبال کو نکلے۔ آپنے ابو عبیدہؓ سے کہا انکو روک دو۔ ابو عبیدہؓ نے عرض کیا، یہ ان کا دستور ہے۔ اگر آپ انکو روک دینگے تو یہ نفس معاہدہ کے متعلق بدگمان ہو جائیں گے، آپنے فرمایا تب کچھ حرج نہیں چھوڑ دو۔

یہ اس وقت ممکن تھا جب تمام مصالح و موانع بآسانی معلوم کئے جا سکتے تھے اور کوئی دقت نہ تھی کہ اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کے ضوابط لیکن ابھی نئے نئے نکلنے کی تھی۔ تاہم ایسے پیدا ہو گئیں کہ علماء نے انکو جمع کرکے اصول و فروع مستنبط کئے جو ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ دنیا اس سے متعرض کا موقع نہیں۔ حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید وغیرہ دین ان نئی سے بے خبر نہ تھے اور اسلامی طور پر جہاد جلال کا ان کی نظروں میں بہت زیادہ بسا ہوا تھا۔ تاہم جب سکھوں کے خلاف ان لوگوں نے جہاد کیا تو منشا یہ تھا کہ ہمارا مقصد انکا ملک لینا نہیں ہے ہم دینی معاملات میں مسلمانوں کیلئے آزادی چاہتے ہیں۔ یقیناً انکی اس بات نے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو نہ فقط بگاڑ دیا بلکہ بہت زیادہ جھکا دیا لیکن وہ جانتے تھے کہ حالات اس سے زیادہ کیلئے سازگار نہیں ہیں۔ اگر انھیں آرام کرسی پر بیٹھ کر فلسفہ بگھارنا ہوتا تو وہ بھی کہتے جو علامہ اقبال نے فرمایا لیکن انھیں تو انگریز وغیرہ سے عہدہ برآ ہونا تھا اور مشکلات کو عملاً حل کرنا تھا جو اس آدمی میں ایسی موڑ بہت سے آتے ہیں جہاں آدمی کو پیادہ ہونا پڑتا ہے۔

مولانا حسین احمد بھی ان ہی لوگوں میں ہیں۔ وہ صرف زندگی کے جمالیاتی پہلو کو دیکھنے والے شاعر نہیں ہیں، بلکہ مجاہد مذہبیہ اور سیاسی ہیں اور چاہتے ہیں کہ موجودہ مشکلات کے اندر مسلمانوں کو جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھا دیں۔ اگر مغلوں اور عباسیوں کا دور نہیں تو کم از کم مسلمان ملک میں ایک باعزت اور زندہ قوم کی زندگی تو بسر کریں۔ یقیناً یہ تخیل خلافت راشدہ کے تخیل سے بہت کم ہے مگر اس غلامی کی دلدل سے بدرجہا بہتر ہے جس میں ہم آج لوٹ رہے ہیں۔ نئی جدوجہد کم از کم اس کیلئے ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو اور سیاسی و معاشی معاملات میں دوسرے اہل ملک کیساتھ مساوات۔ اور اگر یہ مسلمانوں کا اصلی تخیل تو وہ علی انشاء اللہ مٹے گا نہیں، علامہ اقبال کی شاعری دونوں کو گرماتی رہیگی اور کیا عجب کہ اس نسل کے نکمّے ہونے کے بعد اس کے عملی احیاء کیلئے بھی کوئی راہ پیدا ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

علامہ اقبال کو اندیشہ ہے کہ تحریک وطنیت کے تصور سے اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جائیگی اور مسلمان ملحد و بے دین ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ ان کے پاس ایسے دلائل موجود ہوں جن سے ان اندیشوں کی تصدیق ہوتی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ "وحدت اسلامی" کی "کمر" ہے کہاں جسے کسی بادِ مخالف کا وہ شعر دیکھ رہے ہیں۔ اسلامی دنیا ایک طویل زمانے سے "کل بلاد خلیفہ و منبر" کی مصداق ہے۔ ادھر کچھ دن ہوئے ہیں سلطان عبدالحمید نے ایک صدا اٹھائی تھی لیکن اولاً تو وہ صدا بصحرا تھی ثانیاً کلمۃ حق ارید بہا الباطل کا ایک مخفی فریب اور علامہ اقبال غالباً اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس رشتہ کے توڑنے میں ہم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ مغربی قوموں کی سازش سے ٹوٹا یا خود بخود، بہرحال ٹوٹ چکا۔ اب وہ صرف ایک لذیذ

یادگار کی حیثیت سے رہ گیا ہے اور اس کے ثمرات و نتائج بالکل مفقود ہیں۔ اگر آج بھی اعتصام کے تصور میں کچھ زور ہوتا تو ہم اپنی مشکلات میں اسی سے مدد لیتے لیکن جب یہ چیز آج موجود نہیں ہے تو ہم کیا کریں؟ اور افسوس ہے کہ جس طرح ہم کو اس کے توڑنے میں دخل نہیں اسی طرح موجودہ حالات کے اندر اس کے جوڑنے میں بھی کچھ دخل نہیں ہو سکتا، پس اس کے لئے ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ یوسف گم گشتہ واپس آ جائے۔ مگر نہیں کر سکتے کہ اس کے نعم البدل کیلئے اپنے تمام ذہن صرف کر دیں۔ اگر یہ محض عقیدہ کی قسم کی کوئی چیز ہوتی تو اسکو عقیدہ کی حیثیت سے محفوظ رکھتے۔ مگر یہ تو ایک سیاسی و اجتماعی مصلحت تھی جو افسوس ہے کہ آج مفقود ہو گئی ہے۔

پھر علامہ اقبال کا یہ خیال بھی ہم کو صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ قومی و وطنی عصبیت اسلامی وحدت کے منافی ہے۔ اسلامی وحدت قومی و وطنی عصبیتوں کو مٹاتی نہیں بلکہ انکو قائم رکھ کے انکو باہمدگر جوڑتی ہے۔ قوموں اور جماعتوں کی اپنی اپنی عصبیات ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہیں اور انکا مٹانا تقریباً ناممکن ہے۔ اسلام کا ابتدائی دور جو دینی رنگ کے استیلا کا بہترین دور تھا۔ اسمیں بھی یہ امتیازات معدوم نہیں ہوئے تھے مگر دینی وحدت کا نظام بنیان مرصوص کی طرح قائم رہا۔ اصل یہ ہے کہ اسلام نسل، وطن، قوم کسی چیز کا دشمن نہیں، صرف انکی تنگ نظریوں اور تعدیوں کا دشمن ہے۔ اسلام ایک دین فطرت ہے، وہ ایک فطری چیز کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ وہ ضرور چاہتا ہے کہ انسان کبھی ان رشتوں کو ایک زیادہ وسیع رشتے پر جو دین و ایمان و اسلام کا رشتہ ہے۔ اگر نسلی اور وطنی عصبیت کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو حضور "الائمۃ من قریش" نہ فرماتے۔ دیکھا کہ قوم کی نسلی و وطنی عصبیت ایک اصل راسخ ہے اسلئے تعاضد و تناصر کا سنگ بنیاد دینی سیاسی و اجتماعی نظام کا پہلا حجر اساس اسی پر قائم ہوتا ہے پھر دینی وحدت کا رشتہ اسکو دوسری قوموں اور جماعتوں سے جوڑتا ہے۔ اگر مسلمانوں میں یہ رشتہ ڈھیلا نہ پڑتا اور ملوکیت کا رنگ طبائع پر غالب نہ ہو گیا ہوتا تو اسلامی تاریخ کی بہت سی طوائف الملوکیاں نہ برپا ہوتیں اور مسلمانوں کا اجتماعی رشتہ نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ ایک عصبیت تمام دنیا کی عصبیتوں کی حکمران بننے کی خواہشمند ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد شیرازہ میں پراگندگی آ گئی، عرب و عجم اور ترک و عرب کی خانہ جنگیاں برپا ہو گئیں اور قومیں اس وحدت کے خیال سے ایسا کھٹکنے لگیں کہ انکو اس کے فوائد کا سمجھنا مشکل ہو گیا۔

یورپ میں مسیحی اتحاد صلیبی جنگوں کے زمانہ میں موجود تھا مگر وہ کس طرح ٹوٹا؟ رومن ایمپائر نے اسی اتحاد کو آڑ بنا کر تمام یورپ کو رومن عصبیت کا محکوم رکھنا چاہا اور دوسری عصبیتوں کا پنپنا اس نے برداشت نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوموں نے اس عذاب سے چھوٹنے کیلئے الگ الگ قومیتوں کو جگایا اور مسیحی اتحاد کے پرزے اڑا دیئے۔ حالانکہ اگر دوسری عصبیتوں کو انگیز کر کے اور ان کو شہ دیکر رشتہ اتحاد قائم کیا جاتا تو یہ افراتفری نہ پیدا ہوتی۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکوں کی مختلف ممالک اسلامیہ سے پسپائی بھی تنہا مغربی قوموں کی سازش ہی سے نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک حد تک انکی گرفت بالکل ڈھیلی ہو چکی تھی۔ ثانیاً شام، عرب، اور مصر وغیرہ پر انکا استیلا اسلامی وحدت کا استیلا نہ تھا ترکی عصبیت کا استیلا تھا اور دوسری

عصبیتوں کو دوسری عصبیتوں کا استیلا ہونے سے بچانا ہو تو یہ بالکل جائز ہے۔ اگر ترکوں نے ان عصبیتوں کو خود الگ الگ رہنے کا موقع دیا ہوتا تو پھر ان میں اسلامی وحدت کی بنیاد قائم کرتے تو وہ پین اسلام ازم کی صحیح شکل ہوتی بہرحال اسلامی وحدت، نسلی قومیت و وطنیت کے منافی نہیں بلکہ اسکو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کیلئے اسکے سوا کوئی شکل ہی نہیں کہ قوموں کی انفرادیت کو باقی رکھکے رشتہ قائم کیا جائے۔

پس اگر ہمارے سیاسی مسائل مقامی ہیں کہ ہم سیاسی معاشی معاملات میں ہندوؤں سے وطنی و قومی بنیادوں پر مصالحت کرلیں تو اس سے ہمارے اسلامی رشتہ وحدت میں کیا شکست ہو جائیگی۔ یہ ہماری انفرادیت کا پہلو ہے جسکو ہماری اسلامی وحدت سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ اس لئے ہمارا دامن اس سے خالی ہے۔

اس تصور سے الحاد کا جو اندیشہ علامہ اقبال نے ظاہر کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ علامہ اقبال ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ یورپ میں الحاد کے پھیلنے کی تاریخ کیونکر ہے اور اس کے اسباب دوسرے کیا ہیں؟ اصل یہ ہے کہ مسیحیت کو وہاں نے جس رنگ میں رنگ دیا تھا وہ رنگ عقلیت کی آنچ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کنیسہ کے عقائد و معاملات مضحکہ انگیز تھے پھر اس نے اقتدار کی ہوس میں علم و تحقیق اور علم و سیاست کے ہر گوشہ کو تاریک رکھنے کی کوشش کی اور اس کیلئے خونریز اور خوفناک جرائم کا ارتکاب کیا اور جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے علامہ اقبال کی طرح اس نے بھی قوموں اور جماعتوں کو انکا جائز حق دینے سے انکار کیا۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں مذہب ختم ہو گیا۔ اب اگر آپ لوگ بھی اور اسلامی نقاہت کے یہی مظاہرے کرینگے کہ مسلمانوں کو سمجھائیں گے کہ تم کسی سے مل نہیں سکتے اور پھر ان کو غلامی کی ذلت سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ بتائیں گے تو قدرتی طور پر یہاں بھی یہ ہوگا اور اس قبیل کے لوگ پیدا ہوں گے جو دین کو ایک مصیبت سمجھکر اسکی بیڑیاں توڑ دینا چاہیں گے اور افسوس ہے کہ اس کے آثار شروع ہو گئے ہیں اور آثار کا سوال کیا ہے؟ اور وطنیت کے تصور کی کیا ضرورت ہے؟ اگر آپ حضرات کی مدد سے انگریزی حکومت کا زمانہ کچھ ممتد ہوا تو اس تصور کے بغیر آپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم مسلمانوں کی روح کو مسخ کر دیگی۔

تعجب ہے کہ لوگ یورپ کے الحاد کا الزام اس کے نظریہ وطنیت کو دیتے ہیں حالانکہ وطنیت میں اگر الحاد کا کوئی پہلو ہے تو یہ ہے کہ ایک ملک کی مختلف العقیدہ اور مختلف المذاہب جماعتیں باہم یکجہتی پیدا کرنیکے لئے ایک مشترک نظام زندگی اختیار کرنے پر مائل ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کو اپنی انفرادی، مذہبی و دینی خصوصیات مٹانی پڑتی ہیں۔ لیکن یورپ میں ہم عجیب صورت حال دیکھتے ہیں کہ وہاں

ہر قوم نے وطنیت کے الگ الگ بت بھی تراش لئے تاہم مختلف جماعتوں کا نسلی خون رنگ باقی ہے، جرمنی نے یہودیوں کے ساتھ اپنے ملک میں جو کچھ کیا اور اب اسٹریا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسکی شہادت ہے۔ البتہ مذہب کو دبنا پڑا اور اسکی وجہ وطنیت نہیں بلکہ سائنس اور جدید دہریت اور نظریات کے بالمقابل مسیحیت کی شکست پانی اور اس کے قدیم جرائم ہیں۔ وطنیت کا جنون ترکوں پر بھی سوار ہے اور انھوں نے بھی مذہب کو خیرباد کہدیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مذہب سے اعراض انکی وطنیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے ملک میں مختلف الادیان جماعتوں کا ایسا تشتت و تفرق موجود نہیں تھا جس کو دور کرنے کے لئے وہ مجبور ہوتے کہ مذہب کو خیرباد کہیں، صرف علما کی بیجرئی اور تنگ دلی، اور وہاں کے شیخ الاسلاموں اور دینی پیشواؤں کی بے غیرتی اور ایک عام جمود نے ان کو نفس مذہب سے بدگمان کیا اور پھر وہ ہوا جس پر صرف افسوس کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ اگر ترک ملت اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کے تمام اصول و فروع کو قانون کی حیثیت سے اختیار کریں تو ان کی وطنیت اس میں کیا روک ہوسکتی ہے؟ اور اگر اپنی انفرادی عصبیت کو باقی رکھکر، اسلامی وحدت کے رکن بنیں تو ان کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟

ہندوستان کی نسبت علامہ اقبال نے جو اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ ایک حد تک صحیح ہوسکتا ہے اسلئے کہ یہاں مختلف ملل اور مختلف الادیان جماعتوں کا بہت بڑا اکھاڑا ہے۔ پس ان میں یکجہتی کا تصور خواہ کسی بنیاد پر ہو قدرتی طور پر لادینیت کا رجحان پیدا کرتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ رجحان حدود مذہب تک متعدی ہو۔ لیکن علامہ اقبال اس امر کو بھول جاتے ہیں کہ انھی اندیشوں سے یہاں اس امر کی پوری کوشش ہو رہی ہے کہ مشترک حدود کے اندر صرف دینی معاملات آئیں جنکی علیحدگی ناممکن التصور ہے اور یہ بھی اس لئے کہ آج ہم مجبور ہیں کہ دو برائیوں میں سے اس کو اختیار کریں جو اہون ہے۔ اگر ہم انگریزی راج کو سایۂ خدا سمجھکر بیٹھے رہیں تو ہمارا خاتمہ ہے۔ ہم کو زمانہ کے رجحانات اور اپنی فطری ضروریات کے آگے سپر ڈال دینی پڑے گی۔ ہم فطرت کے مقتضیات کے آگے بند نہیں قائم کرسکتے۔ ہم کو بڑھتے ہوئے سیلاب کو خود راستہ دینا ہوگا ورنہ اگر سیلاب نے خود راستہ بنایا تو تمام دیوار کو پاڑ باڑ کردیگا۔ آج جو لوگ مغربی نظریہ وطنیت کے داعی اور مذہب کے منکر ہیں وہ آنیوالے وقت کا پتہ دے رہے ہیں اور یقیناً ہماری غفلت کی پیداوار ہیں۔ ہم ان کو ان کا واجبی اور شرعی حق نہیں دے رہے ہیں اس لئے انھوں نے ہم سے سب کچھ مانگنا شروع کر دیا ہے لیکن ابھی خیر ہے کہ وہ مانگ رہے ہیں، مبادا کہ وہ وقت آجائے جب وہ چھیننے لگیں۔ وذلک یوم عسیر۔

لیکن ان سب باتوں کو جانے دیجئے۔ علامہ اقبال نے اسلام کا جو نصب العین پیش کیا ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں وہ ہندوستان میں اس نصب العین کے حصول کا عملی پروگرام بتائیں۔ ظاہر ہے کہ ملک کی موجودہ جماعتوں میں سے کوئی جماعت اس کے لئے جد و جہد نہیں کر رہی ہے۔ کانگریس اس سے بعید ہے تو مسلم لیگ اس سے ابعد! علامہ اقبال آگے بڑھیں، راہ کھلی ہے اور ہم کو بتلائیں۔ پھر بدبخت ہے وہ مسلمان جو ہندوؤں کی طرف مڑ کے بھی دیکھے اور کانگریس کا نام بھی لے۔ یہ جو سودا کیا گیا ہے یہ تو ہندوؤں کا سودا ہے۔ غیر مشترک راہ پا لینے کے بعد ان وادیوں میں کون ٹھوکریں کھائیگا؟

اگر علامہ اقبال نے کوئی عملی پروگرام پیش کیا تو الاصلاح کی طرف سے باتباع حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ جواب ہے "گرچہ پیر اک پنڈلیاں کمزور ہیں، اگرچہ اسکی آنکھوں میں آشوب ہے تاہم وہ تادم مرگ ان کے ساتھ ہے"۔

علامہ اقبال نے اپنے اس مضمون میں قرآن کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ امر ہمارے لئے موجب اطمینان ہے۔ لیکن ان کے مضمون کے مختلف حصوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک اہم صورت حالات کو نظر انداز کر رہے ہیں وہ اسلام کی دینی جد و جہد کو حرف بحرف ہمارے اوپر ابھار دینا چاہتے ہیں حالانکہ آنحضرتؐ کی قوم غلام نہ تھی۔ آزاد تھی۔ اگر آپ کی قوم کسی دوسری طاقت کی غلام ہوتی تو آپ کی جد و جہد کی پہلی منزل غالباً یہی ہوتی کہ قوم کو دشمن کی غلامی سے آزاد کریں کیونکہ دین کی صحیح دعوت غلام قوم میں نہیں بار آور ہو سکتی۔ اور آج ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حالات میں کاروبار نبوت کے مراحل و مقامات کیا کیا ہوتے؟ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کو ہم کو یہی سبق ملتا ہے۔ ان کو پہلا حکم یہی ہوا کہ اپنی قوم کو فرعونیوں کے پنجہ سے نکالو۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ موجودہ حالات کے اندر مسلمانوں کی مکمل دینی تنظیم و اصلاح کے متمنی ہیں ہم کو ان کی کامیابی میں شبہ ہے۔ سب سے پہلا حکم توحید اور نماز ہے۔ بس اس نکتہ پر قوم کو مجتمع کر کے قوم کی ساری طاقت کو آزادی کی راہ میں ڈال دینا چاہیے۔ قرآن یہی سبق دیتا ہے۔ اور یہی حق ہے۔ وماذا بعد الحق الا الضلال

یہ چند حرف علامہ اقبال کے مضمون کے اصلی نتائج سے متعلق عرض کئے گئے ہیں۔ انکی تفصیلات سے تعرض کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے "قوم و ملت" کی لغوی تحقیقات پر بھی زور صرف کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس خارزار میں نہ الجھتے۔ یہ انکے ذوق کی چیز نہیں ہے۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ مرسلات

۳

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

انْطَلِقُوا إِلَى مَا كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ (۲۹) انْطَلِقُوا إِلَى ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ (۳۰)
لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ (۳۱) إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲) كَأَنَّهُ
جِمَالَتٌ صُفْرٌ (۳۳) وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۳۴) هَذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ (۳۵)
وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ (۳۶) وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۳۷) هَذَا
يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنَاكُمْ وَالْأَوَّلِينَ (۳۸) فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُونِ (۳۹)
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۴۰)

جس کے تم منکر تھے اس کی طرف چلو، تین طرف پھوٹنے والے سایہ میں چلو جس میں نہ چھاؤں ہے نہ لپٹ بچاؤ گنبدوں کے برابر اس سے چنگاریاں اڑتی ہیں، زرد اونٹوں کی مانند، اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ یہ وہ دن ہوگا کہ ان سے بات نہ نکلے گی، اور نہ اجازت ہوگی کہ معذرت کریں، اس دن منکروں کی خرابی ہے، یہ فیصلہ کا دن ہے، ہم نے تمھیں اور اگلوں کو جمع کیا، پھر اگر تمھارے پاس کوئی چال ہے تو ہم چلو اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۲۹ - ۴۰)

[ظِلٍّ ذِی ثَلٰثِ شُعَبٍ] اس سے دھوئیں کا سایہ ہے۔ آگ کے کسی بڑے الاؤ سے جب دھواں اٹھتا ہے اس میں مختلف شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور وہ بالکل سائبان کی طرح چھا لیتا ہے۔ اسکی تاویل آگے بیان ہو گی۔

[لَا ظَلِیْلٍ] یعنی سایہ کی ٹھنڈک سے بالکل خالی ہوگا۔ وَلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ لیکن اس کی تو توضیح کردی، ایک جگہ فرمایا ہے وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر لفظ ظل (سایہ) سے جو وہم پیدا ہو رہا تھا اس نفی نے اس کا ازالہ کر دیا۔

[اِنَّهَا] یعنی وہ شعلے جو اس سایہ کے پیچھے ہیں

[کَالْقَصْرِ] مشہور قرأت سکون صاد کے ساتھ ہے۔ پس وہ قول ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے کہ اس سے اونٹوں کی گردنیں مراد ہیں اور یہ قَصَرَۃ کی جمع بمعنی اصل العنق ہے۔ اولاً تو بعد کا قافیہ (فاصلہ) اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، ثانیاً قصرۃ گردن کی جڑ کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ انسانی جسم میں ایک مخصوص جگہ کا نام ہے، کسی مستقل عضو کا نام نہیں ہے کہ اس سے شعلوں کو تشبیہ دیجائے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قصرۃ کی جمع ہے قصرۃ بڑے درخت کی جڑ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔ بعد کی تشبیہ اس سے مطابق نہیں ہوتی، پھر یہ دونوں لفظ قرآن کی زبان سے نامانوس ہیں اور کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں جو ان کی توضیح کردے۔ باقی رہا لفظ قصر تو وہ قرآن میں بار بار آیا ہے پس ظاہر تاویل ہی ہمارے نزدیک قابل قبول ہے اور یہی ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور رنگ میں ہے کیونکہ محل بالعموم بلند جگہوں پر تعمیر کئے جاتے ہیں اور دور سے ان کو دیکھو تو ان کا رنگ چمکتا ہوا نظر آئے گا اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف

معلوم ہوگا. یہاں تشبیہ میں محلوں کی بڑائی کا پہلو مد نظر نہیں ہے بلکہ صرف ان کی وہ ہیئت پیش نظر ہے جو دور سے نظر آتی ہے۔ اہل عرب نے اس لفظ کو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں صورتوں میں استعمال کیا ہے اور پیش نظر وہی پہلو ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

واعرضت الیمامة واشمخرت کاسیاف بایدی مصلتینا

اور یمامہ کی بستیاں سامنے سے ایسی ابھری نظر آتی ہیں جیسے تلواریں سونتنے والوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔

اس وجہ سے اونٹنی کو محل اور پل سے اکثر تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ عربی زبان میں اس قدر عام بات ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد جمالة صفر سے جو تشبیہ دی ہے اس سے ہمارے دعوی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

[کانہ جمالة صفر] ضمیر کا مرجع شرر ہے اور یہاں رعایت لفظ کی گئی ہے۔ شرر اسم جنس ہے اس لئے مذکر، مونث، واحد، جمع سب کے لئے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور "جمالة صفر" سے تشبیہ اس کا ثبوت ہے جمالة نر اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو ایک ہی ساتھ نمایاں کر رہی ہے "صفرة" زردی کی قید اس لئے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔

ظل ذی ثلث شعب سے ایک لطیف نکتہ

ظل ذی ثلث شعب، (تین طرف پھوٹنے والا سایہ) جہنم کو اس طرح مصور کر کے پیش کر رہا ہے گویا وہ کسی ہولناک جاندار چیز کی طرح کفار کی طرف لپکی ہوئی چلی آ رہی ہے اور اس کا دھواں تین مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی جہنم کی تصویر کچھ اسی سے

...تمثیل کی گئی ہے۔ مثلاً

وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ — اور جنھوں نے قیامت کا انکار کیا ہم نے ان کے لیے
سَعِيْرًا اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ — دوزخ تیار رکھی ہے جب انکو دور سے دیکھے گی
بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا — تو اس کا جوش سنیں گے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر سورہ ق میں ہے۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ — جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کیا تو بھر گئی
وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ — اور وہ کہے گی کہ کیا اور ہے؟

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى تَدْعُوْا — بے شک وہ لپٹ ہے ادھیڑ دینے والی سر کی کھال کی اور جنھوں نے
مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (معارج) — اعراض کیا اور سرگردانی کی ان کو کھینچ بلائے گی

یہاں تک مطلب سے ظاہری مقصد صرف آگ کے ہیجان و اشتعال کو بتلانا ہے لیکن اگر اس پر غور کیجئے تو غور و نظر کے لئے بھی اس میں کافی وسعت ہے۔

یہ معلوم ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت (۲) مخلوق سے بے پروائی (۳) روز جزا کا انکار۔ ان امور کی تفصیل اپنے موقع سے گذر چکی ہے۔ یہاں زیادہ وسعت کے ساتھ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بعض شواہد کا حوالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک جگہ اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ ان لفظوں میں مذکور ہوا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ، قَالُوْا لَمْ نَكُ — کون چیز تم کو دوزخ میں لائی، کہیں گے ہم نہ
مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ — نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے
الْمِسْكِيْنَ، وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ — جو لوگ بیہودہ بکواس کیا کرتے تھے ان کے ساتھ ہم بھی

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ — بکواس کیا کرتے تھے اور جزا کے دن کا انکار کرتے تھے۔

اس آیت میں خوض سے مراد انکار قرآن ہے اور اس انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ قرآن روز جزا کی خبر دیتا ہے جس کو تسلیم کرنے کے لئے وہ ہرگز آمادہ نہ تھے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ — سو جس نے سخاوت کی اور ڈر چلا اور اچھی بات کو

بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَ — سچ مانا اس پر ہم سہج کر دینگے آرام دینے والی راہ

اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ — جس نے بخالت اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو

بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى — جھٹلایا اس پر سہج کر دینگے مشکل میں ڈالنے والی

ان دونوں آیتوں کے مطالب پر پوری وسعت کے ساتھ غور کرو، ان سے کفار کی یہ تینوں بنیادی خصلتیں پوری طرح نمایاں ہو جائیں گی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہی تین خصلتوں کے مطابق جہنم سے عذاب کی تین شاخیں نمودار ہو کر ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھالیں گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اسی سے لگتی ہوئی تاویل حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے۔

ابو عبداللہ جدلی راوی ہیں کہ "میں بیت المقدس میں آیا، دیکھا کہ عبادہ بن صامت، عبداللہ بن عمر اور کعب احبار بیت المقدس میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ عبادہ نے کہا، جب قیامت کا دن آئے گا، اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرے گا یہاں تک کہ ایک ہی جگہ سے ان کو نگاہ دیکھ سکے گی اور داعی اپنی آواز سنا سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا "آج کے دن ان کے منہ سے بات نہ نکلے گی یہ فیصلہ کا دن ہے، ہم نے تم کو اور تمہارے اگلوں کو جمع کیا ہے، پس اگر آج تمہارے پاس کوئی داؤ ہو تو ذرا ہمارے ساتھ کر دیکھو، آج کوئی متمرد اور سرکش شیطان مجھ سے نجات نہ پا سکے گا"۔ اس کے بعد عبداللہ بن عمر نے کہا کہ کتاب میں ہم پاتے ہیں کہ قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نمودار ہوگی اور جب وہ لوگوں کے سامنے آئے گی تو کہے گی اے لوگو! میں تین قسم کے لوگوں کے پاس

بھی گی ہوں ان کو بیں سے ... زیادہ پہنچی ہوں جتنا باپ اپنے بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو بھی نہ تھا

تی بھولی ہے ان کو جس سے ہم ... اور کوئی چیز چھپ سکتی۔ خدا کا شریک ٹھہرانے والے جبار و سرکش اور

شرو شبہات ... فرمایا۔ پھر ان کو لپیٹ لے گی اور جہنم میں جا کے چالیس سال پہلے ڈال دیگی (اثر بروایت ابن حاتم)

کچھ بیان ہوا ہے کہ یہاں عبد اللہ بن عمرؓ نے جن تین باتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ آیت ذیل سے اخذ کر کے

فرمایا ہے۔

اَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ	ڈال دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش، بھلائی سے روکنے
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ الَّذِي	والے، حد سے بڑھنے والے، شک میں پڑنے والے کو
جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ	جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہرایا ہے
فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ	اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔

اور اگر اس پر تامل کرو تو وہی تین صفتیں تمہارے سامنے آئیں گی جو اوپر ہم نے بیان کی ہیں یعنی نعمت خداوندی سے بے پروائی، آخرت کا انکار، خدا سے غفلت کیونکہ شرک درحقیقت غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔

ان آیات کے نظم اور مواقع ترجیع پر ایک مجموعی نظر

۹۔ اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ یہاں خطاب کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے پردہ کی چیز بالکل نگاہوں کے سامنے آگئی ہے اور ظاہر ہے کہ تاثیر کے اعتبار سے یہ اسلوب نہایت اعلیٰ ہے، اور چونکہ یہ تاثیر کمال درجہ پر پیدا کرنی تھی اس لئے قیامت کی تصویر ایسی کھینچی جو مخاطب کے حواس پر پوری طرح چھا جائے، پھر اسی مناسبت سے ویل کا ذکر فرمایا اور یہاں آیت ویل کے محل نے خود اس مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیا جو یہاں پیش نظر ہے۔ یعنی یہ عذاب، جو اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ان کیلئے بالکل تیار ہے، ان کے لئے نہایت خوفناک خرابیوں کا سبب ہوگا۔

شدت عذاب کے محسوس پہلو کی تصویر کے بعد اس کے اس پہلو کو بے نقاب کیا جس کا احساس ذہن کرے گا۔ یعنی عذر معذرت کی فرصت سے محرومی۔ اور یہ عذاب کی ظاہری ہولناکیوں کے بعد اس کا ایک باطنی تازیانہ ہوگا جو براہ راست دلوں پر لگے گا۔ چنانچہ اس کے بعد آیت ویل کو پھر دہرایا اور موقع کے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہاں اس سے مختلف ہے جو اوپر بیان ہوا۔ یہاں یہ مفہوم ہے کہ اس دن ان کے لئے خرابی اور حسرت و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا، عذر و معذرت کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

ان ترہیبات کے بعد ان کو پھر ایک نئے انداز سے خطاب فرمایا، اس خطاب میں جھڑکی اور اسکات و تذلیل کا پہلو نمایاں ہے۔ اور دنیا میں معاد کا جو وہ انکار کرتے رہے ہیں اس کا بانداز تحقیر جواب ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ — یہی وہ جہنم ہے جس کا تم انکار کرتے تھے،

اَفَسِحْرٌ هٰذَا اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ — یہ جادو ہے یا تمھیں سوجھائی نہیں دیتا،

اس خطاب میں اپنی قدرت کی بے پناہ وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہم نے تمام اگلوں اور پچھلوں کو جمع کر لیا ہے۔ کوئی نہیں جو آج کے دن ہماری پکڑ سے بچ رہا ہو، اس کے بعد پھر ایک خطاب نمودار ہوتا ہے جو غائب کو مخاطب کے سامنے مشہود کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن تمام تدبیریں اکارت ہو جائیں گی کوئی داؤ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح اوپر یہ بیان فرمایا تھا کہ اس دن عذر و معذرت کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی اسی طرح یہاں بیان فرمایا کہ اس دن نہ کوئی چال اور تدبیر کام آئیگی نہ کوئی طاقت و قوت کچھ نفع پہنچائے گی۔ اس میں گویا ایک مخفی تعریض ہوگی کہ دنیا میں ان کو اپنی تدبیروں اور قوتوں پر بڑا ناز تھا، پھر آج ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس مضمون کے بعد آیت ویل پھر نمودار ہوگئی اور یہاں موقع کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس دن ان کا کوئی داؤ کام نہ آئے گا، تمام تدبیریں دہری رہ جائیں گی۔ صرف تباہی اور ذلت و رسوائی نصیب ہوگی۔ یہ چالیس آیتیں تمام ڈراوے کی ہیں ان کے بعد جمع ترغیب و ترہیب کے اس عام اصول کے مطابق، جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں بشارت کی آیتیں آئیں تاکہ سختی اور نرمی کی ایک معتدل حالت پیدا ہو۔ پس فرمایا۔ ان المتقین فی ظلال وعیون الآیۃ (باقی)

ذبیح کون ہے؟

۳

واقعۂ ذبح تورات کے بیان کے مطابق

۴- واقعۂ ذبیح جس طرح یہود کے صحیفوں میں بیان ہوا ہے پہلے ہم اسکو اسی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد ان صحیفوں کی روشنی میں، جو اوپر گذر چکے ہیں، اس پر تنقید کریں گے

کتاب پیدائش کا بائیسواں باب اسی واقعہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے لیکن اس باب کی حکایت سابق باب سے متصل ہے جس میں ابراہیمؑ کے اس مسکن کا ذکر ہے جہاں وہ آباد تھے اور جہاں سے بیٹے کو لیکر قربانی کے لئے نکلے تھے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ وہ بیر سبع میں پھرتے رہے۔ پھر ان کے پاس اس دیار کا بادشاہ آیا اور ان سے اس نے ایک معاہدہ کیا۔ پھر وہ اپنے سابق مستقر فلسطین کی طرف لوٹ گئے۔ واقعہ کے آخر میں اشارۃً ان کے اس مسکن کا ذکر ہوا ہے جہاں سے نکلکر وہ قربانی کے مقام کی طرف گئے۔ ان امور کو اچھی طرح ذہن نشین کرنیکے بعد، اب اصل واقعہ کو پڑھو جو کتاب پیدائش میں بیان ہوا ہے۔

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اس سے کہا اے ابرہام۔ اس نے کہا میں حاضر ہوں (۲) تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے۔ ساتھ لیکر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤنگا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا (۳) تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھکر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لئے لکڑیاں چیریں اور اٹھکر

اس جگہ کو جو خدا نے اسے بتائی تھی روانہ ہوا (۴) تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اس جگہ کو دور سے دیکھا (اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام قربانی تک آنے اور قربانی کرنے کا ذکر ہے یہاں تک کہ خدا نے ان کو پکارا) پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا (۱۳) اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے، تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا (۱۴) اور ابرہام نے اس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا (۱۵) اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ (۱۶) خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ (۱۷) میں تجھے برکت پر برکت دونگا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی (۱۸) اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی (۱۹) تب ابرہام اپنے جوانوں کے پاس لوٹ گیا اور وہ اٹھے اور اکٹھے بیرسبع کو گئے اور ابرہام بیرسبع میں رہا"۔

اس کے بعد عبارت ہے "ان باتوں کے بعد یوں ہوا" لیکن اس میں واقعہ ذبح سے متعلق کوئی بات نہیں ہے اس لئے ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس ہجرت کے متعلق دو اور روایتیں ہیں جو ہم آگے بیان کریں گے۔ اس فصل میں صرف یہ پیش نظر ہے کہ واقعہ کا منصوص حصہ اور وہ امور بیان کر دیئے جائیں جن سے واقعہ کی اصل حقیقت پر بحث ہو سکتی ہے۔ پس ان امور کو خاص طور پر سامنے رکھو۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی سے پہلے اور قربانی کے بعد بیرسبع کو اپنا مسکن بنایا۔

۲۔ سرزمین موریاہ بیرسبع سے تین دن کی مسافت پر ہے۔

۳۔ موریاہ ہی وہ مقام ہے جہاں انھوں نے قربانی کی۔

۴۔ یہ مقام دور سے نظر آتا تھا۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کی۔

۶۔ یہ بیٹا ان کو نہایت محبوب تھا۔

۷۔ مقام قربانی کے قریب جھاڑی تھی۔

۸۔ اکلوتے بیٹے کی قربانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برکت دی۔

۹۔ اور ان کی اولاد کے وسیلہ سے زمین کی تمام قوموں کو برکت دینے کا وعدہ فرمایا۔

۱۰۔ ان کی نسل اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی۔

چونکہ تحریف کرنے والوں کو یہ گمان نہ تھا کہ ان امور کی مدد سے واقعہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو جائے گی اس واسطے انھوں نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بچ رہے۔

عام پڑھنے والوں کو صرف ایک بات یہاں کھٹکے گی کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام تصریح کے ساتھ آگیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات مطلق قابل اعتماد نہیں ہے۔۔۔ ان کا نام یہود نے محض اس غرض سے ڈالدیا ہے کہ یہ بات ان کی خواہشوں کے بالکل مطابق تھی۔ اس کے دلائل بے شمار ہیں، جن میں سے بعض مذکورہ بالا بیان سے مستنبط ہیں اور بعض ان کے صحیفوں کے دوسرے مقامات سے ماخوذ ہیں اور اب ہم ان تمام دلائل کی تفصیل کرتے ہیں۔

پہلی دلیل

۱۔ یہ واضح ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی قربانی کیلئے نکلے ہیں، ان کے ساتھ

حضرت اسحاقؑ نہ تھے۔ صرف حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ وہی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ جن لوگوں نے حضرت اسحاقؑ کا نام یہاں ڈالدیا ہے وہ اس معاملہ کو نہ سمجھ سکے اور یہ چیز خود اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت اسحاقؑ کا نام اس موقع پر بعد کا اضافہ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ واقعہ سے صاف واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹے کی قربانی کے بعد بیر سبع میں واپس آئے اور وہیں قیام کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیر سبع ان کا پہلے سے مسکن تھا۔ چنانچہ سابق باب میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور واقعہ کی اصل حقیقت بھی یہی ہے۔ بیر سبع ہی وہ مقام ہے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ اپنی والدہ کے ساتھ رہے۔ تورات میں جہاں حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو حضرت اسحاقؑ اور ان کی والدہ سے علیحدہ کرنے کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں اس امر کی نہایت واضح تصریح موجود ہے۔ پس اس میں ذرا شک نہیں کہ اس واقعہ میں بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش کردی گئی ہے اور چونکہ یہ جھوٹ تورات کی تصریحات سے بالکل خلاف تھا اس لئے علمائے یہود نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے لیکن اس کشف حقیقت کے باوجود حضرت اسحاقؑ کا نام باقی رہ گیا۔ پس ہم اس جھوٹ کو نظر انداز کرکے ان کے اصلی اعترافات کو پکڑتے ہیں۔ کتاب پیدائش (۲۱: ۱۴) میں ہے

> "تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھکر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کرکے رخصت کر دیا۔ سو چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی" (اس کے بعد پانی کے چک جانے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملنے اور دوبارہ پانی حاصل ہونے کا ذکر ہے اور پھر یہ عبارت ہے) "اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا۔"

اس عبارت میں 'بیابان' اور 'بیر سبع کا بیابان' کے الفاظ...... آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیر سبع کوئی آباد مقام نہ تھا، ایک بیابان تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس میں سات کوئے کھودے

اور حضرت اسماعیل بڑے تھے۔ اس وجہ سے ابتداءً یہی اس کو بیر سبع کہا جانے لگا۔ یہ تسمیہ کا ایک عام اسلوب ہے اور عبرانی میں بکثرت نام مرکب ہیں جیسے اور جنات الفردوس ہم عام طور پر بولتے ہیں۔ پس یہ وجہ کافی ہے کہ بیابان بیر سبع کے علاوہ کوئی مقام ہو جہاں حضرت ابراہیم جاتے تھے۔ اس واقعہ میں اس کے علاوہ جو عجیب باتیں کہی گئی ہیں بر وقت اس سے تعرض کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہم صرف مندرجہ ذیل نتائج نکالنا چاہتے ہیں اور ان کے لئے صرف تورات کافی ہے

۱۔ بیر سبع حضرت اسماعیل اور ان کی ماں کا مسکن تھا۔

۲۔ حضرت اسحاق اور ان کی والدہ کا مسکن اس سے دور تھا۔

۳۔ یہی حضرت ابراہیم بیر سبع میں مقیم ہوا۔ وہ یہیں سے قربانی کے لئے نکلے اور پھر قربانی کے بعد یہیں واپس آئے

حضرت سارہ کا مسکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مسکن سے دور تھا۔ اس کی ایک نہایت واضح دلیل یہ ہے کہ جس وقت حضرت سارہ بیمار ہوئیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے پاس موجود نہ تھے یہاں تک کہ جب انھوں نے ان کی موت کی خبر سنی تو ان کو وہاں سفر کرکے جانا پڑا۔ کتاب پیدائش ۲۳: ۲ میں ہے

"اور سارہ نے قریت اربع میں وفات پائی۔ یہ کنعان میں ہے اور حبرون بھی کہلاتا ہے اور ابراہیم سارہ کے لئے ماتم اور نوحہ کرنے وہاں گیا"

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت ابراہیم جس صبح کو بیٹے کی قربانی کیلئے نکلے انھوں نے حضرت اسمٰعیل کو ساتھ لیا جو بیر سبع میں انکے ساتھ موجود تھے نہ کہ اس بیٹے کو جو ان سے بہت دور حضرت سارہ کے ساتھ کنعان میں تھا۔ یہ بات ہم نے فرض کرکے کہی ہے کہ حضرت اسحاق بھی اسوقت پیدا ہوچکے تھے جیسا کہ علمائے یہود دعویٰ کرتے ہیں ورنہ اصل واقعہ یہ ہے کہ اسوقت تک حضرت اسحاق پیدا نہیں ہوئے تھے۔ انکی ولادت واقعہ ذبح کے بعد ہوئی ہے۔ تفصیلات گیارہویں فصل میں آئیں گی۔

اس واقعہ میں یہ بات خود جھلکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بیٹے کو قربان کیا اس کو قربان گاہ کے پاس ہی چھوڑ دیا نیز یہ بات ان کے اس قول سے بھی واضح ہوتی ہے جو انھوں نے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت سن کر فرمایا۔ انھوں نے فرمایا "کاش اسمٰعیل تیرے حضور زندہ رہے" "تیرے حضور" کی اصطلاح کا مطلب حرف ح فصل ثانی میں سمجھ چکے ہو کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "تیرے گھر کی خدمت میں مشغول رہے" اس بات کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ فرمایا

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ پروردگار تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

یہ بیت اللہ کے جوار میں بسنے والے فرزند کون ہیں؟ یقیناً حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کیونکہ باتفاق فریقین یہ بات معلوم ہے کہ حضرت اسحاقؑ اپنی والدہ کے ساتھ برابر کنعان میں رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اپنے لئے ایک تیسری جگہ منتخب فرمائی جو حضرت اسحاق کے مستقر اور حضرت اسمٰعیل کے مسکن کے بیچ میں تھی تاکہ وقتاً فوقتاً اپنی دونوں اولادوں کو دیکھ بھی سکیں اور بیت اللہ سے بھی قریب رہیں چنانچہ انکی وفات کے وقت ان کے دونوں بیٹے ان کے پاس موجود تھے۔ کتاب پیدائش (۲۵:۹) میں ہے۔

"اور اس کو اس کے دونوں بیٹوں اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ نے دفن کیا"

اسی طرح موضع ذبح سے بھی ہم اپنے دعوی پر استدلال کریں گے اور اس کی تفصیل آٹھویں فصل میں آئے گی۔

دوسری دلیل

۲۔ واقعہ ذبح کی تفصیلات میں پڑھ چکے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اکلوتے بیٹے کی قربانی کا

ظاہر ہوتا ہے اور اس میں ذرا شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اکلوتے حضرت اسمٰعیلؑ ہیں کیونکہ وہ حضرت اسحٰقؑ سے

بہ نسبت بڑے تھے۔ پیدائش (۱۶:۱۶) میں ہے۔

اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔

پیدائش (۲۱:۵) میں ہے

اور جب اس کا بیٹا اسحاق اس سے پیدا ہوا تو ابراہام سو برس کا تھا"

ان سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔

الف۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ یہاں تک کہ حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے۔

ب۔ اس اکلوتے بیٹے کی قربانی انھوں نے حضرت اسحاقؑ کی ولادت سے پہلے کی کیونکہ دوسرے بھائی کے پیدا ہونے کے بعد وہ اکلوتے نہیں رہے

یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر ایسی مستقل دلیلیں ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ یہ امر اس قدر واضح ہے کہ کوئی شخص اس سے اختلاف کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مگر علمائے اہل کتاب نے خواہ مخواہ کو تعصب مارا ہے کہ اس کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسحاق تھے اور حضرت اسمٰعیل بہت دور بھیج دیئے گئے تھے اس لئے اکلوتے حضرت اسحاقؑ ہی رہ گئے۔ گویا ان کے سوا حضرت ابراہیمؑ کے کوئی اولاد تھی ہی نہیں۔ حالانکہ اس جواب میں چند در چند اسقام ہیں۔

الف۔ اوپر پڑھ چکے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دور حضرت اسحاقؑ ہی تھے۔ حضرت اسماعیلؑ تو ہر جگہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ تھے۔

ب۔ حضرت اسحاقؑ پر اکلوتے بیٹے کا اطلاق محض اس بنا پر ہرگز نہیں ہوسکتا کہ یہود کے خیال کے مطابق ان کے بڑے بھائی ان سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دور رہتے۔ کسی شخص کا اکلوتا بیٹا وہی ہوگا جس کے ساتھ کوئی اور بیٹا اس کی محبت میں شریک نہ ہو۔ یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ جسمیں

ذرا بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

ج اگر تھوڑی دیر کے لئے علی سبیل التنزل ان لوگوں کی منطق تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی "اکلوتے" کے لقب کے اصلی مستحق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے باپ کے مسکن سے ان لوگوں کے بیان کے مطابق دور تن تنہا تھے۔

پھر یہاں ایک اور لطف کی بات بھی ہے وہ یہ کہ ان لوگوں نے "ابنک وحیدک" (تیرا اکلوتا بیٹا) بکرک (تیرا پہلوٹھی کا بیٹا) کو تحریف کرکے بنایا ہے۔ یہ تحریف یقیناً کسی فائدہ کے خیال سے کی گئی تھی لیکن اس سے وہ اور خسارہ میں رہے کیونکہ اس طرح وہ ایک دلیل سے بھاگے لیکن دو جتیں ان کے گلے پڑیں اور علاوہ ازیں ایک ایسی حقیقت سامنے آگئی جس کے ظہور کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ حضرت اسمٰعیل حضرت اسحاق کی ولادت سے پہلے قربان کئے گئے ہوں۔ وللہ الحمد۔ گیارہویں فصل میں اسکی مزید تفصیلات آئیں گی۔

تیسری دلیل

اوپر پڑھ چکے ہو کہ جس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم ہوا ہے اس کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ "وہ جو تجھے محبوب ہے"۔ اس سے بھی واضح ہے کہ حضرت اسمٰعیل ہی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صحف یہود میں ایسے دلائل موجود ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل سے زیادہ محبت تھی۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

الف۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کے لئے دعا فرمائی تھی۔ کتاب پیدائش (۱۵: ۲تا۴) میں ہے

"ابرام نے کہا، اے خداوند خدا تو مجھے کیا دیگا؟ کیونکہ میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار دمشقی الیعزر ہے۔ پھر ابرام نے کہا دیکھ تو نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا۔ تب خداوند کا کلام اس پر نازل ہوا اور اس نے فرمایا یہ تیرا وارث نہ ہوگا بلکہ وہ جو

"تیری مصیبت ... پیدا ہوگا وہ ... "

جب اللہ تعالیٰ نے یہ محبوب اولاد ان کو دی تو اس کا نام انھوں نے اسمٰعیل رکھا جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اس کی دعا سن لی۔ کتاب پیدائش (۱۶: ۱۵) میں ہے۔

"اور ابراہیم کے لیے ہاجرہ کے بیٹا ہوا اور ابراہیم نے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ سے پیدا ہوا اسمٰعیل رکھا۔"

ذرا تصور کرو، ایک بااولیت سوز و گداز انسان ہے جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ اس محرومی پر اس کا دل تنگ ہو رہا ہے اور وہ اپنے پروردگار سے اولاد کے لئے پرسوز دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرما کر اولاد کی نعمت سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ اس قبول دعا پر اس کے دل کا ریشہ ریشہ شکر کے جذبہ سے معمور ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کا نام ہی قبول دعا رکھ دیتا ہے اور یہاں تک ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی پرمحبت آغوش سے اسکو الگ نہیں کرتا۔ اکلوتا بیٹا ہے، دونوں کے سہارے بوڑھے باپ کا چشم و چراغ ہے اور ایسی حالت میں کہ آیندہ اولاد کی امید نہیں۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھکر غور کرو کہ محبت و محبوبیت کے اس عالم کا کوئی شخص صحیح اندازہ کر سکتا ہے!!

ب۔ جس وقت حضرت ابراہیم کو حضرت اسحٰق کی ولادت کی بشارت ملی اس وقت بھی انھوں نے ایک ایسی بات فرمائی جس سے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ ان کی بے پایاں محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نعمت گرانمایہ کو پاکر دنیا کی تمام خواہشوں سے بالکل بے پروا ہو گئے تھے کتاب پیدائش (۱۷: ۱۸) میں ہے۔

"اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔"

یہ فقرہ اس وقت فرماتے ہیں جب ان کو ایک دوسرے بیٹے کی ولادت کی بشارت مل رہی ہے۔ اور پھر اس کی زندگی اور برکت کے لئے وسیلہ کیا ڈھونڈھتے ہیں؟ "تیرے حضور جیتا رہے۔" اس فقرہ میں محبت کا جو امرت ہے اس کو کون جان سکتا ہے! جوش محبت کی بیتابیوں کا یہ عالم ہے کہ

اس کو چھپانے پر قادر نہیں۔ خدا کے حضور بھی اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی اس بیٹے کا ذکر فرماتا ہے تو اس تعلق قلب کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ "وہ بیٹا جس سے تجھکو محبت ہے"۔

ج۔ حضرت سارہ نے جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ خواہش کی کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ وراثت میں حصہ نہ پائیں اور یہ کہ انؑ اور ان کی ماں کو نکال دیا جائے، حضرت ابراہیمؑ سخت رنجیدہ ہوئے پیدائش (۲۱: ۱۱) میں ہے۔

"پر ابراہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی"

اس سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کسقدر محبت تھی۔

(باقی)

تفسیر سورۂ فیل (اردو)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعۂ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، مولانا فراہیؒ نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا، مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے ان کی اصل حقیقت آشکارا کر دی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں رمی جمرہ اور دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۱۱۲ صفحے قیمت ۸/

مینجر

مقالات

سیرت شبلی

(۵)

بسلسلہ [illegible] تعلق حصہ نمبر ۱

[illegible] مولوی [illegible]

[illegible] مولانا [illegible] کی وجہ سے ملتوی ہو گیا

[illegible] (ادیٹر)

[illegible] شبلی [illegible] قوم کو سرسید [illegible] ان کی تحریکات پر غور نگاہ ڈالنے اور ہر پہلو سے جانچنے کا کوئی موقع دیا

دنیا کے [illegible] ہیں جتنے بڑے انسان بھی سینما کی متحرک تصویروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی بڑی شخصیت کا رعب آپ پر قائم رہے تو غیر واضح معلومات کے [illegible] دور سے ایک جلوے پر قناعت کیجئے، ورنہ جہاں آپ قریب پہنچے اور علم و بصیرت کی روشنی میں تحقیق حال و خد و خال دیکھنے کی نوبت آگئی وہاں سارا طلسم ٹوٹ جائے گا، اور توہم اور خوش اعتقادی نے جو خوش نما آئینہ خانہ تعمیر کر رکھا تھا اس کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ وادی ادراک کی یہی تلخیاں تو ہیں جن سے بعض اہل نظر بھی گھبراتے ہیں اور دیدہ و دانستہ فردوس بے خبری سے قدم باہر نکالنا نہیں چاہتے۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی ذات گرامی انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں اسلامی ہند کی

سب سے زیادہ نمایاں شخصیت تھی۔ وسعت خلق، رفعت خیال، جودت فکر اور جرأت اظہار کے علاوہ قومی و سیاسی بصیرت، نسبی سیادت، اور ذاتی وجاہت نے ان کی نگاہ میں ایک مقناطیسی کشش پیدا کر دی تھی یہی جاذبیت تھی جس نے ان کے گرد بھی اکبر اعظم کی طرح ایک نورتن جمع کر رکھا تھا، اور یہی کہربائی اثر تھا جس کے آگے بڑی سے بڑی ہستیوں کو بھی سر نیاز خم کرنا پڑا، محسن الملک ہوں یا چراغ علی، حالی ہوں یا شبلی جو بھی سامنے آیا مسخر ہو کر رہا۔ سچ کہا ہے مولانا حالی نے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں | دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

سرسید کے تمام نامور حاشیہ نشینوں میں علامہ شبلی سب سے کم سن تھے اور تعلق بھی ملازمت کا تھا، اس لئے ان کا مسخر ہو جانا بظاہر سب سے زیادہ آسان تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ملاقات کے پہلے ہی وہ ایک حد تک مسخر ہو چکے تھے، علما کے طبقہ کو بالعموم جو مخالفت سرسید کی تحریک سے تھی اس کے اسباب یہاں بہت کم تھے۔ یہ مانا کہ مولانا فاروق تحریک جدید کے بڑے مخالفوں میں سے تھے، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں جو جدت طرازیاں کی ہیں وہ خود ان کے دل و دماغ کی پیداوار نہ تھیں، بلکہ ان کا بیشتر حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم کے خرمن کمال سے مستعار تھا، علاوہ بریں مولانا شبلی کا پورا خاندان سرسید کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہو چکا تھا اور نفرت و بیگانگی نے عقیدت اور حسن ظن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جیسا کہ مولانا کے اس قصیدہ سے واضح ہوتا ہے یہاں ہم مولانا کا پورا قصیدہ نقل کرتے ہیں جو مولانا نے سرسید کی خدمت میں پہلی ملاقات کے وقت پڑھا تھا

قصیدہ

المجد یصحب علما حیثما یصل | والعلم عن قومنا لا زال یرتحل

نالوا من الذل ما لا ناله احد | اذ لا یری فیهم علم ولا عمل

ولا يزال يتشتت شملهم — في كل يوم وقد ضاقت بهم حيل
لا يرجعون الى ما كان ينفعهم — فجل صنعهم البغي والخطل
تراهم اليوم في كرب وفي قلق — فلا افاد فتيلا ما به اشتغلوا
لا ينتهون وقد ذاقوا وبالهم — عن سوء صنع فقد باؤا بما عملوا
وهل يجي ربهم الا بما اكتسبوا — من كان من عنده الاحكام تنفصل
من سعى اليوم في اصلاح حالهم — فالله جازيه يوما يقطع الامل
ان كنت تسئلني من هكذا صفته — قلت الامام الهمام السيد البطل
هو الذي فاق في الآفاق منزلة — ونال ما لم تنله الاعصر الاول
من قبل ان يدين والدنيا عليه معا — والآن في نجح ما قد رام مشتغل
نال المكارم من آبائه ومشى — في المكرمات على آثار ما فعلوا
نجل لسيد الاعراب والعجم — قد قال يا امتي لما دنا الاجل
وهكذا صنع هذا السبط معتلم — يقول يا لهف قومي بئس ما عملوا
يا خير من بسط حب لقوم مده — احسن ولا تنس من سوء ما عملوا

احسن اليهم ولو جازوك سيئة
ولا تبال بما قالوا وما فعلوا

جو لوگ علامہ شبلی کے افتادِ مزاج سے کچھ بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ خوشامد شبلی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ایک حرف بھی کسی کی مدح و ستائش میں لکھنے پر قادر نہ تھے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس قصیدہ میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل شاعر کے ضمیر کی آواز ہے، جو الفاظ موزوں بنکر نکلی ہے۔ اب پورے قصیدہ کو اول سے آخر تک پڑھ جائیے تو آپ کو خود محسوس

ہوگا کہ شاعر کی تمام زمزمہ سنجی کا سرچشمہ ملت محمدیہ کی موجودہ پستی کا دردناک احساس ہے جس سے شاعر خود بیتاب ہے اور اپنے ممدوح کو بھی اسی جوہر کمال کی بنا پر خراج تحسین کا مستحق قرار دیتا ہے۔

سرسید کے ساتھ روزانہ کے علمی اور سیاسی مذاکروں نے اس شعلہ کو اور بھی تیز کر دیا اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر علمی اور تاریخی حیثیت سے صرف توجہ کی ضرورت پیش آئی، علی گڑھ کی آزاد فضا میں علمی تگ و دو کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا اور تحقیق و تفحص کی نئی شاہراہیں کھل گئیں قوت آخذہ فطری تھی اور موقع خداداد۔ فرصت کافی تھی اور سرسید کے کتبخانہ میں نوادر کا اچھا ذخیرہ تھا۔ شوق مطالعہ کی سیری کے لئے حسن اتفاق سے ایک اور سامان ہو گیا۔ عبدالمجید نام کے ایک صاحب مولانا کے شناسا تھے جو ادھر ادھر سے نایاب کتابیں تلاش کر لاتے۔ اور مولانا کی خدمت میں فخریہ پیش کرتے۔

اُدھر جوں جوں مولانا کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے جاتے سرسید کی گرویدگی بڑھتی جاتی ادھر خود اسٹیج کے اندر داخلہ کے بعد خود مولانا کی نگاہوں سے منظر کا رعب کم ہوتا گیا۔ اس طرح سید و شبلی روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہو رہے تھے۔ مگر قرب کے ساتھ کشش اور کشش کے ساتھ کشمکش کا بڑھنا بھی قدرت کا عالمگیر اصول ہے۔

اُدھر سرسید کو اپنی پختہ کاری اور جاذبیت پر اعتماد۔ اِدھر علامہ شبلی کو اپنے علمی شرف اور فطری تفوق کا احساس۔ ادھر سمعاً و طاعۃً سننے کے لئے حسن طلب کے سیکڑوں اسلوب۔ اِدھر دع ما کدر پر استقامت کے لئے حسن انکار کے ہزار پیرائے۔ اُدھر نگاہ سحر فن ایک جوہر قابل کو ہمہ تن جذب کر لینے کے لئے بیتاب۔ اِدھر فطرت خوددار کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے پر اصرار۔

عبث ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے ۔۔۔ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

نصب العین دونوں کا ایک تھا یعنی ملت اسلامیہ کا احیاء۔ علاوہ دونوں کی رائے تھی ایک ہی تھا یعنی موجودہ زندگی کی تشکیل۔ اس منزل تک دونوں ہم آہنگ تھے۔ مگر آگے چل کر راستے جدا ہو جاتے تھے۔ سرسید مسلمانوں کے مستقبل کو یورپ کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے تھے۔ اور علامہ شبلی یورپ کو خود اس کے تحفہ سے ایشیائی بنانے کے آرزومند تھے۔ ایک کی مصلحت شناسی زمانہ کی رو کیساتھ بہہ جانے کی خواہاں تھی تو دوسرے کی ہمت و جرأت خود اس رو کا رخ پھیر دینے کی متقاضی۔

مذہبی نقطہ نظر سے دونوں ہم سفر ہو سکتے ہیں مگر ایک کو شکست توبہ کی دھن ہوتی ہے اور دوسرے کو شکست ... ہو

یہ بھی داستان کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھی جاتی ہے۔ یہاں کہنا صرف اسقدر ہے کہ علی گڑھ کے دوران قیام میں جو دار و گیر زندگی کی اس دماغی ورزش سے مولانا کے ذہنی ارتقا کو غیر معمولی مدد ملی۔ مولانا کی تربیت تمامتر مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور علی گڑھ سراپا مغربیت کا داعی۔ مولانا نہ تو اتنے سریع الانفعال تھے کہ اس رو میں بہہ جائیں۔ نہ اتنے محروم الحس کہ گرد و پیش سے متاثر نہ ہوں۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہونا چاہیے تھا۔ مشرق و مغرب کے دو برق بدامن بادل باہم ٹکرائے اور وہ بجلی چمکی جس سے مولانا کی تمام دماغی فضا دفعۃً جگمگا اٹھی۔

علی گڑھ آنے سے پہلے ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ ایک دیوان فارسی زبان میں مرتب کر چکے تھے۔ عربی میں ایک رسالہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر حنفیت کی تائید میں شائع ہو چکا تھا۔ اور بھی چند رسائل مولوی سلامت اللہ صاحب جیراجپوری مرحوم کی تردید میں لکھے تھے مگر چونکہ ان کی زبان اردو تھی اسلئے اپنے تلامذہ کے فرضی ناموں سے ان کو شائع کیا تھا۔ علی گڑھ کا پہلا احسان تو یہ ہے کہ عربی و فارسی کے بجائے اپنی اردو زبان کو ترقی دینے کا شوق پیدا کیا۔ اور غالب کے اس مشہور قطعہ میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے اس کی غلطی محسوس کرائی۔

ایکہ گوئی کہ فلاں در شعر ہم سنگ من است — انچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

فارسی بنگر کہ یا بی نقش ہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

یہ خیال صرف غالب ہی کا نہ تھا۔ بلکہ اس زمانہ تک باعموم تمام ذی علم حضرات اسی غلطی میں مبتلا تھے۔ اور تصانیف تو کیا خطوط میں بھی اردو کا استعمال ننگ سمجھتے تھے۔

بہرحال سرسید کے فیض صحبت اور فضائے علی گڑھ کی تاثیر سے مولانا کی توجہ اردو کی طرف مائل ہوئی۔ اور اس وقت سے بہ استثنائے شاعری ادب و دانش کا سارا زور اردو ہی پر صرف ہونے لگا۔ مگر باینہمہ سابق خیالات کا اتنا اثر تھا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں اردو نویسی کے لئے اعتذار کرنا پڑا۔ فرماتے ہیں:۔

گرچہ مرا شیوۂ فن این نہ بود — حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود

پیشتر از گرم طلب بودہ ام — بادیہ پیمائے عرب بودہ ام

بزم چو آں فرہ و آں ساز داشت — ساغر ہم بادہ شیراز داشت

لیک چو آں مطرب و ساقی نماند — بوئے از اں میکدہ باقی نماند

بزم بطرز دگر آراستم — خوش تر از آں نیز کہ می خواستم

گرچہ سر و برگ سخن دیگر است — شمع ہماں است و لگن دیگر است

بادہ گوارا بہ عسمر یزاں تمام — بادۂ گلگوں بہ سفالینہ جام

دوسرا اور غالباً سب سے بڑا احسان علی گڑھ کا یہ تھا کہ مولانا کا موضوع تصنیف بدل گیا۔ اگر اسی قدیم ماحول میں رہتے تو درسیات کے شروح و حواشی یا فروعیات فقہی کے تنگ دائرہ سے نکلنا شاید نصیب ہوتا۔ یہاں آئے تو تاریخ اسلام کے ناپیدا کنار میدان میں تگ و دو کا ولولہ پیدا ہوا۔ مناظرانہ مذاق کے بدولت پہلے ان اعتراضات کے دفعیہ کی کوشش کی جو یورپ نے اسلام پر عائد کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کئی ایک

ناقدانہ مقالے لکھے۔ مثلاً الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم وغیرہ۔ مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ارادوں کی رفعت اور حوصلوں کی بلندی بڑھتی گئی۔ حقیقت کے تعشق نے بحث و مناظرہ کے بجائے زیادہ انہماک جستجوئے علمی اور بلند پایہ تصنیف پر مبذول کر دیا۔ اسی زمانے میں اول اول تاریخ بلاد اسلامیہ کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ پھر جب اس تصنیف کی دشواریوں پر نظر کر کے اس وسیع خاکے کو گھٹانا پڑا اور تاریخ بنی عباس کی بنیاد ڈالی۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ معتصم کا حال لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن آخر اس کو بھی ترک کرنا پڑا۔ اور بالآخر ہیروز آف اسلام کا تخیل دماغ کے سامنے آیا۔ اس سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی المامون تھی جو اسی زمانے میں تصنیف ہوئی۔ ان تاریخی تصنیفات کی ترتیب میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یورپ کے طرز تحقیق اور اسلوب تحریر سے بھی استفادہ کیا جائے اور مشرقی طرز تصنیف پر یورپ کی جو نکتہ چینیاں ہیں ان کو سامنے رکھ کر تصنیفات کا وہ معیار پیش کیا جائے جس کو یورپ کے مستشرقین اور ایشیا کے متجددین بھی قدر کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر یورپ کی ان دو زبانوں کا سیکھنا نہ صرف ضروری ہوا جو کیا بلحاظ وسعت استعمال اور کیا بلحاظ سرمایہ علمی تمام السنہ مغربیہ میں اس وقت ممتاز تھیں یعنی انگریزی اور فرنچ۔

حسن قدرت بخت نے اس کا بھی سامان مہیا کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ جو ان دونوں زبانوں کے علم و ادب پر قدرت کاملہ رکھتے تھے، اور عربی و فارسی سیکھنے کے شائق تھے۔ ان سے معاملت ہو گئی۔ اور ان دونوں باکمالوں نے ایک دوسرے کے سامنے زانوئے ادب تہ کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ مولانا سے عربی و فارسی کی تحصیل کرتے، اور مولانا ان سے انگریزی اور فرنچ سیکھتے۔ معمول یہ تھا کہ خود پروفیسر آرنلڈ شام کو مولانا کے بنگلے پر تشریف لے جاتے اور وہیں پر درس و تدریس اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ چلتا۔

اس معمول میں کبھی فرق نہ پڑتا۔ پروفیسر آرنلڈ وقت مقررہ پر بلکہ ایک آدھ منٹ پہلے ہی پہنچ جاتے۔ ایک بار اتفاق سے چند منٹوں کی دیر ہو گئی مولانا کو اس کا احساس تک نہ تھا مگر پروفیسر آرنلڈ نے آتے ہی

معذرت شروع کردی مولانا کو اس ذراسی تاخیر پر آرنلڈ صاحب کا عذر خواہ ہونا بہت عجیب معلوم ہوا اور سمجھے کہ یہ محض رسمی تکلف ہے لیکن پروفیسر آرنلڈ نے ان کو یقین دلایا کہ یورپ میں وقت کی عدم پابندی نہ صرف اخلاقی عیب بلکہ قانونی جرم بھی سمجھی جاتی ہے اور ضیاع وقت کا ہرجہ بذریعہ عدالت وصول کیا جا سکتا ہے۔ قدیم وجدید کی اس معتدل اور ناقدانہ آمیزش نے پروفیسر آرنلڈ اور علامہ شبلی دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر یگانۂ عصر بنا کر چھوڑا۔

ناسپاسی ہوگی اگر فضائے علی گڑھ کے اس فیض کو جس نے مولوی شبلی کو علامہ شبلی بنا دیا، فراموش کر دیا جائے۔ لیکن ناشناسی ہوگی اگر مولانا کے تمام علمی کمالات کا سرچشمہ علی گڑھ کو قرار دیدیا جائے۔ یوں سننے کو تو ہم بھی سنتے آئے ہیں کہ فلاں صاحب نے "سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا"۔ لیکن آج تک دیکھا نہیں کہ آب و ہوا کے فیض نے گیدڑ کو شیر نیستاں کر دکھایا ہو یا استاد کی تربیت نے کوے کو بلبل ہزار داستان بنا دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی کے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں فطرت کا عطیہ تھیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نقد و اجتہاد کا ملکہ اور اخذ مطالب کی بے مثل قابلیت شفیق اساتذہ کی تربیت اور اپنی محنت و دماغ سوزی کے ثمرات تھے۔ لیکن ان تمام فطری اور کتابی کمالات کو صحیح اور نتیجہ خیز منزل کی جانب رہبری کرنیوالا علی گڑھ۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج تک پھر علی گڑھ سے کوئی دوسرا شبلی نہ اٹھ سکا۔

علی گڑھ جب طول البلد اور عرض البلد پر پہلے تھا وہیں آج بھی ہے۔ البتہ اگر پہلے ایک تھا تو آج سو ہے اگر پہلے ایک معمولی اسکول تھا تو آج عذار کھے ایک وسیع یونیورسٹی ہے۔ عربی کے سیکڑوں فارغ التحصیل مولوی یہاں آئے اور پوری زندگیاں گزار دیں مگر آخر اس کا کیا سبب ہے کہ جیسے تہی مایہ آئے تھے

دیئے گئے بند ہوگئے۔ علی گڑھ تنخواہیں بڑھا سکتا تھا بڑھا دیں۔ خطاب دلوا سکتا تھا دلوا دیئے۔ مگر تالیف بزرگ کا مسودہ تھا، علی گڑھ خرید کر حوالے کر دیتا۔

مجھے یاد ہے کہ علی گڑھ میں ایک بزرگ اپنے تہی مغز اور کورچشم معتقدین کو اپنے مخصوص موزات اور اشارات سے یہ باور کرا چاہتے تھے کہ الفاروق دراصل انہیں کی تصنیف تھی مگر مسودہ سرسید کو دکھانے کے لئے دیا گیا وہاں سے سرقہ کر کے مولوی شبلی صاحب نے چھپوا دیا۔ مجھے یہ داستان انھیں کے خوش اعتقادوں میں سے ایک سے سننے کا اتفاق ہوا تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ خیال ہوا کہ دنیا بھی کیسی فردوس الحمقاء ہے جہاں بی، اے کلاس کے طلبہ بھی اس طرح کی بے سر و پا خرافات کو وحی آسمانی کی طرح یاد کر لیتے ہیں۔ مجھے تو ان بزرگوار کی تہی مائگی پر افسوس ہے کہ ایک ہی سرقہ کے بعد ساری کائنات ختم ہوگئی اور ایک چیستاں نما ترجمہ کے سوا زبان قلم سے مدۃ العمر میں ایک حرف بھی تراوش نہ کر سکا۔ ادھر علامہ شبلی کی قسمت پر رشک ہوکہ قدرت ان کو برابر اس طرح کی دستبرد میں امداد کرتی رہی اور الفاروق کے ماقبل و مابعد ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے مل جاتے تھے جو اپنے نتائج افکار کو اپنی غفلت سے ان کے دست تصرف تک پہونچ دیا کرتے۔

(باقی)

تفسیر سورہ کوثر (اردو)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

کتابت و طباعت جاذب نظر، کاغذ عمدہ تقطیع ۲۲×۱۹، حجم ۱۴۲ صفحے۔ قیمت ۸ر

منیجر

کتبخانۂ اسکندریہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

از جناب مولوی عبدالرحمن صاحب ناصر

تاریخ میں کتبخانوں کے جلائے جانے کے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔ مثلاً شہنشاہ تھیوڈوسیوس نے ۳۸۹ء میں بت پرستوں کے تمام عبادت خانوں، ہیکلوں اور یادگاروں کو مٹادیا اور اسی پر بس نہیں کیا، اپنے پورے احاطۂ سلطنت میں بت پرستی کے جتنے چھوٹے بڑے آثار پائے، سب صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹادیئے، یہاں تک کہ اسکندریہ کا معبد سراپیوم منہدم کرادیا اور اسی کے ساتھ اس کی تمام کتابیں اور نادر اشیاء بھی برباد کردیں۔

۶۵۶ھ میں ہلاکو تاتاری نے بغداد پر حملہ کیا۔ یہاں کے تمام کتبخانوں کی کتابیں نہر دجلہ میں ڈبوادیں اور جو بچ رہیں ان کے بارہ میں حکم دیا کہ بجائے اینٹ اور مٹی کے انہی کو انبار کرکے گھوڑوں کے اصطبل اور بکریوں کے باڑے بنوادیئے جائیں۔[۵۱]

صلیبی جنگوں کے ایام میں، فرانسیسیوں نے جب طرابلس شام کو فتح کیا تو اپنے سپہ سالار کاونٹ برٹران ڈی سانگل کے ایماء سے وہاں کے تمام کتبخانوں کو نذر آتش کردیا۔[۵۲] اسی طرح جب ہسپنیوں نے اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تو وہاں کے تمام کتبخانوں کو برباد کردیا۔

زمانۂ حاضر کی فرانسیسیوں جیسی متمدن قوم کا دامن بھی اس بدنما داغ سے محفوظ نہیں ہے۔ انھوں نے جب الجزائر فتح کیا تو شہر قسطنطنیہ کے کتبخانوں میں جتنی قلمی اور مطبوعہ کتابیں ان کو ملیں، انھوں نے سب نذر آتش کردیں۔[۵۳]

---

۵۱ تاریخ ابن الساعی ص ۱۲۷، وابن خلدون ج ۳ ص ۵۴۳۔ ۵۲ تاریخ الامبراطوریۃ الرومانیۃ ج ۲ ص ۵۰۶ مصنفہ گبن۔ ۵۳ تاریخ العرب العام ج ۱ ص ۱۸۵ مصنفہ سیدیلو۔

ان تاریخی شہادتوں کی وجہ سے گو بہت تھوڑی دیر کیلئے یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں نے حضرت عمر فاروق رضی کے حکم سے کتبخانہ اسکندریہ جلا دیا۔ تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مشہور روایتی اور تاریخی جرم میں شرکت کا دھبہ مسلمانوں کے دامن پر بھی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو اس آسمان کے نیچے دنیا میں پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔

لیکن یہ کوئی چھوٹا جرم ہو یا بڑا۔ حفاظت دین کے جوش میں کیا گیا ہو یا محض ایک وحشت و بربریت کا نمونہ مقصود ہو۔ اس بارہ میں اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی کی ذات اس الزام سے بالکل بری ہے۔ عربوں کے فتح مصر کے وقت کتبخانہ اسکندریہ کا وجود ہی نہیں باقی رہا تھا۔ وہ اس سے بہت پہلے جلایا جا چکا تھا۔

۳۲۳ قبل مسیح میں جب سکندر مقدونی مرا اور اس نے تخت کا کوئی وارث نہ چھوڑا تو اس کی وسیع سلطنت اس کے فوجی افسروں نے آپس میں تقسیم کر لی۔ چنانچہ مصر بطولوماوس سوتر کے حصہ میں آیا۔ جو اس مشہور خاندان بطالسہ کا بانی ہے جس نے مدتوں مصر پر حکومت کی۔

یہ افسر علم کا بڑا شائق تھا۔ مصنفین اور مولفین کی بڑی اعانت کرتا تھا۔ خزانہ شاہی سے ان کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ اس علم دوستی کی کشش نے تمام ملکوں کے علما اور فلاسفہ کو اسکے ارد گرد جمع کر دیا دنیا کے مختلف گوشوں کے علما اس کے سایہ عاطفت میں آرام کی زندگی گذارتے۔ اور علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں بحث و تحقیق کی داد دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اسکندریہ تمام علوم و فنون کا مرکز اور مامن بنگیا۔

انہی علما میں ایک یونانی ادیب دمتری فلیروس بھی تھا (شاید اسی کا نام عرب مورخین نے بگاڑ کے ذمیرۃ کر دیا ہے) اس نے بطولوماوس سے ایک بڑا کتبخانہ قائم کرنے کی درخواست کی جس میں دنیا کی تمام علمی اور مذہبی کتابیں جمع کی جاسکیں۔ اس نے خوشی کے ساتھ اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔

اور فوراً ہی اس کام کی تکمیل میں سرگرم کار ہوگیا اور چند ہی سالوں کے اندر اندر بہترین کتابوں کی دسوں ہزار جلدیں فراہم ہوگئیں جن سے قصر شاہی کا ایک بڑا حصہ رک گیا۔

اس کے بعد بطلیموس ثانی جو بطلیموس فیلاڈلفوس کے نام سے مشہور ہوا، اس کا جانشین ہوا، اس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پیشرو کے نقش قدم کی پیروی کی بلکہ ایک کام اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کیا کہ بہت سے آدمی دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے کہ نادر کتابیں تلاش کرکے اور خرید کرکے لائیں۔ چنانچہ چند ہی سالوں کے اندر ان آدمیوں نے یونانی، یہودی، اشوری اور فنیقی تالیفات اور ارسطو کے کتبخانہ کی تمام نوادر سے اس کتبخانہ کو معمور کر دیا

اس کے بعد بطلیموس آرجنیس کا زمانہ آیا اس نے تو گویا کتبخانہ کو زمین سے اچھال کر آسمان پر پہنچا دیا۔ اس کے عہد میں یہ عام حکم تھا کہ جو اہل قلم اسکندریہ میں قیام کریں یا وہاں سے گذریں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تصنیفات کا ایک ایک نسخہ کتبخانہ کو نذر کریں۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھوکھا کتابیں مکتبہ میں جمع ہوگئیں۔ اکثر مورخین کی رائے ہے کہ سات لاکھ کتابیں تھیں۔

۴۷ء قبل مسیح میں رومیوں نے مصر پر حملہ کیا۔ اسکندریہ کے باشندوں میں یولیس قیصر کے خلاف ایک سخت اشتعال پیدا تھا۔ اس کی وجہ ملکہ کلوپٹرا سے اس کے ناجائز تعلقات کی شہرت تھی۔ چنانچہ باشندوں نے علم بغاوت بلند کر دیا اور قصر شاہی کو گھیر لیا۔ قیصر نے شاہی محل اور مصری بیڑے میں جو بندرگاہ میں لنگر انداز تھا۔ دونوں میں آگ لگا دینے کا حکم دیدیا تاکہ جب باغی اپنے بیڑے کے بچانے کی فکر میں مشغول ہوں تو اسے فرار ہونے کا موقع ملجائے۔ محل کی یہ آگ پھیلکر اس حصہ میں بھی پہنچ گئی جسمیں کتبخانہ تھا، جس سے پورا کتبخانہ یا کم از کم اس کا اکثر حصہ جل کر خاک ہوگیا۔

اس کے بعد جب مسیحیت کا ظہور ہوا اور اس کے قدم مصر میں پہنچے۔ اور مصر رومن شاہنشاہی کا ایک جز بنا تو قدرۃً ملک کی تمام علمی زندگی پر اس نئے مذہب کا رنگ چھاگیا۔ اور جس قدر نئے دین کے

نقوش مٹ جاتے اسی قدر قدیم علوم و فنون اور ان کے تمام آثار مٹتے جاتے۔

اور یہ کہنا ٹھیک ہے کہ شہنشاہ تھیوڈوسیوس نے بت پرستوں کے تمام معبدوں، ان کے تمام ہیکلوں ان کی تمام یادگاروں، ان کی تہذیب اور ان کے کلچر کی سب چیزوں کو اس طرح مٹا دیا کہ گویا انکا کبھی نقش و نشان دنیا پر تھا ہی نہیں۔ اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کتبخانہ اسکندریہ کی وہ بچی کھچی کتابیں جو ۳۹۱ء ق م آگ جلنے سے محفوظ رہ گئی تھیں اور معبد سیراپیوم میں ایک خاص جگہ محفوظ کر دی گئی تھیں وہ بھی اس متعصب شہنشاہ کی دست برد سے نہ بچ سکیں۔ اس نے کتابیں جلوا دیں اور معبد کو زمین برابر کرا دیا۔ کتنا .... عبرت انگیز واقعہ ہے اس بات کا کہ بطالسہ نے اتنی جانفشانیوں اور محنتوں کے بعد جو جواہر ریزے دنیا کے کن کن گوشوں سے جمع کئے وہ سب ایک آن میں آتش تعصب کی نذر ہو گئے۔

ان تمام واقعات کے بعد ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ۴۱۵ء میں ہیپاتیا نامی ایک عورت (جو اسکندریہ میں فلسفہ وثنیت کی تنہا اور آخری عالمہ تھی) اور پوپ کیرلس اول بطریق شہر میں ایک مذہبی مناظرہ چھڑا۔ بطریق نے جب دیکھا کہ مناظرہ کسی طرح ختم ہوتا نظر نہیں آتا اور اس نے لوگوں کے جذبات بھی ابھار دیئے ہیں تو ہمیشہ کیلئے اس طرح کے مناظروں کو ختم کر دینے کیلئے اس نے اس آخری معبد کو بھی ڈھوا دیا جو بت پرستی کے دور کا آخری نشان رہ گیا تھا اور وہ کتابیں بھی تلاش کر کے جلوا دیں جو بعض لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر محفوظ رہ گئی تھیں۔

رومیوں نے صرف مصر ہی سے بت پرستی کے دور کے ہر نقش کو نہیں مٹایا بلکہ یونان سے بھی ان تمام چیزوں کا خاتمہ کر دیا جن میں وثنیت کے دور کی کوئی جھلک تھی۔ چنانچہ ایتھنز کے وہ تمام مدارس جن میں فلسفہ وثنیت کی تعلیم دی جاتی تھی یکقلم بند کر دئے گئے اور ان تمام کتابوں کے اوراق ایک ایک کر کے بکھیر دئے گئے جن میں تعلیم وثنیت کا شائبہ بھی پایا گیا۔

اب ان تمام غارتگریوں، بربادیوں اور آتشزدگیوں کے بعد کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کونسا

کتبخانہ اسکندریہ کیا حضرت عمرو ابن العاصؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے جلایا تھا؟ اگر حضرت عمرؓ کے زمانہ حکومت میں اسکندریہ کے اندر کوئی کتبخانہ موجود نہیں تھا تو یہ شور و ہنگامہ کیا ہے جو بعض قدیم و جدید مورخین نے مچا رکھا ہے؟ آیئے جدید و قدیم تحقیقات کی روشنی میں بھی ہم اس افترا پردازی کی اصل حقیقت پر غور کریں،

عربوں کے فتح مصر کے چھ صدی بعد تک کسی مورخ نے ذکر نہیں کیا کہ کتبخانہ اسکندریہ کو عمرو بن العاصؓ نے خود یا حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے جلوادیا۔ ساتویں صدی میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ یہ یہودی النسل تھا پھر اس نے دین مسیحی اختیار کیا پھر ترقی کرکے کنیسہ کا بشپ بھی ہوگیا اس کا نام ابوالفرج ملطی تھا۔ اس نے سریانی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ پھر اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "مختصر تاریخ الدول" رکھا۔ اسی عربی نسخہ میں اس نے سریانی نسخہ کے علاوہ ایک جگہ تھوڑی سی عبارت بڑھا دی۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

" عمرو بن العاصؓ کے اسکندریہ فتح کرنے کے وقت تک یحیی نحوی زندہ تھا۔ وہ عمرو بن العاصؓ کے پاس آیا اور اپنی لسانی فلسفیانہ گفتگو سے ان کو مسحور کرلیا۔ انھوں نے یحیی کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ایک دن یحیی نے ان سے کہا کہ "اس وقت اسکندریہ آپ کے زیر نگیں ہے۔ اب اس کی تمام چیزوں پر آپ کو تصرف کا حق حاصل ہے۔ جو چیزیں کہ آپ کے فائدہ کی ہیں ان سے تو ہم کو مطلب نہیں مگر جو چیزیں آپ کے لئے بیکار ہیں ان سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمایئے۔" انھوں نے کہا "وہ کیا چیزیں ہیں؟" یحیی نے کہا "حکمت و فلسفہ کی جو کتابیں شاہی خزانے میں محفوظ ہیں وہ ہمیں عنایت ہوں"۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا "میں کوئی کام بغیر خلیفہ کی اجازت کے نہیں کرسکتا پہلے ان سے پوچھ لوں"۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے مشورہ طلب کیا۔ جواب میں حضرت عمرؓ نے یہ لکھا کہ "وہ کتابیں اگر کتاب اللہ کے موافق ہیں تو کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے ان کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر کتاب اللہ کے مخالف ہیں تو ان سب کتابوں کو جلوا دو"۔ عمرو ابن العاصؓ نے یہ حکم پاکر تمام کتابیں جو اسکندریہ کے مختلف

[illegible] آپ بھجوا دیں تو یہ برابر چھ مہینہ تک جلتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے"
بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسی مسیحی پادری نے یہ واقعہ گڑھا ہے تاکہ اس طرح وہ اسلام اور
[illegible] ان دونوں بزرگوں کی شہرت کو نقصان پہنچائے۔ مگر اس میں حقیقت کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔
یہ واقعہ اور اس طرح کے [illegible] گزشتہ [illegible] نے ابن القفطی کی کتاب "تراجم الحکما" سے مذکورہ بالا عبارت
[illegible] میں نقل کی ہے۔ ابن القفطی کی کتاب کا اقتباس بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

عمرو بن العاص کے مصر اور اسکندریہ فتح کرنے کے وقت تک یحییٰ نحوی زندہ تھا۔ وہ عمرو بن
العاص کے پاس آیا۔ ان پر اپنا علمی مرتبہ ظاہر کیا اور اس کے اور نصاریٰ کے درمیان جو مناظرے ہوئے
تھے ان کا تذکرہ کیا۔ ابطال تثلیث اور اتحاد کے دھرم پر اپنے دلائل بھی سنائے۔ ان سب باتوں
نے عمرو بن العاص کو یحییٰ کا گرویدہ بنا دیا۔ انھوں نے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ایک دن یحییٰ نے
ان سے کہا کہ اس وقت اسکندریہ آپکے زیر نگیں ہے۔ آپ اس میں ہر طرح تصرف کر سکتے ہیں۔
جو چیزیں کہ آپکے فائدے کی ہیں ان سے تو ہم کو مطلب نہیں۔ مگر جو چیزیں آپکے لئے غیر مفید ہیں
ان سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع عنایت کیجئے۔" انھوں نے کہا "وہ کیا چیزیں ہیں؟" یحییٰ نے
کہا کہ "شاہی خزانے میں حکمت و فلسفہ کی جو کتابیں محفوظ ہیں وہ آپکے لئے بالکل غیر مفید ہیں اور ہمارے
لئے دولت گرانمایہ ہیں۔" انھوں نے پوچھا یہ کتابیں کس نے جمع کی تھیں؟ یحییٰ نے کہا "جب
فیلاڈلفوس نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لی تو اطراف و جوانب کے تمام علما سمٹ کر اس کے
پاس آگئے۔ اس نے بڑی محنت سے مفید کتابوں کے سراغ لگائے۔ اخراجات کے لئے شاہی خزانہ
کھولدیا۔ ابن ذمیرۃ (دمتری فالیروس) کو خاص اسی کام پر معمور کیا۔ آہستہ آہستہ ان کتابوں میں
برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ہر نیا بادشاہ اس بارہ میں اپنے پیشرو کی تقلید کرتا۔" یہ سن کر وہ بہت متعجب
ہوئے اور کہا "میں حضرت عمر فاروقؓ کی اجازت کے بغیر اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے

حضرت عمرؓ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھ بھیجا۔ "وہ کتابیں اگر کتاب اللہ کے موافق ہوں تو کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے ان کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر اس کے مخالف ہوں تو سب کو ضائع کردو۔" اس حکم کے بعد عمرو بن العاصؓ نے تمام کتابوں کو حماموں میں تقسیم کرادیا جو چھ مہینہ تک جلتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے۔"

ابو الفرج ملطی اور ابن القفطی دونوں کی عبارتیں بالکل مشابہ ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابو الفرج نے خود یہ جھوٹی روایت نہیں گڑھی ہے بلکہ اس نے ابن القفطی کی کتاب سے یہ روایت نقل کی ہے۔ تاہم ابو الفرج کی ذات کسی طرح اس الزام سے بری نہیں ہوسکتی کہ اس نے جھوٹی روایت محض اس لئے نقل کی کہ عمرو بن العاصؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دامن عزت کو داغدار بنائے۔ ورنہ اگر وہ ایک مورخ کی حیثیت سے اس روایت کو جانچتا تو کبھی اس کو درخور اعتنا نہ خیال کرتا کیونکہ ابن القفطی اس روایت میں بالکل منفرد ہے۔ اس سے پہلے کسی مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور نہ ابن القفطی کے ماخذ ہی کا پتہ ہے کہ اس نے یہ روایت کہاں سے نقل کی ہے۔

ان تفصیلات سے بالکل واضح ہوگیا کہ اس بیہودہ روایت کا گڑھنے والا ابن القفطی ہے۔ جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی" میں ابن القفطی کی یہ روایت نقل کی ہے اور کوشش کی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی تاریخی ماخذ بھی پیدا ہوجائے۔ تاکہ ابن القفطی اس اعتراض کی زد سے بچ جائے کہ اس کی روایت کا کوئی ماخذ نہیں ہے! اور متقدمین کی چند صدیوں کی طویل خاموشی کے بعد اس راز کا تنہا رازداں وہی ہے۔ چنانچہ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ:- ابن القفطی نے یہ روایت عبد اللطیف بغدادی کی کتاب "الافادۃ والاعتبار" سے نقل کی ہے جس نے بچشم خود مصر کے حالات کا معائنہ کیا تھا۔ اور اپنے بہت سے مشاہدات قلمبند کئے تھے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے: بغدادی نے کتبخانہ اسکندریہ کا سرے سے کہیں ذکر ہی نہیں کیا ہے اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے۔

میں نے بہت سے ستون دیکھے جن کے بعض حصے ابھی تک صحیح سالم تھے۔ اور بعض دست بُردِ زمانہ کے شکار ہو چکے تھے۔ ظاہری صورت بتا رہی تھی کہ ان ستونوں پر چھتیں ہوں گی۔ میرے خیال میں اسی میں وہ دار الحکمۃ بھی تھا جہاں ارسطو اور اس کے شاگرد تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ دار العلوم ہے جو سکندر نے تعمیر کرایا تھا اور اسی میں وہ کتب خانہ بھی تھا جس کو عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے جلا دیا"۔

لیکن عبد اللطیف سے ابن القفطی کی روایت کے لئے کوئی مزید تائید نہیں فراہم کی جا سکتی اور نہ بغدادی کے اس قول پر کوئی تاریخی شہادت قائم ہو سکتی۔ گمان غالب یہ ہے کہ بغدادی نے خود تحقیق و تفتیش کی زحمت میں پڑنا نہیں چاہا اور بغیر کسی نقد و نظر کے یہ لغو روایت ابن القفطی کی کتاب سے نقل کر دی کیونکہ یہ دونوں ہم عصر تھے۔

بہرکیف خواہ بغدادی کا ماخذ ابن القفطی ہو یا ابن القفطی کا ماخذ بغدادی، دونوں صورتوں میں جرجی زیدان یہ نہیں بتا سکتا کہ ان دونوں کا ماخذ کون ہے؟ اور نہ کسی اور دلیل تاریخی سے وہ اس کو ثابت کر سکتا ہے۔ اس نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا ہے وہ محض ظن و تخمین ہے اور کوئی مورخ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو باور نہیں کر سکتا۔ وہ لکھتا ہے "لیکن بدقسمتی سے دوسرے تمام ماخذ جن سے ابن القفطی اور بغدادی نے اخذ کیا) دوسری عربی تالیفات کے ساتھ ضائع ہو گئے"۔

اس سے اگر پوچھا جائے کہ اس کا کیا ثبوت کہ ان کے ماخذ تھے بھی جو دوسری تصنیفات کے ساتھ ضائع ہو گئے تو اس کے جواب میں بجز خاموشی کے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جرجی زیدان اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ بیان کرتا ہے۔

ابن الندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں فلاسفۂ طبعیین کے سلسلہ میں کتب خانۂ اسکندریہ کے قیام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ ان مصادر کے جن سے یہ روایت ماخوذ ہے، تاریخ کی ایک اور کتاب بھی ہے جس کے مصنف کا نام اسحٰق راہب ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں

یونان وروم کے حالات اوران کے ادب اور لٹریچر سے بحث کی ہے۔ اور منجملہ ان باتوں کے جو لوگوں نے اس کتاب سے اخذ کی ہے، ذمیرہ کے ہاتھوں کتبخانہ اسکندریہ کا قیام بھی ہے، اسکی اصل عبارت یہ ہے

"اسکندریہ کے بادشاہوں میں سے بطولوماؤس فیلاڈلفوس جب تخت نشین ہوا تو اس نے علمی کتابوں کی تفتیش شروع کی اور اس مہم پر ایک خاص شخص ذمیرہ نامی کو مامور کیا۔ اس نے اس کے لئے کتابیں فراہم کیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد چون ہزار ایک سو بیس تھی۔ اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ ابھی ہند، سند، ایران، جرجان، ارمان، بابل، موصل، اور روم میں بیشمار نوادر کا ذخیرہ رہ گیا ہے۔" بعینہٖ یہی عبارت ابن القفطی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن القفطی نے کتبخانہ اسکندریہ کے قیام کا ذکر اسحاق راہب کی کتاب سے لیا ہے۔ اور اس کے جلنے کا واقعہ کسی اور سے۔"

لیکن "الفہرست" کی اس عبارت سے تو کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ عمرو ابن العاصؓ نے کتبخانہ اسکندریہ جلایا تھا۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ محض یہ ہے کہ اسحاق راہب کے نزدیک خاندان بطالسہ نے کتبخانہ اسکندریہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ سو یہ ہر شخص کو تسلیم ہے۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ کتبخانہ کے جلانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس مسئلہ کو ابن الندیم نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ اور نہ اسحاق راہب نے اس سے کچھ تعرض کیا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم بھی کرلیں کہ صرف ظواہر کو تاریخی تحقیقات میں دلیل راہ بنایا جا سکتا ہے، جب بھی جرجی زیدان سے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جو یہ کہکر آگے بڑھ گیا ہے کہ "ابن القفطی نے کتبخانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی روایت کسی اور سے لی ہے"۔ ہم پوچھتے ہیں یہ "کسی اور سے" کیا بلا ہے؟ اس کو کیسے معلوم کہ اس نے یہ روایت کسی اور سے لی ہے؟ اور وہ "کسی اور" کون ہے؟

عربوں نے دنیا کے گوشہ گوشہ سے کتابیں جمع کیں۔ ان کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور پھر علم و تحقیق کی روشنی سے پوری دنیا کو منور کر دیا۔ کیا ان عربوں کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ علم وفن کے

تھے۔ وہ دشمن تھے کہ جہاں کہیں بھی پاتے ان کو جلا دیتے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عمرو ابن العاصؓ نے حکام مصر کے لیے جو دستورالعمل بنایا تھا اس کے شروع میں یہ عبارت درج تھی۔

انما اعطیناھم العھد علی ان نخلی	ہم نے ان (غیر مسلموں) سے عہد کیا ہے کہ ہم ان کے
بینھم وبین کنائسھم	گرجا وں کے معاملہ میں کوئی مداخلت نہ کریں گے وہ
یقولون فیھا ما یشاؤن وان لا	ان میں جو چاہیں کریں، اور ہم ان پر ان کی طاقت
نحملھم ما لا یطیقون وان لا نحول	سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں گے اور ہم ان کے قوانین
بینھم وبین احکامھم	کے باب میں بھی ان کو آزاد چھوڑ دیں گے مگر یہ کہ وہ
الا ان یاتونا راضین فنحکم	از خود رضی خوشی اپنے معاملات ہمارے پاس لائیں
بینھم	ایسی صورت میں ہم ان کے معاملہ کو چکا دیں گے۔

کیا کسی طرح یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ جنھوں نے دوسرے مذہب والوں کو ان کے عقائد، ان کے خیالات، ان کے احکامات اور ان کے گرجوں کے بارہ میں یہ آزادی دی ہو وہی لوگ ان کے کتبخانوں اور ان کے علوم وفنون کی یادگاروں کو اس بے دردی کے ساتھ برباد کر دیں گے!

اخیر میں یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے مفتوح قوم کو گیارہ مہینے کی مہلت دی کہ وہ اس اثنا میں اپنا جتنا مال ومتاع اور اپنی جتنی چیزیں اسکندریہ سے لے جاکر کہیں محفوظ کرنا چاہے محفوظ کرلے اور اس پوری مدت میں سمندر کا راستہ ان کے لئے کھلا رہا اور ان کی آمدورفت پر کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر بفرض محال اگر کتبخانہ اسکندریہ کا اس وقت کوئی وجود تھا تو کیا رومیوں نے اتنا اچھا موقع پانے کے باوجود کتبخانہ کی کتابیں کہیں منتقل نہ کر دی ہوں گی۔

پھر معاملہ کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے کتبخانہ کو اس خوف سے

جلانا چاہا کہ مبادا اس کا زہر مسلمانوں کے دین و ایمان کو خراب کر دے تو اس کا یہ کیا طریقہ تھا کہ کتبخانہ کی کتابیں حماموں میں تقسیم کر دی جائیں کہ ان کے جلنے میں چھ مہینے کی وسیع مدت صرف ہو کسی فتنہ کے مٹانے کا یہ تو کوئی محتاط اور کامیاب طریقہ نہ ہوا۔ وہیں کتبخانہ کے اندر یا کسی اور جگہ تمام ذخیرہ کو جمع کر کے آگ لگا دیتے، قصہ پاک تھا۔ نہ چھ ماہ کی وسیع مدت صرف ہوتی اور نہ ایک کتاب کسی کے ہاتھ لگ سکتی۔ حضرت عمرو بن العاص نے جو شکل اختیار کی اس میں تو نہ جانے کتنی کتابیں چوری گئی ہوں گی حالانکہ یہ بات ان کے مدعا کے بالکل خلاف تھی۔

مذکورہ بالا باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابن القفطی کی روایت ایک کذب صریح ہے۔ یا تو خود اس نے یہ روایت گڑھ لی ہے یا کسی سے بلا تحقیق نقل کر دی ہے۔ اور اس کذب بیانی کی تہ میں کوئی سیاسی مقصد تھا۔ بعد میں لوگ بلا تحقیق اس کو نقل کرتے رہے۔ مگر آج جب کہ علم و تحقیق کی روشنی میں اس روایت کے اصلی خط و خال سامنے آ گئے ہیں اس کو قبول کرنا انتہائی جہل و سفاہت ہے۔

آخر میں ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں عصر جدید کے بعض مشہور مغربی مورخین کی رائیں درج کرتے ہیں۔ مسلمان مورخین کی رایوں سے اس لئے اغماض کرتے ہیں کہ ان پر جماعتی جنبہ داری کی بدگمانی کی جا سکتی ہے۔

مشہور مورخ لوکلیر نے فرانس کے مجلہ علمیہ میں ایک جگہ لکھا تھا۔

"عربوں کے مصر فتح کرنے کے وقت کتبخانہ اسکندریہ کا وجود ہی نہیں تھا۔ پس اس کے جلانے کا الزام عربوں پر عاید کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

"ابو الفرج ملطی نے کتبخانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی نسبت جو عربوں کی طرف کی ہے۔ یہ محض افترا پردازی اور بہتان ہے۔ عربوں کی فتح سے بہت پہلے کتبخانے پر جو آفتیں اور تباہیاں

پڑے رہنے نازل ہوتی رہیں۔ ان کے بعد کوئی قابل لحاظ چیز اس میں باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اور کوئی چیز رہ گئی تھی تو ۳۸۹ء میں پادری تھیافلس نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے اس کو بھی جلا ڈالا تھا"

انسائیکلوپیڈیا میں عمرو بن العاصؓ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے۔

"عمرو بن العاصؓ بہت ہی مہذب اور عقلمند آدمی تھے۔ ان کی طرف یہ بات بالکل جھوٹ نسبت کیجاتی ہے کہ انھوں نے کتبخانہ اسکندریہ کو جلا دیا۔ ان سے بہت پہلے وہ مسیحیوں کی دست برد کے نذر ہو چکا ہے۔"

اسی انسائیکلوپیڈیا میں اسکندریہ کے تذکرہ کے ضمن میں مشہور مورخ ڈوناہیل کے قلم سے یہ عبارت ہے۔

"۴۸ ق م میں جب یولیوس قیصر نے اہل اسکندریہ کے بیڑے میں، جو اس وقت بندرگاہ پر لنگر انداز تھا، آگ لگائی، تو کتبخانہ اسکندریہ بھی اسی آگ کی نذر ہو گیا۔"

ڈاکٹر گستاولی بان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے۔

"کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام عمرؓ پر لگایا جاتا ہے، اس کی بابت میں اسی قدر کہونگا کہ اس قسم کا وحشیانہ فعل عربوں کے اوضاع و عادات کے اسقدر خلاف تھا کہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قسم کی نقل کیونکر اتنے دنوں تک رائج رہے اور قبول کیجائے، ہمارے زمانہ میں اس واقعہ کی تردید ایسے عمدہ طور پر ہوگئی ہے کہ اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، نہایت آسانی کے ساتھ اور بہت ہی صاف اور صریح حوالوں کے ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے کہ عربوں کی فتح سے بہت پہلے خود عیسائیوں نے اسکندریہ کے بت پرستوں کے کتبخانہ کو اسی اہتمام کے ساتھ برباد کردیا تھا جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے ان کی مورتیں توڑ ڈالی تھیں۔ اور اسی وجہ سے عربوں کے زمانہ میں کتابیں باقی ہی نہ تھیں جو جلائی جاتیں"

مشہور انگریز مورخ مسٹر آلفرڈ بٹلر نے اپنی تصنیف "فتح العرب لمصر" میں، کتبخانہ اسکندریہ سے متعلق ایک لمبی چوڑی بحث لکھی ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے۔

"اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ عربوں کے اسکندریہ فتح کرنے کے وقت کتبخانہ اسکندریہ موجود تھا

جب بھی یہ قیاس میں نہیں آسکتا کہ اس کو عربوں نے برباد کیا ہو۔ کیونکہ عرب فتح کرنیکے بعد پورے گیارہ مہینے کے بعد اسکندریہ میں داخل ہوئے تھے اور اس صلحنامہ کی رو سے جو عمرو بن العاصؓ اور رومیوں کے درمیان طے پایا تھا، رومیوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مدت میں وہ جب چاہیں شہر چھوڑ کر چلے جائیں اور اپنے ساتھ جتنی چیزیں لیجانا چاہیں لے جائیں۔ اس پوری مدت تک تمام بحری راستے روم۔ لیکر قسطنطنیہ وغیرہ تک بالکل کھلے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت کتبخانہ موجود تھا تو ضرور ہے کہ رومیوں نے اس مدت میں کتابیں منتقل کردی ہوں گی۔ اس لئے کہ علوم و معارف کا اتنا بیش بہا ذخیرہ وہ آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

عربوں نے اپنی فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد قدیم کتابوں کو جہاں کہیں مل سکیں جمع کرایا۔ اور اکثر کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا ۔ درحقیقت ایسا کرکے انھوں نے ایسی مثال قائم کردی جو موجودہ دور کے فاتحین کے لئے لائق تقلید بن سکتی ہے۔ پھر ان عربوں کے بارہ میں یہ کہدینا آسان نہیں کہ وہ اتنے وحشی تھے کہ علوم و معارف کے خزانے اُن کے برباد کردینے میں انھیں کوئی جھجھک نہ ہوئی۔

ان دلائل کے بیان سے ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا!

(تلخیص)

موعظۂ حسنہ

بنیادی رذائل

از جناب مولوی عزیز الرحمن صاحب اصلاحی

یہ مضمون عہد حاضر کے مشہور ماہر اخلاقیات (Edovard charpentier) کی ایک تازہ تصنیف سے ماخوذ ہے۔ اور ہم نے اسکو الہلال مصر سے اقتباس کیا ہے (عزیز)

عہد حاضر کا انسان اپنی عقل کی ترقی و تربیت میں بڑی سرگرمی سے مشغول ہے۔ علوم کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر لینے کے لئے تگ و دو کر رہا ہے، لیکن روحانی تربیت و اصلاح سے نہ اسے کوئی دلچسپی ہے۔ اور نہ اس راہ میں کوئی ذوق بادیہ پیمائی۔

عقلی تربیت میں نفع ہے۔ دولت جمع ہوتی ہے سماج کو مادی قوت پہنچتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ بڑی بڑی خواہشوں کی تکمیل کی راہ باز ہوتی ہے اس لئے اس کی طرف لوگوں کا رجحان ہے روحانی ترقی اس قسم کے مادی منافع سے منزہ ہے۔ اس کی تمام ترقیاں خود اسی کے اندر پوشیدہ ہیں پس ایسے نادیدہ معشوق کے عشق میں کون سر کھپائے!

عہد حاضر نے دلوں میں مادی منافع کیلئے کشش کی ایک آگ اس طرح مشتعل کر دی ہے کہ روحانی ترقی کے تمام ولولے دب گئے ہیں اور عقل و جذبات کے درمیان ایسی پھوٹ پڑ گئی ہے کہ وہ ذہنی وحدت بالکل پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ جو انسان کے اٹھان کیلئے اصلی نیو تھی۔

موجودہ صنعتی تہذیب نے تعیش کے سامانوں کو پھیلایا۔ ارزان مصنوعات کو رواج ہوا۔

اور علم کی فرمانروائی عالمگیر ہوئی۔ اس وقت سے انسان کی طبیعت پر نفع پرستی غالب ہوگئی ہے۔ مذہبی ایمان رخصت ہوگیا ہے۔ اب علم ہر شخص کا معبود ہے۔ نفع قبلہ و کعبہ ہے اور مصلحت اوڑھنا بچھونا۔

لوگوں کے جذبات خراب ہوگئے ہیں، مذاق بگڑ گئے ہیں اور دل مردہ ہوگئے ہیں۔ مصلحین کو یہ خیال ہے کہ آرٹ مذہب کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔ اور فنی تہذیب، جو حسن، صداقت اور نیکی کے عناصر سے مرکب ہے۔ تہذیب نفس اور اصلاح روح کے لئے بھی بالکل کافی ہے۔

لیکن ہمارے آرٹ پر خود اس وقت شیطان کا قبضہ ہے۔ جس سے وہ نہایت پست اور رذیل ہوگیا ہے، وہ ہماری عقل اور دل کے لئے کوئی بلند نمونہ پیش کرنے کے بجائے، صرف حسن ظاہر کی عبادت اور پرستش میں مصروف ہے۔

اس چیز نے ہمارے موجودہ مصلحین کی خام خیالی بالکل واضح کردی ہے اور یہ بات روشن ہوگئی کہ انسان کی ترقی جو عقل کی راہ سے ہوتی ہے اس ترقی سے بالکل مختلف ہے جو جذبات و عواطف کی رہنمائی سے ہوتی ہے۔

عقل انسانی اور جذبات انسانی کے درمیان اعتدال پیدا کرنے کی کیا صورت ہے؟ اور انسان کے فکر و عمل کو ہم آہنگ کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ ان بنیادی رذائل کا استیصال کیا جائے جو جذبات کی صحیح نشو و نما میں بالکل اسی طرح رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جس طرح تعصب اور ہٹ دھرمی عقلی ترقی میں۔

اگر حکومتیں نفسی رذائل کی تباہ کاریوں کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو ماہرین تربیت کو اس پر غور و بحث کی دعوت دیتیں۔ ان سے اس موضوع پر چھوٹی چھوٹی عام فہم کتابیں لکھوا کر طلبہ میں تقسیم کرتیں۔ ان کو مدرسوں کے نصابوں میں لازمی جزو کی حیثیت سے داخل کرتیں۔

ہم ذیل میں بالاختصار ان بنیادی رذائل کو بیان کرتے ہیں جو ہر انسان کے اندر، خواہ وہ

جو دنوں کے نفس ہی بلند مرتبہ پر پہنچ گیا ہو چھپے ہوئے ہیں اور جن کی سرکشی و بغاوت سے اسے اکثر شکوہ سنج ہونا پڑتا ہے۔

حرص | حرص فضیلت ہے، لیکن بخل بدترین رذالت۔

ذلیل، کمینہ، حریص اور زمانہ ساز ہوتا ہے۔ بخیل، ذلیل، دنی الطبع اور بندۂ زر ہوتا ہے۔

وہ اس تنگ نظر جذبہ میں عقل و جذبات کی تمام بہترین قوتیں برباد کر دیتا ہے۔

بخیل اپنی ضرورت کے رفع کرنے کے لئے روپیہ جمع نہیں کرتا۔ بلکہ جمع کرنے کے لئے جمع کرتا ہے۔ وہ ایک ایک روپیہ گنتا ہے، چھپا چھپا کر رکھتا ہے، دوسروں کی نگاہوں سے بچاتا ہے کہ مبادا اس پر کسی کی نظر پڑ جائے

ایک مرد اپنی بیوی کے معاملہ میں جتنا غیور ہوتا ہے، بخیل اپنی دولت کے باب میں اس سے زیادہ غیور ہوتا ہے۔ وہ فقر و تنگ دستی کی تمام مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن روپیہ جمع کرتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ اس کی دولت اس کے کام نہ آئے گی، اس کے بعد وہ ورثہ میں تقسیم ہو جائے گی۔ تاہم اضافہ کی سعی اور حفاظت کی سرگرمی میں اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ وہی مجنونانہ خود فراموشی باقی رہتی ہے۔ وہ اس راہ میں خونخوار بھیڑیوں کی طرح دوڑتا ہے۔ اگر اس کو شبہ بھی ہو جائے کہ کوئی اس کی دولت کی فکر میں اس کے پاس آیا ہے تو اس کو بے دھڑک پھاڑ کھائے۔ وہ اپنے دشمن سے انگیز کر سکتا ہے مگر اپنی دولت کے طالب کو ایک لمحہ کے لئے معاف نہیں کر سکتا۔

مولیر نے اپنے ڈرامہ میں بخیل کی ایسی بھیانک تصویر کھینچی ہے کہ اس کو دیکھکر آدمی ڈر جائے۔

بخل کی رذالت سے اور دوسری رذالتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جو ...... اس سے کم ذلیل و خطرناک نہیں ہیں۔ بخیل ہر اس عمدہ عادت، فیاضانہ جذبہ اور شریفانہ عمل کا دشمن ہوتا ہے جو آدمی کو انکار ذات پر ابھارتا ہے۔ یہ وسیع دنیا باہمہ وسعت اس کی نظروں میں بس ایک نقطہ کے

اندر سمٹ جاتی ہے، نہ وہ اس دائرہ سے کبھی قدم باہر نکالتا، ورنہ، خواہ کتنی ہی اعتدال کے ساتھ سہی، اس دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بخیل جیتا تو ہے، لیکن بالکل مردہ! اس کی نظروں میں زندگی نہایت گھٹائی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ سمٹ سمٹا کر بس ایک سلبی لذت کے دائرہ میں بند ہو جاتی ہے۔ جس سے نہ کوئی فائدہ نہ جس کی کوئی ضرورت!

لیکن بخیل کو قائل کرنے کے لئے اور اس کی غلطی سوجھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسکو نہایت اچھے انداز سے سمجھائیں۔ مال سے اس کو جو عشق ہے اس کی قدر کریں اور پھر اس کو یہ بتائیں کہ زندگی کی لذتوں سے فائدہ اٹھانا، عمدہ کاموں میں دولت کو خرچ کرنا اور خانگی و قومی فرائض کو ادا کرنا، ایسی باتیں ہیں جو حرص اور حفاظت دولت کی خواہش کے ساتھ بھی نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہیں۔ بغیر اس کے کہ اس کے اس اندوختہ کو جو اس نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد جمع کیا ہے، کوئی نقصان پہنچے وہ زندگی کی قدر وقیمت پہچان سکتا ہے۔ اور آدمیوں کی صف میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کے نفس کی تہذیب و تربیت اور اس کی عقلی سطح کے بلند کرنے کی کوشش کی جائے اور ان تمام مصیبتوں کی طرف توجہ دلائی جائے جو اس کے بخل کی وجہ سے اس کے قریبوں اور متعلقین کو پہنچ رہی ہیں۔

غصہ انسان اکثر اپنا حق اس وقت ضائع کر دیتا ہے جب اس پر غصہ غالب آتا ہے۔ جلد غصہ ہو جانا، عصبی کمزوری، کند ذہنی اور نفس پرستی کی دلیل ہے۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ بردبار ہمیشہ فائدہ میں رہتا ہے۔ اور سریع الغضب خسارہ میں۔ کیونکہ عموماً غصہ ور کا غصہ اس شخص کی توہین کا باعث خیال کیا جاتا ہے جس سے وہ بات کر رہا ہے اور بردباری

گفتگو اخلاق اور عقلی برتری کی حامل خیال کی جاتی ہے۔ خواہ اسمیں مکر و فریب کے کتنے ہی داؤ پیچ چھپے ہوئے ہوں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمہارا کوئی محبوب دوست تم سے کوئی بات کہتا ہے، اس کا مقصد سراسر تمہاری خیر خواہی ہوتا ہے۔ لیکن بات بیان کرنے کی وجہ سے وہ غصہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اپنی خواہش کے بالکل خلاف تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تمہارے دل میں اس سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ برعکس اس کے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمہارا دشمن تم سے کوئی بات کرتا ہے۔ اس کی گفتگو میں سنجیدگی اور متانت ہوتی ہے اس وقت تم محسوس کرتے ہو کہ بجائے اس کے تمہارے دل میں محبت کی ایک گدگدی سی پیدا ہو گئی ہے اور تم کو اس عجیب احساس پر حیرت ہوتی ہے۔

غصہ ور شخص اور اپنے ساتھ دوسروں کے فوائد کا دشمن ہوتا ہے۔ اور بردبار بقدر اس کے غصہ کے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پھر ایک خفی استہزا یا ایک لطیف تبسم کیساتھ اسکو رخصت کر دیتا ہے، جو لوگ سریع الاشتعال ہوتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اپنے حق کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اور اپنے احباب اور دوستوں کو کھو دیتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کی نظروں میں اپنا وقار بھی کھو دیتے ہیں۔ غصہ کا ہیجان انسان کے ذہنی معیار کو پست اور اس کے چہرے کو مسخ کر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسکو ایک مضحکہ بنا دیتا ہے۔ لوگ اس پر حقارت سے ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

غصہ کا علاج یہ ہے کہ پہلے اعصاب، معدہ، اور بدن کی اصلاح کی جائے۔ اس کے بعد ضبط نفس کی مشق کے ذریعہ غصہ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جذبات اور ان ہیجانات کو روکا جائے جن کو حواس ابھارتے ہیں اور بغیر کافی سوچے ہوئے جھٹ زبان پر آجاتے ہیں۔

دولیر جب کبھی محسوس کرتا کہ غصہ سے مغلوب ہو رہا ہے تو تھوڑی دیر تک کے لئے سر جھکا لیتا اور ہونٹوں کو چباتا رہتا۔ پھر جب مخاطب کی طرف متوجہ ہوتا تو مسکراتا ہوا۔

نپولین کو جب غصہ آتا تو پورے کمرے کا بار بار چکر لگاتا اور کھاتا پیتا یہاں تک کہ طبیعت کو سکون ہو جاتا۔
جان جاک روسو کو غصہ آتا تو دفعۃً غائب ہو جاتا۔ اور دیر تک اپنے باغ میں ٹہلتا یہاں تک کہ
جب اعصاب کو سکون ہو جاتا تو وہاں سے ہنستا ہوا واپس آتا اور ملنے والوں سے حسب معمول دلچسپی
سے باتیں شروع کر دیتا۔

ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کی ریاضتیں غصہ کا بہترین علاج ہیں۔

کسل کسل انسانی طبیعت کی ایک عام برائی ہے۔ اس لئے کہ زندگی خوبصورت اور مختصر ہے
اور اس کی نو بہ نو لذتیں آرام طلبی، تعیش اور بے عملی کی دعوت دیتی ہیں۔

کاہل بالعموم لذت پرست ہوتا ہے اگرچہ وہ لذت خیالی، وہمی اور ایک خواب ہی کی
طرح کیوں نہ ہو۔ وہ ہر دم راحت کا طالب ہوتا ہے کیونکہ یہ خواہش بجائے خود لذیذ ہوتی ہے۔
وہ ہر دم حب ذات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کا احساس اور عقل بالکل کمزور، شیخ چلی کے سے منصوبوں
میں مست، موہوم امیدوں کے خیال میں مگن۔ اس کی زندگی ترک و تیاگ کی ایک مردنی ہوتی ہے۔
آج کا کام ہمیشہ کل پر ٹالتا ہے۔ عمل اور حرکت کے خیال سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح سگ گزیدہ
پانی سے۔ اور اپنی ان تمام نالائقیوں کے جواز کے لئے ایک فلسفیانہ کلیہ بھی تراش لیتا ہے۔ کہ زندگی باطل
چیز ہے۔ یہ محنت و کاوش کی سزاوار نہیں ہے۔

کاہل لیتا ہے لیکن دینا نہیں جانتا۔ وہ ہر چیز کا آرزومند ہوتا ہے لیکن اپنے قویٰ کی شمہ برابر بھی
طاقت خرچ کرنا نہیں چاہتا۔ آہستہ آہستہ جب کاہلی اس کے اندر راسخ ہو جاتی ہے تو اس کی آرزوئیں
اور اس کی خواہشیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور وہ زندگی کے بہت تھوڑے حصہ پر قانع ہو جاتا ہے۔
بشرطیکہ کسی کام کے لئے اس کو اپنے قویٰ اور اعصاب کو زحمت نہ دینی پڑے۔
جب یہ خرابیاں اس پر قابو حاصل کر لیتی ہیں، وہ ایک ناکارہ عضو بن کے رہ جاتا ہے۔

اپنے اہل و عیال اور سوسائٹی پر بار ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طفیلی گھاس کی ہوتی ہے جو دوسرے پودوں کے رس کو چوس کر غذا حاصل کرتی ہے۔

اس مہلک بیماری پر نہایت سختی سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بیماری متعدی ہے۔ کاہل کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اس کو اس وقت تک عیش کی لذت اور بیوقوفی کی بہشت کا پورا مزہ نہیں آتا جب تک دوسروں کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ نہیں لیتا اور اپنے جیسے نکھٹوؤں کا ایک پورا گروہ نہیں بنا لیتا۔ وہ اپنے جراثیم دوستوں میں پھیلاتا ہے تاکہ اپنی کاہلی کے لئے ایک سند جواز پیدا کرے۔ اور خوش گپ کے لئے ایک طائفہ قائم کر کے دل کے حوصلے نکالے۔

کاہل کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کو اپنے تن بدن کی صفائی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ گویا تمام خوبیوں کے ساتھ اس میں گندگی کا احساس بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ غسل کو ایک زحمت لاطائل اور اضاعت وقت سمجھتا ہے۔

ہاں، لغو اس کا رسیا ہوتا ہے۔ اپنے قیمتی اوقات فضول گوئی، اور کمیروں پر نکتہ چینی میں برباد کرتا ہے۔ الغرض کاہلی ایک ایسی برائی ہے جو فرد کو جماعت سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ انسانیت سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن سے تبدیلی و ترقی کی استعداد سلب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں کی ترقی اور نشو و نما کی راہ میں روک بن جاتا ہے۔

کاہل کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس کو کاہلی کے اسباب سے دور رکھا جائے۔ اس کو کمیروں کی جماعت میں شریک کیا جائے۔ بعض ورزشوں کی مشق کرائی جائے۔ اس کے سامنے ایک واضح راہ اور ایک متعین مقصد رکھا جائے۔ مشاہیر کے حالات کے مطالعہ کا شوق دلایا جائے۔ اور یہ داروئے شفا کافی مقدار میں پلایا جائے۔

حق یہ ہے کہ مشاہیر کی زندگی، جو صبر، اخلاق، برداشت اور قربانی کی حامل ہوتی ہے عملی

سرگرمی اور ترقی کے لئے بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔

زنا | زنا محض برائی نہیں بلکہ ایک سنگین جرم بھی ہے۔ یوں کہئے کہ ایسی برائی ہے جو بغیر جرم کے وجود میں نہیں آتی۔

زنا کی برائی کس طرح پیدا ہوتی ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟

شریر اور بدچلن آدمی وہ تمام باتیں کرنے کا شائق ہوتا ہے جو ناجائز ہوتی ہیں۔ اس کا بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ممنوع چیز لذیذ ہے اور ناجائز لذت سے بڑھکر کوئی لذت نہیں۔ پس اس دنیا کی سیر ضروری ہے۔

یہی خیالی فتنہ جو ناجائز لذت کے اندر پوشیدہ ہے ایک مرد کو دوسرے مرد کی بیوی یا ایک عورت کو دوسری عورت کے شوہر کی جانب کھینچتا ہے اور ایک آزاد و خود باختہ نوجوان کو غیر شرعی طریقے سے جسمانی لذات سے متمتع ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔

اس بری خواہش کے پیدا ہونے کے دو سبب بنیادی ہیں اور پھر ان سے بہت سے دوسرے ضمنی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں

(۱) سوء تربیت، جس سے بچپن ہی میں آوارگی، بدچلنی اور بے حیائی کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) شادی، اور اجتماعی و اقتصادی ذمہ داریوں سے آزاد رہنے کی خواہش۔

زانی دوسرے کے دسترخوان کے چٹخاروں سے شاد کام ہونے کا آرزومند ہوتا ہے۔ خود اہتمام و انتظام کا درد سر خریدنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی جوانی، اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو مدفون کرنا نہیں پسند کرتا۔ اور یقیناً اس اعتبار سے وہ سوسائٹی کے اندر، ایک بدترین چور ہے۔

یہ برائی جب کسی انسان میں پیدا ہو جاتی ہے، تو اس کے جلو میں بہت سی برائیاں آتی ہیں: جھوٹ، نفاق، خبث، دغا، فضائل کی تحقیر، معاشرت کا استخفاف، قوانین کی نافرمانی، عام رواج

مخالفت، سوسائٹی کے رسوم جنگ۔ یہ تمام برائیاں زنا میں آپ سے آپ پیدا ہوتی ہیں۔

زنا کی آخری منزل اباحیت ہے۔ اور اباحیت عقل انسانی کا دیباچہ، تباہی کا سرچشمہ اور موت کا دروازہ ہے۔ یہ سوسائٹی کے جسم کو بالکل کھوکھلا کر کے موت کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔

یہی سبب ہے زانی ڈاکو اور قاتل کی طرح جماعت کا دشمن ہے۔ بلکہ وہ ڈاکو اور قاتل سے بھی زیادہ خطرناک عنصر ہے۔ قوم اور افراد کی زندگی پر وہ نہایت تباہ کن اثر ڈالتا ہے۔ وہ صرف لوگوں کی عزت و آبرو کو نہیں غارت کرتا۔ بلکہ ان کے شرف، انکی شہرت، انکے اطمینان، ان کے نام اور ان کے دینی و اخلاقی جوہر پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

اگر زانی کو معلوم ہو جائے کہ جائز لذت ناجائز لذت سے زیادہ پاکیزہ ہے تو ناجائز کی طرف نہ لپکے گا۔ اس برائی کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ شادیوں میں آسانیاں پیدا کی جائیں اور اس راہ میں جو اقتصادی دشواریاں حائل ہیں ان کو دور کیا جائے۔

سچ یہ ہے کہ اس زمانہ میں شادی کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں ہیں جن کی وجہ سے شادی کرنے والوں کو بے شمار زحمتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم یہ رکاوٹیں دور کر دیں، اور نوجوانوں کے دلوں میں پاکیزہ جذبہ غیرت پیدا کرنے کی کوشش کریں تو امید ہے کہ اس برائی کے بہت سے امکانات کا سد باب ہو جائے گا۔ اور لوگ ایک غلط راہ پر چلکر ٹھوکریں کھانے کے بجائے نہایت آسانی سے فطرت اور انسانیت کی مقرر کی ہوئی سیدھی راہ پر آجائیں گے۔

حکمت غرب

مارکس ایریلیس کے خیالات

(۴)

از جناب مولوی میاں محمد عبدالحبیب صدیقی ایم اے

ہپوکریٹز (Hippocrates) نے بہتوں کے دکھ درد کی دوا کی لیکن اپنے درد کی دوا نہ کرسکا اور چل بسا۔ اہل کالڈیہ اکثر لوگوں کی موت کی پیشنگوئی کیا کرتے تھے لیکن بالآخر ان کو بھی فیصلۂ تقدیر کے آگے سرنگوں ہونا پڑا۔ سکندر اعظم، پامپی، سیزر نے بہت سے شہر خاک میں ملائے میدان کارزار میں لاکھوں سوار اور پیدل نذر تیغ کردیئے لیکن بالآخر وہ بھی چل بسے ہیرا کلیٹس (Heraclitus) جو آشوب عالم پر اکثر و بیشتر حکیمانہ خطبات دیا کرتا تھا، با دیدۂ پرنم گہوارہ خس و خاشاک میں موت سے ہم آغوش ہوا۔ کیڑوں نے ڈیموکرائٹس (Democritus) کو کھا ڈالا۔ دوسرے قسم کے کیڑوں نے سقراط کا خاتمہ کیا۔ ان سے کیا سبق ملتا ہے؟ تیرا سفر شروع ہوا۔ تو نے سمندر کو عبور کرلیا۔ اور ساحل پر پہنچ گیا۔ اب کشتی سے خشکی پر آنیکا وقت آگیا ہے۔ اگر تیری جائے پناہ ایک اور زندگی ہونیوالی ہے تو بہت اچھا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی خدا موجود ہوگا۔ اور اگر یہ نئی زندگی محض فراموشی ہوگی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ تو مسرت و غم کے بارسے تو اپنے کو سبکدوش کرسکیگا۔ اور اس دنیاوی کشتی کی غلامی سے تو آزاد ہو جائے گا؟ (یہ آقا (دنیا) اپنے غلام (انسان) سے کہیں زیادہ حقیر ہے کیونکہ غلام عقل و الوہیت کا حامل ہے۔ اور آقا فانی اور گہوارۂ لہو و لعب ہے۔

دوسروں کے پیچھے نیت مستعار کا بقیہ حصہ مت ضائع کر۔ اس کا صحیح مصرف صرف یہی کہ ہر وقت سامنے خدا ناظر و حاضر ہو۔ کسی کے عمل، علت عمل، اس کے بیان، خیال اور منصوبے اور ان تمام لغو خیالات کی وجہ سے، جو ہم کو اپنی باطنی شمع ہدایت کی رہنمائی سے محروم کر سکتے ہیں، تجھکو تفتیش نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح تو اپنے کار منصبی سے کیوں غافل ہو۔ اپنے سلسلہ خیالات کو بیکار باتوں، بالخصوص تجسس اور کینہ و حسد سے احتراز کرنا تیرا فرض ہے۔ تیرا یہ بھی فرض ہے کہ تو اپنی تربیت نفس کا سلسلہ جاری رکھے تاآنکہ تیرے تمام خیالات ایسے مزین ہو جائیں کہ اگر کوئی تجھسے فوراً یہ سوال کر بیٹھے کہ تو کیا سوچ رہا ہے تو تو بے دھڑک بدون اخفاء راز اظہار حال کر دے۔ اور اس بات کو روز روشن کی طرح واضح کر دے کہ تو صرف سادگی اور لطف و کرم کا حامل ہے۔ جو زندہ مخلوق کے ایک فرد کے شایان شان ہے۔ تو ایک ایسا انسان ہے جو عام شوق لہو و لعب یا عیش و نشاط کے ولولوں کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ اور نہ مباحثہ و مجادلہ، حسد اور رشک یا اسی طرح کی ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے جن کے اقرار سے تجھے خجالت اٹھانی پڑے۔

ایسا انسان جو انتہائی فضیلت حاصل کرنے کے لئے اپنی جد و جہد کبھی ملتوی نہیں کرتا۔ وہ دیوتاؤں کا خادم اور پروہت ہوتا ہے[۵]۔ وہاں اپنی باطنی الوہیت کو بہتر مصرف میں لاتا ہے۔ یہ چیز اس کو لہو و لعب کی آلودگی سے پاک، درد دکھ کے بارے سبکدوش، شوخی و گستاخی سے غیر متاثر اور برائیوں سے بے خبر و بے نیاز رکھتی ہے۔ اور اس کو اہم ترین قسم کا ایسا مرد میدان بنا دیتی ہے کہ وہ کبھی جذبات و درد نا انصافی سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ وہ قلبی مسرت کے ساتھ ہر مصلحت الٰہی

---

۵ الاصلاح: یہ تعجب کہ یہ عظیم الشان حکیم بھی دیوتاؤں کا ذکر اتنی بے تکلفی سے کرتا ہے اور افسوس ہے کہ یہ پستی قوم یونان کے تمام حکماء کے اندر موجود ہے۔ سقراط، افلاطون وغیرہ تک اس نجاست سے آلودہ نظر آتے ہیں۔ ومن لم یجعل اللہ له نورا فما له من نور۔

کا نیز مقوم کرتا ہے۔ بجز اس صورت کے کہ کسی سخت مجبوری یا عافیت عامہ کا تقاضا ہوا وہ کبھی دوسروں کے قول و عمل یا خیالات کو قابل توجہ نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس کو اپنے ہی فرض کی بجا آوری کی فکر سے فرصت نہیں ملتی۔ اس کی توجہ صرف اس جزو پر ہوتی ہے جو کل سے اس کے حصہ میں آتا ہے جن چیزوں کا تعلق اس سے ہوتا ہے وہ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے اور نوشتہ تقدیر کی خوبی پر اپنے کو راضی رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کا نوشتہ تقدیر جو اس کے ساتھ دنیا میں لایا جاتا ہے وہ ایک جزو ہے جو کل کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے۔

ایسا شخص یہ بھی یاد رکھتا ہے کہ تمام ذی عقل مخلوق (عالم) ایک رشتۂ نسبی میں منسلک ہے اور یہ کہ اگرچہ انسانی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ انسان تمام بنی نوع انسان کی باتوں کا لحاظ رکھے تاہم وہ اپنا فرض صرف یہ سمجھتا ہے کہ سب کی نہیں بلکہ صرف ایسے لوگوں رائے قبول کرے جن کی زندگی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ اور ایسا شخص ان لوگوں کی سیرت اور اطوار سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہے جنکا طرز زندگی اس کے خلاف ہوتا ہے، وہ ان کے ان کھلے چھپے اعمال سے بھی ہوشیار رہتا ہے جو خلوت یا جلوت میں انجام پاتے ہیں۔ اور ان کے ان ہم مشرب رفقاء سے بھی جو ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتے ہیں اس اصول کی روشنی میں وہ اپنا وقت ان لوگوں کی تعریف و تحسین میں ضائع نہیں کرتا جو خود اپنے ہی کو مطمئن نہیں کرسکے۔

تیرا عمل اضطراری، خود غرضانہ، غور و فکر سے خالی اور مذبذب نہ ہونا چاہیئے۔ اپنے خیالات کو شوکت الفاظ سے مزین و مرصع کرنے کی کوشش مت کر۔ تو صاف گو اور صاف معاملہ بن جا۔ اس بات کی فکر رکھ کہ تیرا باطنی وصف یزدانی ایک ایسے جری انسان کا نگراں و

سرپرست ہے۔ جو صنیف العمر و مدبر ہے۔ روم کا باشندہ اور تاجدار ہے۔ زندہ ایک سپاہی کی مانند اپنی جگہ پر کارمنصبی میں مشغول اور واپسی کے بگل کی آواز پر کان لگائے بالکل مستعد و منتظر ہے کہ اس آواز کے سنتے ہی پیچھے قدم ہٹائے۔ اس کو کسی شخص کی حلف یا شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ قصہ مختصر خود اپنی اصلاح کر درست ہو۔ دوسروں کی اصلاح کی فکر میں مت گھل۔

مجھے انسان کی زندگی میں کوئی ایسی شے نظر آتی ہے جو صداقت، انصاف، ترک مشتہیات، و جرأت۔ الغرض ایک ایسے پرسکون دماغ سے افضل تر ہے۔ جس کے باعث تو عین عقل سلیم کے مطابق عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ اور وہ دماغ بغیر تیری مرضی یا رضا کے تیرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ تجھکو اگر اس سے افضل کچھ اور نظر نہیں آتا تو میں کہتا ہوں کہ تو ان چیزوں سے بہتر کچھ اور نہیں دیکھ سکتا۔ تو بدل و جان اس کی طرف رجوع ہو اور وہ جو افضل ترین ہے اس سے تو بدرجہ اتم محظوظ ہو۔

اگر تجھکو کوئی اور شے اس شمع یزدانی سے بہتر نظر نہیں آتی جو تیرے سینہ میں روشن ہے جس کی کارفرمائی تیری تمام تحریکات طبعی پر جاری ہے، جو تیرے ہر خیال کا محاسبہ کرتی ہے، جس نے تجھکو بالفاظ سقراط نفس کے ہر آزار سے رہا کیا ہے، جس نے خدا کی مکمل اطاعت قبول کی ہے، اور بنی نوع انسان کی نگرانی و نگہداشت کا بار اٹھایا ہے ——— اگر ایسا نہیں ہے اور سب کچھ اس وصف یزدانی کے سامنے صریحاً حقیر و پست ہے تو تو کسی ایسی چیز کو اپنے قریب نہ آنے دے جس کی طرف ایک مرتبہ بھی مائل و منحرف ہونے سے تو پھر اس نیکی کو جو تیری اور صرف تیری ہے اپنا خراج اطاعت و عقیدت ہمہ تن نہ پیش کر سکے گا۔ کیونکہ خدا نے منع فرمایا ہے کہ ہر وہ شے جو نامعقول و بیگانہ ہے چاہے وہ اکثریت کی مدح و تحسین ہو یا عہدہ و منصب کی لالچ دولت و ثروت کی طمع ہو یا تعیشات نفسانی کی گیرائی، اس کو متحد الشہری فلاح

بہبود یا اس اعتقاد کے خلاف صف آرا ہونے دیا جائے، جو عین عقل کے مطابق ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ چیزیں ذرا دیر کے لئے اپنے کو بہتر نمونہ کے مطابق بنالیتی ہیں لیکن فوراً ہی وہ ہم پر مستولی اور غالب ہو جاتی ہیں اور ہم ان کے دھارے کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ بہتر شے کا انتخاب پورے دل و جان اور آزادی سے کرو اور اس پر قائم و مضبوط رہو۔ کسی شخص کا قول ہے کہ "بہتر شے مفید ہوتی ہے"۔ اگر یہ مقولہ تیرے عقلی وجود کے لئے مفید ہے تو اس کو مضبوط پکڑ لیکن اگر اس کا مقصد تیری اپنی حیوانی فطرت کی تائید ہے تو اس کو ترک کر اور بدون رعونت اپنے فیصلہ پر قائم رہ اور صرف اس بات کا خیال رکھ کہ تیرا فیصلہ صحیح ثبوت پر مبنی ہے۔

(باقی)

ایک عمدہ عربی ریڈر

امثال آصف الحکیم

از

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی

ہم لوگوں کو عربی کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے کے لئے عرصہ سے ایک عمدہ عربی ریڈر کی تلاش تھی مگر کوئی مناسب ریڈر نہ ملی مصر کے مدارس میں جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں وہ منگوائیں مگر یہاں کے نصاب سے انکا میل نہ ہوا۔ اتفاق سے مولانا کے کاغذات میں دیکھا گیا تو ایک نہایت عمدہ عربی ریڈر مل گئی جو انھوں نے نصاب تعلیم کے لئے تیار کی تھی۔ یہ ریڈر دائرہ نے چھاپ کر شائع کر دی ہے۔ عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کیلئے بہترین چیز ہے۔ اساتذہ و منتظمین دیکھکر انشاءاللہ اس کو پسند کریں گے، مدرسۃ الاصلاح نے اپنے نصاب کے لئے اس کو پسند کر لیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ

قیمت:- ۸/ مینیجر

ادبیات

غزل

از جناب فراق گورکھپوری

یہ کرشمے حسن بتاں کے ہیں نہ یہ شعلے قلب تپاں کے ہیں
کہ فریب وہم و گماں کے ہیں یہ فراق جلوے کہاں کے ہیں

جو اصول سوز نہاں کے ہیں انہیں کیا بتائیں کہاں کے ہیں
نہ یہ طور برق تپاں کے ہیں نہ فروغ حسن بتاں کے ہیں

کچھ شعلے لپکے ہیں ہو رہے کہیں ہم بہ صبح نشور ہے
کچھ برق حسن غیور ہے یہ کرشمے سوز نہاں کے ہیں

یہ نہ کہہ کہ صبر محال ہے نہ عشق خواب و خیال ہے
جو بچھڑ کے ان سے یہ حال ہے ارے دل وہاں کے کہاں کے ہیں

یہ وصال ہجر کی شام کیا یہ تڑپ یہ جذب تمام کیا
ہمیں حسن و عشق سے کام کیا کہ ہم اپنے جذب نہاں کے ہیں

نہ ثبات اٹھا دو جہان پر نہ عدم کی سمت اٹھی نظر
ترے گم شدہ ترے بے خبر نہ یہاں کے ہیں نہ وہاں کے ہیں

جو ترے نہیں ہیں تو اب ہیں کیا ارے تجھ سے کیسی جدا رہے
تجھے کچھ تو اپنا پتا رہے یہ نہ پوچھ ہم سے کہاں کے ہیں

مرے شعر نغمۂ ساز ہیں مرے گیت دل کے یہ راز ہیں
جو بنے ہیں سوز و گداز ہیں نہ زبان نہ طرز بیاں کے ہیں

کھلے راز دل تو یہ دیکھنا کہ دہن سے شعلہ بھڑک اٹھا
یہ نہ پوچھ چھوٹ کے ہوں گے کیا جو فراق چھالے زباں کے ہیں

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت ۸/

تفسیر سورہ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔

کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴/

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶/

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲/

منیجر

رجسٹرڈ نمبر ل ۲۹۰۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اسکی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے، وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہونگے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح [illegible] مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڑھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڑھ میں چھاپ کر شائع کیا

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱۔۵۰

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۲ صفحے قیمت: ۸۰

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت طباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶۰

منیجر

جلد ۳	ماہ صفر ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۸ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

شذرات

الاصلاح کا مستقبل عرصہ سے الاصلاح کے ذاتی معاملات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی حالانکہ بعض ضروری باتیں ایسی تھیں جن کا ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔

الاصلاح کی اشاعت پر یہ تیسرا سال گذر رہا ہے اس مدت میں جہاں تک مالی معاملات کا تعلق ہے کوئی پریشان کرنے والی زحمت پیش نہیں آئی۔ جناب حافظ حاجی ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رٹائرڈ سول سرجن (صدر دائرہ حمیدیہ) جناب شیخ سلیمان صاحب (رکن دائرہ حمیدیہ) جناب مولوی عبدالغنی صاحب انصاری کمشنر انکم ٹیکس (نائب صدر دائرہ حمیدیہ) اور دائرہ کے دوسرے سرپرستوں اور مربیوں نے اتنی رقم اس کے لئے ہمارے ہاتھوں میں دیدی تھی کہ کبھی الاصلاح کے ضروری مصارف کی طرف سے بے اطمینانی نہیں ہوئی۔ اور نہ ۱۹۳۸ء کے آخر تک انشاء اللہ اس قسم کی پریشانی کا کوئی اندیشہ ہے لیکن ہماری خواہش برابر رہی ہے کہ الاصلاح جلد سے جلد اس قابل ہو جائے کہ اپنے مصارف کا بوجھ خود اٹھائے تاکہ آئندہ مربیوں اور سرپرستوں کو اس کی کفالت کیلئے مزید زحمت نہ دینی پڑے۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک ایسی حالت پیدا نہ ہو سکی۔ سوا دو برس کی مدت میں صرف اتنے خریدار مل سکے ہیں کہ وہ بمشکل الاصلاح کے نصف مصارف پورے کر سکتے ہیں۔

درانحالیکہ کاغذ اور سیاہی کی قیمت اور کاتب اور ملازمین پریس کی تنخواہوں کے سوا الاصلاح پر ایک پیسہ کا بار نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اگر آج نہیں تو آج کے آٹھویں مہینہ یعنی آئندہ دسمبر میں ہم کو لامحالہ الاصلاح کے معاملہ پر آخری مرتبہ غور کرنا پڑے گا۔

جہاں تک الاصلاح کے مربیوں و سرپرستوں کا تعلق ہے ان کے سامنے اس کو بند کرنیکا کوئی سوال نہیں ہے۔ وہ اس صورت میں بھی اس کو جاری رکھنے اور اس کے مصارف پورے کرنے کیلئے آمادہ ہیں۔ لیکن ہم نیازمندوں کو تو اب بس کر شرم آنے لگی ہے۔ جن لوگوں نے اتنی مدت تک ہم کو سہارا دیا یقیناً وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس خدمت دین کا اجر دیگا۔ اور اس آیا میں انشاء اللہ وہ تقصیر کے مجرم نہ ہوں گے۔ اور جہاں تک ہم خادموں کا تعلق ہے ہمارا ضمیر بھی مطمئن ہے انسان کے اوپر تمام تر ذمہ داری صرف سعی و کوشش کی ہے۔ اور الحمدللہ ہمارا قلب اطمینان سے لبریز ہے کہ جب ہم نے اتنے عرصہ تک سہارا لے کر کھڑے ہونے کی مشق و ممارست جاری رکھی تو گو ہم کھڑے نہ ہو سکیں لیکن انشاء اللہ ہمارا شمار قاعدین و متخلفین میں نہ ہوگا۔

بہرحال اب الاصلاح کے مستقبل پر آخری مرتبہ غور کرنیکا وقت آگیا ہے۔ وقتی امدادیں اور عطیے حاصل کرکے اس کو چلانا ممکن ہے اور ہمارا اندازہ ہے کہ اس طرح اس کو عرصہ تک چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ شکل ہم کو پسند نہیں۔ بلاشبہ دینے والے اتنے فیاض ہیں کہ وہ کبھی پیشانی پر بل آنے نہیں دیتے نہ کسی طرح کی مدح و ستائش کے امیدوار رہتے۔ بلکہ ان میں بعض تو وہ ہیں جو الاصلاح کی رایوں اور اس کے طریق کار سے شاید متفق بھی نہیں تاہم وہ اس کے لئے فیاضی سے نہیں رکتے۔ ایسی حالت میں دل گرفتگی اور مایوسی کی کوئی وجہ نہیں لیکن اپنی طبیعت کی افتاد اور مزاج کی وارفتگی کا کیا علاج؟ بخشنے والے بیشک نہیں تھکتے ہیں، اور دینے والوں نے بلاشبہ کبھی نہیں انکار کیا ہے۔ لیکن اگر دینے والوں کی اس فیاضی کی شہ پاکر مانگنے والے اتنے بےحس ہو جائیں کہ بار بار دست سوال بڑھانے میں بھی انھیں کوئی جھجک اور رکاوٹ نہ محسوس ہو اور اتنے احسانات سے گرانبار ہونے کے باوجود مزید احسان کے تصور سے ان کی پیشانی عرق آلود نہ ہو جائے تو غالباً یہ انسانی شرف و خودداری کیلئے کوئی اچھی بات نہیں۔ بس یہ شکل تو اب بہرصورت پسند نہیں کہ الاصلاح کے مربیوں کو اس کے تحفظ و بقا کیلئے

مزید قیمت دی جائے، لیکن پھر سوال کیا جائے کہ کیا دسمبر کے بعد اس کو بند کر دیا جائے؟ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے، اگر یہ بھی کرنا پڑے تو کچھ حرج نہیں۔ قرآن کی خدمت کی ایک ہی راہ نہیں ہے جو ہم لوگوں نے بنائی ہیں بلکہ ہمارے عقیدہ میں تو یہ راہ ضعفائے قلوب کی نکالی ہوئی ہے۔ اور محض ذہنی تماشہ گری اور دماغ اور نفس کی حیلہ جوئیوں کا ایک مظاہرہ ہے۔ قرآن کی خدمت ہر شخص کر سکتا ہے اور ہر جگہ اور ہر شکل میں کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ مسجد کا منبر اور اخبار کا دفتر ہی ہو۔ ایک لکڑہارا اپنے جنگل میں، ایک ہلواہا اپنے کھیت میں، ایک تاجر اپنی دوکان میں اسیطرح قرآن کی خدمت کر سکتا ہے جس طرح ایک مدرس اپنے مدرسہ میں، اور ایک شیخ اپنی خانقاہ میں بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ جیسی انہوں نے قرآن کی جو خدمت کی وہ شیخ الاسلاموں سے بن نہ آئی۔ پس اگر الاصلاح بند ہو جائے تو کچھ غم نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے تو یہی ہو۔ وہ اپنی کتاب کی کوئی خدمت کی اس سے بہتر شکل نکالے گا۔ اور یقیناً وہ راہ جو خدا کی نکالی ہوئی ہوگی نفس کی دراندازیوں سے زیادہ مامون ہوگی۔

لیکن الاصلاح کا معاملہ کسی ایک شخص کی ذات کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ سب سے پہلے ان لوگوں کا معاملہ ہے جنھوں نے اتنے اتنے عرصہ تک اس کو بغیر کسی آرزوئے مزد و صلہ کے محض قرآن کی خدمت کیلئے جاری رکھا ہے اور اپنا روپیہ خرچ کیا ہے۔ پھر ان رفقاء کا معاملہ ہے جو سوا دو برس سے مسلسل، بغیر کسی شائبہ خواہش منفعت کے اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کا بہترین حصہ اس پر صرف کر رہے ہیں علاوہ ازیں ان صدہا قدر دانوں کا معاملہ ہے جو اس کی دل سے قدر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ باقی رہے، اگرچہ ان کو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایثار کرنا پڑے۔

آج ان تمام بزرگوں، دوستوں اور ہمدردوں سے نہایت درد کے ساتھ درخواست ہے کہ

وہ الاصلاح کو کتاب الٰہی کی خدمت کیلئے کچھ مفید پاتے ہیں تو وہ دسمبر کے آنے سے پہلے پہلے اسکو اس قابل کر دیں کہ وہ اپنے ضروری اخراجات کی خود کفالت کر سکے۔ اور کسی وقتی اعانت کے حصول کیلئے دست طلب نہ دراز کرنا پڑے۔ بلاشبہہ یہ کام مشکل ہے۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ اس زمانہ میں ایسی شکل کیونکر ممکن ہے کہ الاصلاح جیسا خشک اور مذہبی رسالہ ایسا حلقہ پیدا کرے کہ اپنے مصارف کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ لیکن الاصلاح کے خریداروں کا رجسٹر دیکھنے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ یہ کام نہایت آسان ہے۔ اسقدر آسان کہ آج یہ شکل اختیار نہ کیگئی اور خدانخواستہ اس غفلت کے نتائج سامنے آگئے تو الاصلاح کے تمام قدردانوں کو افسوس ہوگا کہ محض تھوڑی سی بے پروائی سے قرآن کی ایک مفید خدمت کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

وہ شکل کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ

الاصلاح کا ہر خریدار صرف ایک خریدار مہیا کر دے۔

یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے۔ تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد الاصلاح اپنے اپنے ضروری مصارف خود پورے کریگا اور اس سے زیادہ کے لئے ہم خواہشمند نہیں۔ یہ اپیل الاصلاح کے ہر قدردان سے ہے اور یہ شاید پہلی زحمت ہے جو الاصلاح اپنے قدردانوں کو دے رہا ہے۔ امید ہے لوگ اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

دائرہ حمیدیہ کی مطبوعات دائرہ حمیدیہ کی طرف سے دو سالوں کے اندر استاذ امامؒ کی تفسیر...... نظام القرآن کے مندرجہ ذیل اجزا کتابی صورت میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ تفسیر سورہ اخلاص ۵/ تفسیر سورہ کوثر ۸/ تفسیر سورہ لہب ۶/ تفسیر سورہ فیل ۸/ تفسیر سورہ کافرون ۴/ تفسیر سورہ عصر ۶/ اس سلسلہ کی تازہ ترین خدمت تفسیر سورہ والعصر کی اشاعت ہے جو مولاناؒ کی تفسیری خصوصیات

...ن میں حاصل ہے۔ یہ تمام اجزا اردو میں ہیں اور باوجود دقیق مباحث پر مشتمل ہونیکے اسقدر صاف اور آسان زبان میں ہیں کہ عام اردو دان طبقہ ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ان اردو ترجموں کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہیگا اور انکی اشاعت سے مقصود یہ ہے کہ مولانا رحمہ کے معارف سے فائدہ اٹھانیوالوں کا حلقہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جائے کہ ان کی دوسری اہم تصنیفات جو ابتک صندوقوں میں بند ہیں عرصۂ اشاعت میں آسکیں۔ ہم لوگوں کے دل میں ابتدا سے یہ خواہش مخفی رہی ہے کہ ہم جلد سے جلد اس قابل ہو جائیں کہ اگر لوگ اس کار خیر میں ہماری کچھ مدد کریں تو ہم بھی ان کی کچھ خدمت کر سکیں تا کہ ان کے عطیے ہماری محنت کی مزدوری ہوں، طبیعت پر بار نہ ہوں، پس اب جو حضرات دائرہ کی خدمت کرنا چاہیں ان کے لئے عمدہ سبیل یہ ہے کہ وہ دائرہ کی مطبوعات خرید کر ہماری مدد کریں۔ یہ مدد ہمارے لئے اور ان کے لئے دونوں کے لئے موجب خیر و برکت ہوگی۔

ہم لوگوں نے ایک اور عمدہ چیز چھاپی ہے۔ کتاب امثال آصف الحکیم۔ یہ انگریزی کی مشہور کتاب (Aesop's fables) کے منتخب قصص کا عربی میں ترجمہ ہے اور ترجمہ مولانا رحمہ کے قلم سے ہے، انھوں نے غالباً عربی نصاب تعلیم کی اصلاح کی اسکیم کے ماتحت اس کو عربی کے ابتدائی درجوں میں بطور ریڈر پڑھانے کے لئے تیار کیا تھا۔ ہم لوگوں کو اپنے مدرسہ کے ابتدائی درجوں کے لئے ایک عمدہ ریڈر کی عرصہ سے تلاش تھی۔ مصر وغیرہ کے مدارس میں جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں وہ منگوا کر دیکھی گئیں لیکن یہاں کے نصاب سے ان کا مزاج موافق نہ ہوا۔ یہاں اس امر پر لوگوں کو اصرار ہے کہ جو چیزیں پڑھائی جائیں ان کی زبان ایسی ہو کہ طلبہ کا مذاق قرآن کے اسالیب اور اسکی زبان سے مانوس ہو۔ جدید مصری عربی میں یہ بڑا عیب ہے کہ وہ اس چیز سے منحرف کرنیوالی ہے۔ پس ان ریڈروں کو یہاں چلانا ناموزوں ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا رحمہ کے مسودات میں یہ چیز مل گئی اور اس مقصد کے لئے نہایت موزوں معلوم ہوئی۔

دائرہ حمیدیہ نے اس کو خاص اہتمام سے چھاپ کر شائع کیا ہے۔ قیمت ۸ ؍ ہے۔ عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ اسکو ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ نہایت مفید پائیں گے۔

مولاناؒ کی عربی تصنیفات کی اشاعت کے سلسلہ میں افسوس ہے کہ ہم ابتک کچھ نہ کر سکے۔ جو احباب و مخلصین ابتدا سے انہی کے لئے بے چین ہیں وہ شکایتوں اور تقاضوں کے بعد شاید آزردہ ہوکر اب خاموش ہو رہے ہیں۔ لیکن ہمارے سامنے حالات ایسے رہے ہیں کہ کچھ نہ کر سکنے پر افسوس تو ضرور ہے لیکن الحمدللہ کوئی ندامت نہیں ہے۔ احباب و مخلصین یقین کریں یہ قنطرۃ المجاز اسی حقیقت تک پہنچے کیلئے تعمیر کیا گیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد ان چیزوں سے دامن بھر کر وہیں پہنچا ہے لیکن عجلت کا بالکل موقع نہیں ہے۔ مولانا حمیدالدینؒ کے معارف کو اردو میں پڑھنے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے عربی میں اور بھی ہندوستان میں کون پڑھے گا۔ زمانہ کا مذاق بالکل دوسرا ہے۔ غالب مرحوم کو شکایت تھی اور بالکل بجا شکایت تھی کہ

جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے

یہی حال اپنا ہے۔ تاہم کر ہمت مضبوط ہے۔ انشاء اللہ جلد مولانا کی بعض تصنیفات شائع ہوکر شائقین کے ہاتھوں میں پہونچیں گی۔ جمہرۃ البلاغہ جو بلاغت قرآن پر مولاناؒ کی بے نظیر تصنیف ہے، حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ ملاحظہ فرما رہے ہیں اور یہ اسکی طبع و اشاعت کی فکر کا گویا دیباچہ ہے مخدومی حاجی رشیدالدین صاحب انصاری مدظلہ نے اسکی اشاعت کیلئے ایک رقم بھی عنایت فرمائی ہے۔

ہاں ایک اور تجویز سامنے ہے لیکن اس کے بابت الاصلاح کے قارئین کا مشورہ ضروری ہے۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ سال میں الاصلاح کی ایک اشاعت مولانا کی کسی عربی تالیف کی اشاعت کیلئے مخصوص

کر دیا جائے۔ اس طرح ہر سال مولانا کی کوئی نہ کوئی اہم تصنیف الاصلاح کے واسطے سے شائع ہو جائیگی۔ جو قارئین عربی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ان کو اس تجویز سے دلچسپی نہ ہوگی۔ لیکن ایک بڑے فائدہ کیلئے وہ تھوڑا سا ایثار منظور کریں گے۔ اگر قارئین نے اس کو منظور کیا تو سال کے آخری پرچہ میں مقدمہ تفسیر نظام القرآن شائع کر دیا جائے گا جس میں مولانا نے اپنی تفسیر کے اصول و مبادی پر مفصل بحث فرمائی ہے۔ اس کے بعد تفسیر بسم اللہ، تفسیر فاتحہ اور تفسیر سورہ بقرہ علی الترتیب سال بسال شائع ہوتی رہیں گی۔

مبارکباد اور شکریہ! ہمارے محترم مولوی عبد الغنی صاحب انصاری اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس نائب صدر دائرہ حمیدیہ اپنے عہدہ میں ترقی کرکے اب کمشنر ہو رہے ہیں۔ یہ ان کی راہ کی ایک قدرتی منزل تھی جس تک ان کو پہنچنا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ پہنچ گئے۔ یہ امر چنداں قابل اہتمام نہیں۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ زمانہ کی روش عام کے خلاف دنیاوی سرفرازیوں اور عزتوں کی چکا چوند نے الحمد للہ ان کو ذرا بھی متاثر و مرعوب نہیں کیا ہے۔ ان کی قابلیت، متانت، رزانت اور شرافت ہماری قوم میں ضرب المثل رہی ہے۔ لیکن ان سب خوبیوں پر ان کی قومی خدمتوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے وہ ابتدا سے مربی رہے ہیں۔ ان کا کوئی والا نامہ قوم کی اصلاح و ترقی کے جذبات سے خالی نہیں ہوتا۔ اپنے ایک تازہ گرامی نامہ میں انھوں نے ایک گرانقدر عطیہ سے مدرسہ کی امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔ دنیاوی عہدوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر روحانی مدارج بھی بڑھتے رہیں تو اسی کو نور علیٰ نور کہتے ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں شکریہ اور مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

برما کے لئے الاصلاح کا چندہ کم کر دیا گیا محصول ڈاک کے اضافہ کی وجہ برما کیلئے الاصلاح کی قیمت للعہ سے صہ کر دی گئی تھی لیکن اب چونکہ محصول میں کسی قدر تخفیف ہو گئی ہے اسلئے چندہ بجائے صہ کے للعہ کر دیا گیا ہے۔ — مینجر

معارف قرآن

تفسیر سورۂ مرسلات

۴

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ (۴۱) وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ (۴۲) كُلُوا
وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳) إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۴۴)
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۴۵) كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُجْرِمُونَ (۴۶)
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۴۷) وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ (۴۸)
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۴۹) فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (۵۰)

بے شک پرہیزگاروں کو سایہ ہوں گے اور نہریں۔ اور جیسا کچھ چاہے میوے۔ مزے سے کھاؤ پیو اپنے اعمال کے بدلے۔ بھلائی کرنیوالوں کو ہم یونہی دیا کرتے ہیں۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ چند روز کھالو اور مزے کرلو تم تو ٹھہرے گنہگار۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ اور جھکنے کو ان سے کہا جاتا تو نہیں جھکتے۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ اب اس سے بڑھکر کیا بات ہے جسے مانیں گے۔

الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

(فی ظلال) یعنی سایوں کے درمیان قرآن مجید میں یہ مضمون اور یہ اسلوب بہت آیا ہے مثلاً

وَاَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا اَصْحَابُ الْيَمِينِ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ

اور مقصود اس سے ان نعمتوں کا بیان ہے جن سے وہ گھرے ہوں گے۔ یہی اسلوب برج بن مسہر الطائی نے استعمال کیا ہے۔

فبتنا بین ذالک وبین مسک فیا عجبا لعیش لو یدوم

پس ہم نے اس میں اور مشک کی خوشبوؤں میں شب بسر کی۔ کیا مزے کی زندگی تھی! کاش ہمیشہ رہتی۔

(هنیئا) فعل مقدم سے جو مفعول مفہوم ہو رہا ہے اس سے حال پڑا ہوا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

فکلوہ هنیئا مریا" جس میں ذوالحال واضح ہے۔ ذوالحال مقدر سے حال پڑنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ مثلاً مسافر کے لئے کہیں گے۔ راشدا مھدیا

(واذا قیل لھم) "اذا" کا عام استعمال مستقبل کے لئے ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ کہ جب حشر میں سب لوگ اکٹھے کئے جاچکیں گے تو پروردگار کے حضور سجدے کے لئے بلائے جائیں گے تو جن لوگوں نے دنیا میں سجدہ نہ کیا ہوگا۔ وہ اس دن سجدہ نہ کرسکیں گے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ	جس دن کہ بھل پڑے گی اور وہ بلائے جائیں گے
إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ○	سجدے کیلئے پس سجدہ نہ کرسکیں گے اور ان کی نگاہیں
خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ	جھکی ہوں گی، ذلت چھائی ہوئی ہوگی اور وہ سجدہ
وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ	کے لئے بلائے جاتے تھے اور اس وقت سالم

وَهُمْ سَالِمُوْنَ صحیح و سالم تھے۔

پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ وہ فیصلے کے دن سجدہ نہ کرسکیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ دوسری تاویل یہ ہوسکتی ہے کہ اذا عادت کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے تاویل یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں نہیں جھکتے۔ اس کے بعد ہے "ویل یومئذ للمکذبین" سیاق سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ وہ دنیا میں نہیں جھکے تو وہ آخرت میں بھی نہ جھک سکیں گے اور یہ امر ان کیلئے باعث خرابی ہوگا۔

یہ محض الفاظ کا فرق ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں تاویلوں کا مآل ایک ہی ہے۔

(بعدہ) یعنی اس بات کے بعد جو بہترین دلائل اور واضح ترین براہین کے ساتھ ان کو معاد اور خدا پرستی کی تلقین کر رہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيَاتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ پس اللہ اور اس کی آیات سے بڑھکر کیا بات ہے جس پر ایمان لائیں گے۔ پس بعدہ کا مفہوم وہی ہے جو فبای حدیث سے مترشح ہو رہا ہے۔ یعنی اگر اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب کونسی بات اس سے زیادہ واضح اور دلوں میں گھر کرنیوالی ہوگی کہ اس پر ایمان لائیں گے۔

بعض لوگوں نے 'بعدہ' سے یہ مفہوم سمجھا ہے کہ 'اس دن کے بعد' لیکن ہمارے نزدیک یہ احتمال ضعیف ہے۔ اس دن تو وہ بہرحال ایمان لائیں گے۔ یہ بات عقلاً بھی واضح ہے اور قرآن بھی اس پر شاہد ہے۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ۔ اگر مقصود یہ ہوتا تو یہ فرمایا جاتا کہ فلای نفع بعدہ یومنون (اس دن کے بعد کس فائدہ کے لئے ایمان لائیں گے) ممکن ہے اس مفہوم کی تائید میں آیت ذیل دلیل لائی جائے۔

وَاَنْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ

اور شاید کہ ان کی اجل قریب آگئی ہو تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد یعنی اجل کے آجانے کے بعد۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل واضح نہیں ہے۔ اولاً تو یہاں اجل کا لفظ مرد اذکور اور پاس ہی موجود ہے جس کی طرف ضمیر کو بے تکلف لوٹایا جا سکتا ہے۔ ثانیاً یہاں بھی کچھ ضروری نہیں کہ یہ مطلب لیا جائے سیاق کلام نہایت واضح طور پر ایک دوسری ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اوپر کی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو ملامت کی جارہی ہے جو کتاب اللہ اور انبیاء و رسل کے منکر ہیں۔ پس اس مضمون کے اعتبار سے وہی تاویل موزوں ہوگی جو ہم نے اختیار کی۔ سلف کا مذہب بھی یہی ہے چنانچہ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"فبای حدیث بعدہ یومنون" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تحذیر کے بعد اب وہ کونسی تحذیر و تخویف ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے اگر اس کتاب کی تصدیق سے ان کو انکار ہے تو اب کونسی کتاب ہے جس کی وہ تصدیق کریں گے۔"

بعض دوسرے مفسرین کا بھی یہی مذہب ہے۔ پس اس آیت سے جو ثبوت پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔

آیات کی تاویل اوران کا نظم

(کُلُوْا وَاشْرَبُوْا) میں غیب کو مشہود و مصور کرنے کا وہی اسلوب ملحوظ ہے جو انطلقوا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ میں دو تاویلوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس کو پچھلے خطاب سے بالکل متصل مانا جائے، اور ان آیات کے سیاق و مفہوم میں لیا جائے جو اکثر آخرت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد وارد ہیں، مثلاً فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا	یہ تمہارے لئے بدلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔

دوسری جگہ ہے

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

اور یہ جنت ہے جس کے تم وارث ہوئے ہو اپنے عمل کے بدلے میں۔

دوسری یہ کہ اس کو التفات اور خطاب کے مفہوم میں لیا جائے اور اس کے نظائر بھی قرآن مجید میں بہت ہیں اور نظائر ہی پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔

آیت ذیل یہاں بطور مقابلہ ہے یعنی جبکہ نیکوکاروں کو ان کے اعمال کے صلہ میں نعمتیں مرحمت ہونگی ان منکروں کے لئے عذاب ہوگا۔ اور یہ عذاب ان کے لئے دوہرا ہو جائے گا۔ ایک طرف تو عذاب کی اذیت ہوگی۔ دوسری طرف مومنین کی کامیابی پر حسرت واندوہ۔ اور یہ غم بالائے غم ہے۔

(كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ) اس آیت میں کافروں سے خطاب ہے اور اس میں بلاغت کے بہت سے اسالیب اکٹھے ہوگئے ہیں۔

(۱) اوپر مومنین کی نعمتوں کا ذکر تھا۔ پس اس آیت میں گویا اسکی مقابل حالت کا بیان ہوا۔

(۲) اس میں جلد عذاب آنے کی دھمکی ہے۔

(۳) دنیا کی اس حقیر پونجی پر ان کو جو گھمنڈ ہے اس پر ملامت ہے۔ گویا ان کے لئے عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ صرف تھوڑی سی مہلت دیدی گئی ہے کہ جو کھانا پینا چاہتے ہیں کھا پی لیں بالآخر یہ حلق کی پھانس ہوگا۔

(۴) اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ روز جزا پر دلیل ہے۔ یعنی چند روز کھا پی لو، تم ا مجرم ہونا طے پا چکا ہے۔ پس ضرور ہے ایک دن بازپرس اور بدلہ کا آئے۔ ایک جگہ اس مضمون کی وضاحت ہوگئی ہے۔ قل تمتعوا فان مصیرکم الی النار۔ کہدو، چند روز مزے کرلو، کیونکہ تمھارا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس کے بعد آیت ویل آئی ہے جس کا مقصود ویل کی شدت اور قطعیت کا بیان ہے۔

(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ) یہ اپنی دونوں تاویلوں کے اعتبار سے انکم مجرمون

کا بیان ہے۔ کیونکہ جو دنیا میں اپنے پروردگار کے حضور نہ جھکا وہ حقیقت میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ اور یہی

ذریعہ خدا کے ساتھ بیہودگی و فروتنی کا اظہار ہے اور سب سے بڑی معصیت خدا سے استکبار۔ اور یہ تکذیب و انکار

کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی وَلٰکِنْ	پس نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی بلکہ انکار کیا اور
كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى	منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں کی طرف چلتا
اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى، اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى	تیرے لئے ہلاکی ہے پھر ہلاکی ہے، اور پھر ہلاکی
ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى	ہے اور پھر ہلاکی ہے۔

دوسری تاویل کے اعتبار سے مضمون یوں ہوگا کہ پہلے فرمایا کہ تم آج مجرم ہو۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان کا جرم قیامت کے دن کھلے گا۔ جب وہ جھکنے کے لئے بلائے جائیں گے لیکن جھک نہ سکیں گے۔ اس کے بعد آیت ذیل کا مفاد یہ ہوگا کہ یہ ذلت ان کے عدم رکوع کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ مضمون آیت کی دونوں تاویلوں کے لحاظ سے بن جائے گا۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ یہ خاتمہ کی ایک جامع آیت ہے جس نے ان تمام مضامین کی طرف انگلی اٹھا دی ہے جو از قبیل دلائل و از قسم ترغیب و ترہیب اوپر بیان ہوئے تھے۔ اور اسلوب استفہام میں یہاں متعدد نکتے مضمر ہیں۔

(۱) اس سے اس کلام کی عظمت و منزلت اور تبلیغی اعتبار سے اسکی جامعیت واضح ہوتی ہے۔

(۲) ان کے ایمان کی طرف سے ناامیدی مترشح ہوتی ہے۔

(۳) ان کے انکار پر تشنیع ہے۔

پھر آیت کے موقع سے یہ بات نمایاں ہے کہ اتمام حجت کے بعد یہ تو دیع کا آخری جملہ ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً آخر سورہ طارق میں فرمایا۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ. وَالْاَرْضِ	شاہد ہے آسمان پرنگار اور زمین پرشگاف کر
ذَاتِ الصَّدْعِ. اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ	یہ دوٹوک بات ہے اور کوئی ہنسی نہیں، وہ چل
وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ. اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ	رہے ہیں ایک چال اور میں چل رہا ہوں ایک اور
كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ	چال۔ سو چھوڑ دے کافروں کو ذرا دیر کو
اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا	. . . .

سورہ زخرف کے اخیر میں فرمایا

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ	پس ان سے درگذر کرو اور کہو سلام، وہ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ	جلد جان لیں گے۔

اسی اسلوب کے مطابق خاتمہ کی آیت سے یہاں بھی واضح ہے کہ جب اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب وہ کسی چیز پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پس ان کو چھوڑ دو، تھوڑے دن کھا پی لیں اور مزے اڑا لیں۔

مکذبین سے متعلق ہم نے اوپر تاویل کے جو دو پہلو بیان کئے تھے خاتمہ کی آیت نے اس دوسرے پہلو کو واضح کر دیا کہ یہی منکرین ہیں جو اللہ کے کلام کا انکار کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ دراصل قرآن کا انکار نتیجہ ہے ان کے انکار قیامت اور نماز اور بندگی سے بے پروائی کا۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اور اس کے بعض شواہد دوسری فصل میں بیان ہوئے ہیں۔

هذا آخر ما تيسر لنا ذكره في تفسير هذه السورة والحمد لله رب العالمين والصلوٰة على سيدنا محمد وآله اجمعين

ذبیح کون ہے؟

چوتھی دلیل ـــ مروہ کی تحقیق

۱ واقعہ ذبح کے سلسلہ میں توراۃ کا یہ بیان پڑھ چکے ہو کہ

"تیسرے دن ابراہیم نے نگاہ اٹھائی اور قربانی کی جگہ کو دور سے دیکھا"

یہود کا بیان ہے کہ یروشلم میں وہ جگہ ہے جہاں ہیکل سلیمان ہے۔ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں مسیح کو سولی دی گئی تھی۔ لیکن ان کے محققین کے نزدیک ان کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل ہے۔ اس باب میں ان کے جو اختلافات ہیں ان کو ہم انہی کے ایک محقق عالم جے ڈبلو کولنزو J. W. Colenso کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ اس نے اس مقام کے بارہ میں جس کا نام انھوں نے مریا بتایا ہے، تمام اختلافات نقل کئے ہیں اور اخیر میں خود محاکمہ کرکے ان کی تمام تحریفات کا پردہ چاک کر دیا ہے۔

اختلافات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مقامات جہاں توریت میں یہ نام آیا ہے۔	نسخہ سبعینیہ کی روایت	نسخہ عبرانیہ کی روایت
پیدائش (۲۲ : ۲)	بلند زمین	ملک مورہ
" (۱۲ : ۶)	اونچے بلوط	میدان مورہ
تثنیہ (۱۱ : ۳۰)	اونچے بلوطوں کے قریب	میدان مورہ کے قریب
قضاۃ (۷ : ۱)	جبل مورہ کے پاس	جبل مورہ کے پاس

پھر ایک ہی نسخہ کی ایک ہی آیت کا ترجمہ مختلف مترجمین نے مختلف کیا ہے۔ مثلاً نسخہ سبعینیہ م

پیدائش (۲۲: ۲) میں "بلند زمین" ہے .... اقیلا کے ترجمہ میں "نمایاں سرزمین" .... اور سماخوس کے ترجمہ میں "رویا کی سرزمین" ہے۔

جس طرح اس لفظ کے ترجمہ میں اختلاف ہے اسی طرح اس کو لکھتے بھی مختلف شکلوں میں ہیں۔ فصل کے آخر میں ہم اس کی تفصیل کریں گے۔ ان اختلافات کو بیان کرنے کے بعد کولنزو نے ان کی تعریف پر بحث کی ہے اور دو واضح دلیلوں سے ان کے خلاف حجت قائم کی ہے۔

۱۔ یہ نام ہیکل کی جگہ کے لئے کسی صحیفہ میں نہیں آیا ہے۔ کولنزو کے الفاظ یہ ہیں:" یہ نام سلیمان کے بعد سے کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا جس پہاڑ پر ہیکل کی تعمیر ہوئی انبیا کے صحیفوں اور مزامیر وغیرہ میں اس کا نام صیہون لیا گیا ہے۔ ہیکل کی جگہ کے لئے مریا کا لفظ کہیں نہیں آیا۔"

۲۔ اس مقام کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ کسی طرح ہیکل کی جگہ کی خصوصیات پر منطبق نہیں ہوتیں۔ ہمارے نزدیک یہ دلیل نہایت قوی ہے۔ کولنزو نے لکھا ہے کہ تورات میں ایک مقام کو دور سے دیکھنے کا ذکر ہے جس کی طرف ابراہیم نے نگاہ اٹھائی حالانکہ یہاں کوئی جگہ ایسی نہیں ملتی جس پر یہ بیان منطبق ہو سکے۔ جس جگہ کو یہود قربانی کی جگہ قرار دیتے ہیں یعنی جبل ہیکل یا جبل موریاہ، قطع نظر اس سے کہ اس تسمیہ کے سوا ان کے دعوی کی کوئی دلیل نہیں، معاملہ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ اسی وقت نظر آتا ہے، جب ایک شخص مشرقی جانب سے، وادی ہنوم سے ہو کر وہاں پہنچے، اس وقت وہ ہیکل کو اوپر سے دیکھ سکے گا۔ اس کے بعد اس کی تائید میں اس نے محقق اسٹانلی کی مندرجہ ذیل تحقیق نقل کی ہے۔

"صبح کے وقت وہ (ابراہیم علیہ السلام) بیر سبع کے خیموں سے نکلکر روانہ ہوئے، اور اس مقام کی طرف گئے جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو جانے کا حکم دیا تھا۔ یہود مدعی ہیں کہ یہ مقام یروشلم میں جبل موریا پر ہے لیکن میرے نزدیک یہ دعوی صحیح نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یہ مقام قبر مقدس کے گرجا کے قریب ہے۔ لیکن یہ دعویٰ پہلے دعوی سے بھی زیادہ بے بنیاد ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ مقام مکہ میں جبل عرفات

پر ہے، ان کا دعویٰ سب سے زیادہ عجیب اور بے حقیقت ہے سب سے زیادہ لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ اس
مقام کو جبل جرزیم پر تلاش کیا جائے۔ وہ شکلاً بھی قربان گاہ سے بہت ملتا جلتا ہوا ہے۔"

اس محقق نے مسلمانوں کی طرف جو دعویٰ منسوب کیا ہے کہ وہ اس مقام کو جبل عرفات پر بتاتے
ہیں، محض بے خبری پر مبنی ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں ایک مسلمان بھی جبل عرفات کے قربان گاہ
ہونے کا قائل نہیں ہے۔ رہا جبل جرزیم تو یہود میں ایک فرقہ سماریہ کے نام سے موسوم ہے، وہ اس کو
قربان گاہ قرار دیتا ہے۔ ان کی تورات بھی اس تورات سے بالکل مختلف ہے جس کو عام یہود مانتے ہیں۔
مسیحی دوسرے یہودیوں کے مقابل میں ان کو اپنے سے زیادہ اقرب سمجھتے ہیں۔

ان اقوال کو نقل کرنے سے مقصود محض یہ دکھانا ہے کہ قربانی کی جگہ جو مورہ کے نام سے موسوم
ہے، اس کی تعیین کے بارہ میں ان لوگوں میں سخت اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے تو سرے سے اس
نام کو غائب ہی کردیا اور 'اونچے بلوط' یا 'نمایاں سرزمین' یا 'ارض رویا' سے اس کا ترجمہ کردیا ہے۔
ایک جماعت نے نام کو تو باقی رکھا، لیکن اس کے تلفظ میں طرح طرح کی تحریفات کردیں۔ مثلاً
مورہ، مریاہ، موریاہ اور یہ حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی ان کی وہی خصوصیت ہے جس کی طرف
قرآن مجید نے جابجا اشارہ کیا ہے۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ
الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (آل عمران)

اب ذیل میں ہم اس پر مفصل بحث کرکے بتانا چاہتے ہیں کہ اس مقام کا اصلی نام کیا ہے اور اس
سے کونسی جگہ مراد ہے۔

۱۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اصلی نام 'مروہ' ہے 'میم' اصلی ہے اور 'ر' 'واؤ' پر مقدم ہے 'مروہ'
چکنے اور چمکدار پتھر کو کہتے ہیں۔ کلام عرب میں یہ لفظ بہت آیا ہے۔
جن مترجمین نے اس کا ترجمہ "نمایاں" "رویا" اور "بلند" وغیرہ کیا ہے۔ ان کے ترجموں سے

کم از کم اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ وہ اس لفظ کو مورہ وغیرہ نہیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ تحریف کرنے والوں نے اس کو بدلا ہے۔ کیونکہ مورہ کے اشتقاق کے بارہ میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی اصل یا تو 'یرا' ہے یا 'یرہ'۔ 'یرا' کے معنی خوف اور تعجب کے ہیں، پس مورہ کے معنی خوف یا سبب خوف کے ہوں گے۔ 'یرہ' کے معنی رمی اور سقی کے آتے ہیں اور اس مادہ کے لحاظ سے مورہ کے معنی، تیرانداز اولین بارش اور استاد کے آتے ہیں۔ پس اگر یہ لفظ اصل میں مورہ ہوتا، جیسا کہ یہ تحریف کرنیوالے کہتے ہیں تو ابتدائی مترجمین اس کا ترجمہ 'نمایاں'، 'رویا'، 'دربلند' وغیرہ نہ کرتے۔ صاف واضح ہے کہ ان کو یہ لفظ 'مروہ' کی صورت میں ملا تھا۔ لیکن چونکہ اس کا مادہ ان کے لغت میں موجود نہ تھا اس لئے ان کو گمان ہوا کہ یہ 'مراۃ' ہے، کیونکہ عبرانی میں واؤ، الف سے اکثر بدل جایا کرتا ہے۔ پس اس کو انھوں نے اپنی زبان کے قواعد کے مطابق 'رآہ' سے مشتق سمجھ لیا اور 'راہ' کے معنی ان کی زبان میں رویۃ اور نظر وغیرہ کے آتے ہیں۔ پس اس اشتقاق کے لحاظ سے انھوں نے اس کے معنی، نظر، نمایاں اور رویا وغیرہ کے قرار دے لئے۔ الغرض یا تو ان کو یہ لفظ مروہ کی صورت میں ملا تھا یا مراۃ کی۔ دوسری شکلیں بعد کی گھڑی ہوئی ہیں۔

بعض مترجمین نے اس لفظ کا ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی مختلف صورتوں کو باقی رکھا ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'واؤ' کو اصل مادہ کا جز قرار دیتے ہیں اور میم کو لفظ کے شروع میں اصلی میم کی حیثیت سے باقی رکھنے پر متفق ہیں اور اگر اصل لفظ اور اس کی مختلف متغیر شدہ صورتوں میں مقابلہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اصل لفظ صرف مروۃ ہوسکتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری شکل ممکن نہیں۔

اختلاف کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اصل عبرانی میں حرکات کی علامتیں نہ تھیں۔ یہ متاخرین کی ایجاد ہے۔ پھر ان میں حفاظ بھی نہ تھے جو صحیح قرأت کو محفوظ رکھتے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے

حرکت کو حرف کی اور حرف کو حرکت کی صورت میں بدلکر تحریف و تغیر کا ایک وسیع دروازہ کھولدیا۔

یہ لفظ بھی ابتدا میں حرکات سے بالکل مجرد یعنی بیان قرأت کے ساتھ لکھا گیا ہوگا اور یہ معلوم ہے کہ تحریف کے شوق میں یہود آیات میں مد و تشدید کے اضافہ کے معاملہ میں بہت بے باک تھے، تاکہ بعد میں آنیوالوں کے لئے تبدیلی او تحریف کے دروازے برابر کھلے رہیں۔

اب اس لفظ کی اصل صورت اور اس کی تبدیل شدہ صورتوں پر غور کرو۔

لفظ کی مختلف قراتیں	تبدیل شدہ صورتیں	اصل لفظ
مُرِیَاہ	(۱) מריה (مریہ)	מרוה مروہ
موریاہ	(۲) מוריה (موریہ)	
(مُوْرِہ)	(۳) מֹרה (مورہ)	

اب ان تبدیلیوں پر غور کرنا چاہیے جو ان میں واقع ہوئی ہیں۔ پہلی صورت میں یہ ہوا کہ واؤ عبرانی میں اکثر ی سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً גול (جول)، גיל (جیل) بمعنی جوان۔ نیز הוה (حوہ) اور חיה (خیہ) بمعنی آفت۔ اور یہ دراصل حائے حطی سے تھا لیکن ان لوگوں نے اسے خ سے بدلدیا چنانچہ اسے ہائے ہوز سے لکھتے ہیں۔ جو مادے عربی اور عبرانی میں مشترک ہیں۔ ان میں اکثر پاؤگے کہ جہاں عربی میں واؤ ہے وہاں عبرانی میں ی ہوگیا ہے۔ مثلاً دلو اور دلی بالخصوص الفاظ کے شروع میں تو یہ بات بہت عام ہے مثلاً ولد/لید وعد/ید، وقر/یقر اور یہ بات یا تو سہولت کی وجہ سے ہے یا اس مشابہت کیوجہ سے ہے جو عبرانی رسم الخط میں و اور ی میں ہے اور جس کو تم اوپر دیکھ چکے ہو۔

دوسری صورت میں یہ تغیر ہوا کہ انھوں نے سمجھا میم پر ضمہ ہے۔ پھر اس کو انھوں نے ایک مستقل حرف قرار دیدیا۔ اور یہ بات عبرانی الفاظ میں بہت عام ہے۔ مثلاً: יאר (یاُر) اور יאור (یاور) نیل اور عام نہر کے معنی میں۔ نیز יתר (یتر) اور יותר (یوتر) بمعنی زیادتی

اسی اصول پر انھوں نے مریہ کو موریہ کر دیا۔

تیسری صورت میں واؤ کو ر، پر مقدم کر دیا ہے اور اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں یا تو اپنے اس عام طریقہ قلب و تغیر کی وجہ سے جس کے وہ عبرانی الفاظ کے باب میں عادی ہیں۔ مثلاً جرد سے جور، حنق سے حیف، علو سے یعل، کہل سے کلہ۔ پس اسی طریقہ پر مروہ کو انھوں نے موریہ کر دیا۔ یا اس تشابہ کی وجہ سے جو دونوں حرفوں ٦ اور ٦ یعنی واؤ اور ر میں ہے تصحیف ہو گئی ہو۔

ہمارے نزدیک یہ دوسری وجہ مستبعد نہیں ہے۔ جو شخص بالارادہ یا بے ارادہ تحریف کرنا چاہے اس کے لئے اس طرح کا اشتباہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس قسم کے اشتباہ کی مثالیں ان کی زبان میں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً لفظ برص کو ان لوگوں نے بوص کر دیا اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ واؤ اور ر کی کتابت ان کی زبان میں بالکل ملتی جلتی ہوئی ہے۔

۲- اب صرف اس سوال پر غور کرنا باقی رہ گیا کہ اس سے مراد کونسا مقام ہے؟ فصل کے آغاز میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ عام یہود اس سے وہ مقام مراد لیتے ہیں جہاں ہیکل سلیمان واقع ہے اور نصاریٰ مدعی ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں قبر مقدس کا کنیسہ ہے۔ لیکن ان کے علماء اور محققین نے خود ان دعاوی کی لغویت واضح کر دی ہے اس لئے ہم کو ان کی تردید میں وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہا اسٹانلی کا قول کہ یہ مقام کوہ جریزیم پر ہے تو اس کی حیثیت محض قیاس کی ہے۔ چونکہ اس پہاڑ کی شکل ایک بلند تخت کے مانند ہے اس لئے اسٹانلی کو وہ قربان گاہ کے لئے نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض اتنی بات اس بحث کو طے کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے اس لئے اس کا قول بالکل ناقابل توجہ ہے۔ نصاریٰ اور یہود میں سے ایک شخص بھی اسٹانلی کا ہم خیال نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ وہی مقام ہے جو بنی اسماعیل کے مسکن میں پایا جاتا ہے اور ابتدا سے مروہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہود کے صحیفوں سے ہمارے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل (۱) یہ ہے۔

"اور مدیانیوں کی لشکرگاہ ان کے شمال کی طرف کوہ مورہ کے متصل وادی میں تھی۔"

پس معلوم ہوا کہ مورہ کی پہاڑی مدیانیوں کی لشکرگاہ تھی اور یہ پوری قطعیت کے ساتھ معلوم ہے کہ مدیانیوں سے مراد عرب ہیں۔ مدیان کا لفظ عربوں اور ان کی سرزمین کے لئے نہایت معروف ہے۔ صحف عہد عتیق میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ مدیان سے مراد اسمٰعیلی ہیں۔ انگریز مترجم قرآن سیل لکھتا ہے۔

"مدیان یونانیوں کے زمانہ میں تھا۔ یہ سینا کے جنوب مشرق میں بحر قلزم پر واقع تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ وہی مقام ہے جس کو بطلیموس نے مودیانہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔"

قضاۃ (۸: ۲۲) میں ہے۔

"تب بنی اسرائیل نے جدعون سے کہا کہ تو ہم پر حکومت کر۔ تو اور تیرا بیٹا اور تیرا پوتا بھی کیونکہ تو نے ہم کو مدیانیوں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ تب جدعون نے ان سے کہا کہ نہ میں تم پر حکومت کروں گا نہ میرا بیٹا بلکہ خداوند ہی تم پر حکومت کریگا۔ اور جدعون نے ان سے کہا کہ میں تم سے یہ عرض کرتا ہوں کہ تم میں ہر شخص اپنی لوٹ کی بالیاں مجھے دے دے (یہ لوگ اسمٰعیلی تھے اس لئے ان کے پاس سونے کی بالیاں تھیں)"

پیدائش (۳۷ - ۲۵) میں ہے۔

"اور وہ کھانا کھانے بیٹھے اور آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ اسمٰعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے آرہا ہے اور گرم مصالحہ اور روغن بلسان اور مر اونٹوں پر لادے ہوئے مصر کو لئے جا رہا ہے۔ تب یہوداہ نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اسکا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا۔ آؤ اسے اسمٰعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں کہ ہمارا ہاتھ اس پر نہ اٹھے کیونکہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا خون ہے۔ اس کے بھائیوں نے اس کی بات مان لی۔ پھر وہ مدیانی سوداگر ادھر سے گزرے تب انھوں نے یوسف کو کھینچ کر گڑھے سے باہر نکالا اور ان اسمٰعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے پر بیچ ڈالا اور وہ یوسف کو مصر میں لے گئے۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مورہ مدیان کے مسکن میں واقع ہے اور مدیان بنی اسمٰعیل کو کہتے ہیں اور ارض مدیان حجاز میں بحر قلزم کے ساحل پر ہے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ مورہ درحقیقت مروہ کی تحریف ہے اور محققین توریت اعتراف کرتے ہیں کہ شام میں جہاں بنی اسرائیل آباد تھے اس نام کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہود نے خود یہ نام اپنے صحیفوں میں داخل کیا اور پھر خود ہی اس کا ایک فرضی مسمیٰ ٹھہرایا جس کو تسلیم کرنے سے ان کے محققین نے صاف انکار کر دیا اور علاوہ ازیں خود ان کے صحیفوں کے نصوص سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مروہ حجاز میں ہے جہاں بنی اسمٰعیل آباد تھے۔

ان واضح دلائل کے بعد ان کے اس دعوی کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے کہ مروہ جبل یروشلم پر ہے؟ البتہ اس امر میں ذرا بھی شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ بنی اسمٰعیل کے مسکن میں واقع ہے اور ان کے مشہور مقامات میں سے ہے جس کو وہ اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ اور حج میں اس کا طواف کرتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں قرآن نے اس مقام کے طواف کا حکم دیا وہاں اس مقام کی تعریف کی ضرورت نہیں سمجھی صرف یہ فرمایا کہ یہ اللہ کے شعائر میں ہے۔ اور ساتھ ہی اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اہل کتاب نے اس میں تحریف کر دی تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری توضیح کے باوجود اس کو انھوں نے چھپا دیا تھا۔ قرآن مجید کے ان بیانات کی تفصیل قسط ثانی میں آئے گی۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ آنحضرت صلعم نے مروہ کے پاس قربانی کے جانوروں کو کھڑے دیکھا تو مروہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ "یہ قربان گاہ ہے اور مکہ کے تمام راستے قربانی کی جگہ ہیں" ایک مرتبہ منیٰ کی بابت ارشاد فرمایا کہ "یہ ایک قربانی کی جگہ ہے"۔ حضور کے الفاظ پر غور کرو۔ آپ مروہ کی نسبت تو فرماتے ہیں "ہذا المنحر" یہی قربان گاہ ہے یعنی اصلی قربان گاہ، اور دوسرے مقامات کی بابت تنکیر کے ساتھ صرف 'منحر' کا لفظ استعمال فرماتے ہیں یعنی یہ بھی قربانی کی جگہیں ہیں۔

ہمارے دعوی پر قرآن مجید کے ایک اور پہلو سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے قربانی کے جانوروں کے باب میں حکم دیا ہے کہ ثم محلها الی البیت العتیق (پھران کو قدیم گھر کی طرف لیجانا ہے) نیز فرمایا ھدیا بالغ الکعبۃ یعنی قربانی کے جانوروں کو کعبہ کے پاس پہنچانا چاہئے کیونکہ ان کے ذبح ہونے کی جگہ اسی بیت قدیم کے پہلو میں ہے جس کو اللہ تعالی نے اس مقصد کے لئے سب سے پہلے بنایا۔

اس کے بعد اس امر پر غور کرو کہ مروہ خانہ کعبہ کے پہلو میں واقع ہے اور وہی اصلی قربانگاہ ہے۔ لیکن بعد میں جب امت کا دائرہ وسیع ہوا تو قربانگاہ کے دائرہ میں بھی وسعت کردی گئی۔ اور اہل کتاب میں اور ہم میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ ابراہیمی قربان گاہ بیت اللہ کے پاس ہے جیسا کہ پیدائش (۱۲: ۶-۹) میں ہے۔

پھر قصہ ذبح میں جو واقعات و احوال بیان ہوئے ہیں وہ صرف اسی مروہ پر چسپاں ہوتے ہیں ہیکل والے پہاڑ پر جسکا نام وہ موریا یا مورہ یا مریا وغیرہ بتاتے ہیں یہ حالات کسی طرح منطبق نہیں ہوتے۔ ان حالات کے تطابق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرق کی جانب سے آئے، اپنے دونوں غلاموں کو پاس کے ایک پہاڑ پر چھوڑ دیا اور اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیل کو لیکر لبیک کہتے ہوئے سرگرمی کے ساتھ مروہ کی طرف گئے اور جیسا کہ پیدائش (۱۲: ۶-۸) میں مذکور ہے ابراہیم علیہ السلام کا مسکن صفا کے سمت میں تھا۔ تورات میں اسی سلسلہ میں واقعہ ذبح کی ایک دوسری روایت بیان کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مورہ کی طرف سفر بھی بیان ہوا ہے۔......

لیکن اسمیں صرف سفر ہی کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ذبح کا واقعہ حذف کر دیا گیا ہے۔

یہی گوناگوں اسباب ہیں جنکی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لیکر آج تک صفا اور مروہ کے متعلق بعض روایات اور مناسک بنی اسمٰعیل میں قائم ہیں۔ اور یہود و نصاری کے یہاں ہم ان مناسک کا کوئی نشان نہیں پاتے۔ اس امر کی مزید تفصیل ہم انشاء اللہ چودھویں فصل میں کریں گے

(باقی)

مقالات

سیرت شبلی

(۶)

از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھی۔ کہنا یہ تھا کہ علامہ شبلی جیسے اساتذۂ فن اور مجددین عصر روز پیدا نہیں ہوتے بلکہ صدیوں کے بعد جب تمام ساعد حالات یکجا ہو جاتے ہیں تب ایسی ہستیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ورحکاک کی ہنرمندی اسی وقت کام دیتی ہے جب نگینے میں خود بھی چمک جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ میری ان معروضات کو استاد پرستی پر مبنی سمجھا جائے۔ لہذا اس داستان کو اسکی زبان سے سنئے جو خود اسی میدان کا مرد ہے اور اسی مجلس کی آخری یادگار جس کی روایت کسی درمیانی واسطہ کی محتاج نہیں ہے اور جس کی ذات پر کسی شک کا امکان نہیں ہے۔ جس کی نگاہ دقیقہ رس ہے اور جس کا قلم محتاط جس کی رائے قطعی ہے اور جس کا قول فیصل یعنی بقیۃ الاسلاف فخر الاخلاف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مدظلہ مولانا موصوف اپنے مضمون مطبوعہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ میں فرماتے ہیں

بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی مرحوم کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا عالم و دست استاد کالج میں تھا یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم ملکر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی

یہی کہ وہ جدید اصول کے طرفدار تھے۔ مرعوب نہیں ہوئے۔ بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول مفید تھے ملحوظ رکھا اور ان کو اخذ کیا بلکہ اپنی زندگی کا جزو بنایا۔ نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا مذاق علامہ شبلی سے لیا اور یہ کیفیت پرانی زبانوں میں بھی جواہر ریزے موجود ہیں اگرچہ گرد آلود ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ اسی واقفیت کا ثمرہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف پریچنگ آف اسلام کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر موصوف کی مدد سے یہ فن بھی سیکھ لیا تھا ... کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ سالہا سال محمڈن کالج میں رہے اور سینکڑوں طلبہ نے ان سے پڑھا۔ وہ محض معلم کتب ہی نہ تھے جو کتاب کی عبارت کی شرح کرکے اور صورت دکھا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں وہ استاد شفیق اور محقق تھے جو شاگردوں کے دل میں گھر کرنے والے تھے۔ اس پر بھی ان کے کسی شاگرد نے ان سے وہ فیض حاصل نہیں کیا جو علامہ شبلی کے حصے میں آیا۔ حالانکہ اور شاگرد بھی ان کے ہم عقل تھے نئے کالج کلاسوں کے طالب تھے۔

مولانا شروانی کا یہ ارشاد یقیناً صحیح ہے کہ آرنلڈ صاحب سے اور کسی شخص نے علی گڑھ میں اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جس قدر علامہ موصوف نے۔ اور ظاہر ہے کہ اٹھا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اب تو مسلسل تجربات نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ انگریزی درسگاہوں میں نہ وہ قوت مطالعہ اور صلاحیت اخذ پیدا ہوتی ہے نہ استاد کی شخصیت سے وہ شغف اور شیفتگی جو عربی مکاتب کا مخصوص جوہر تھا، مگر بایں ہمہ اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علی گڑھ کے اس عہد زریں میں پروفیسر آرنلڈ، سر والٹر ریلے اور علامہ شبلی جیسے یگانگان عصر اور استادان فن کا اجتماع طلبہ کے لئے بھی بہت کچھ باعث فیض ہوا۔ کوئی مانے یا نہ مانے، اقرار کرے یا انکار، دعائیں دے یا گالیاں، یہ تو اپنی اپنی سعادت و شقاوت پر منحصر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ نے اس فصل میں پیداوار کا جو نمونہ پیش کیا۔ پھر اس کے بعد آج تک ممکن نہ ہو سکا۔ خصوصیت کے ساتھ السنہ شرقیہ کے ایسے باکمال ادیب پھر پیدا نہ ہوئے جیسے مولانا حمید الدین بی اے، مولوی بہادر علی ایم اے، مولوی داؤد بھائی۔

چودھری خوشی محمد خان، ناظر مولوی سید ممنونا علی نقاش بدایونی، سید سجاد حیدر یلدرم، مولانا ظفر علی خاں مولانا محمد علی مرحوم اور یاد وش بخیر ملک کے مشہور دیباچہ نگار اور انجمن اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب حیدرآبادی۔

علی گڑھ میں مولانا کی خدمات جس طرح آفتاب اپنی شعاعوں کو فضا میں منتشر ہونے سے روک نہیں سکتا اسی طرح ایک اہل علم بھی اپنے گردوپیش کو منور کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اور علی گڑھ میں تو مولانا شبلی کا فرض منصبی ہی علمی افادہ تھا۔ اس لئے ہم اس موقع پر ان تعلیمی فیوض کی تفصیل غیر ضروری سمجھتے ہیں جو مولانا شبلی کی ذات سے علی گڑھ کے طلبہ نے حاصل کئے۔ البتہ مولانا کے دل و دماغ اور دست و قلم سے جو فوائد علی گڑھ کی تحریک کو پہنچے یا خود اس تحریک کی جس حد تک اصلاح ہوئی اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کر دینا کچھ بے محل نہ ہوگا۔ لیکن چونکہ تحریک علی گڑھ کا اصلی کارنامہ مسلمانوں میں تعلیم جدید کی اشاعت ہے لہذا اصل مبحث کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ چند سطروں میں ان محرکات کی طرف بھی توجہ دلائی جائے جن کے ماتحت ہندوستان میں موجودہ طرز تعلیم کی بنیاد پڑی۔

وہ ارباب نظر جنھوں نے ہندوستان میں برطانیہ کے تسلط و اقتدار کی تاریخ بغور پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ایک تجارتی کمپنی نے بتدریج غیر محسوس طریقہ پر اس وسیع اور زرخیز ملک کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے موجودہ حکمرانوں کے مورث بڑی کوشش سے دربار شاہی تک پہنچے۔ پھر جب کچھ دنوں کے بعد نگاہوں کی چکاچوند کم ہوئی اور عرض تمنا کے لئے جنبش لب کی جرأت پیدا ہو چلی تو اولاً آزادی تجارت، اور پھر رفتہ رفتہ خرید آراضی اور تعمیر مستقر کی اجازت حاصل کرتے گئے اس طرح جب قدم جمانے کا موقع مل گیا، اور ملکی حالات سے واقفیت ہو چلی تو نیت بدل گئی، کوٹھیوں میں فراہمی اسلحہ کے لئے سامان تجارت کی حفاظت کا حیلہ تراشا۔ سراج الدولہ کو شکست دینے کے لئے میر جعفر سے سازش کی۔ روہیلکھنڈ کو اودھ سے ٹکرا کر تباہ کیا۔ اور اس کے بعد خود اودھ کے جابر ظالم پیا کو

نے ہر طرف پنجہ پھیلا دیا۔ سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بہادر اور اولوالعزم فرمانروا کو میر صادق کی کور نمکی اور نظام کی سازش و ریاست کی مدد سے بمشکل شکست دی اور اس احسان کے صلہ میں خود اسی ریاست کا بہترین حصہ انگریزوں نے ہضم کر لیا۔ اس تک نوبت پہنچی کہ شاہ عالم کے سپہ سالار نجف جنگ بہادر کا غضب ہوا کہ انہیں ہٹا کر اور ملک ... اپنے خلاف حکومت حاصل کی انہیں کے جانشینوں ... والئی ... کا ... کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ... اپنے ... کے ساتھ نہیں کرتے۔ سکھوں کی امداد سے ہندوستان کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا اور جب کامیاب ہوئے تو خود سکھوں کو ان کی نمک حرامی کی سزا دیدی

دشمن ملک کی ہر جماعت کو ایک ایک کر کے گنڈیری کی طرح چوستے رہے اور جب اپنا کام پورا ہو گیا تو نہایت بے پروائی سے تھوک دیا۔ سچ ہے۔ دشمن ... سلطنہ اللہ علیہ۔

خود انگریز مصنفوں نے یہ حقیقت بہ مجبوری تسلیم کی ہے۔ مسز اینی بسنٹ فرماتی ہیں۔

> ہندوستان کو انگلستان نے اپنی قوت سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستان کی تلوار، رشوت، سازش، منافقت اور انتہائی دھوکہ بازی پر عمل کر کے اور ایک کو دوسرے سے لڑا کے ملک حاصل کیا گیا۔

حکومت چھین لینے کے بعد سب سے بڑا مرحلہ قیام و استحکام حکومت کا سامنے آیا۔ فن سیاست کا یہ مسلمہ قانون ہے کہ جبر و تشدد، فوج و اسلحہ کے ذریعہ سے ایک سلطنت حاصل تو کی جا سکتی ہے مگر تنہا انہیں وسائل کے بل پر قائم نہیں رکھی جا سکتی اور ہندوستان میں تو برطانیہ کے لئے قیام سلطنت میں غیر معمولی دشواریاں تھیں۔ انگلستان اور ہند میں سات سمندروں کا فاصلہ، مذہب جدا، نسل مختلف، آب و ہوا متضاد، تمدن علیحدہ، زبان بیگانہ۔ قصہ مختصر کہیں سے کوئی جائے اتحاد و اشتراک نہ تھی۔

مرا ساتھ کب اس سے ہے نبھنے والا   وہ پچھم میں پورب، وہ گورا میں کالا

مگر برطانوی ہوشمندی نے اس محال کو بھی ممکن بنادیا۔ اور مشرق و مغرب کو یکجا کر دکھایا۔ صورت یہ ہوئی کہ بدقسمتی سے اس وسیع جنت ارضی میں خود بھی اختلاف و کشمکش کے اسباب موجود تھے۔ ہندوستان بجائے خود ایک براعظم ہے، جس میں مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسان آباد ہیں۔ مختلف حصوں میں سیکڑوں ایسی زبانیں رائج ہیں جو دوسرے حصص ملک کے لئے ناقابل فہم ہیں۔ راجپوتانہ، کشمیر، پنجاب، مدراس، سندھ، آسام کیا بلحاظ آب و ہوا اور کیا بلحاظ تہذیب و معاشرت کسی طرح ایک ملک کے مختلف حصے نہیں کہے جاسکتے۔ ہمارے نئے فاتحین نے حصار ہند کا یہی کمزور نقطہ دریافت کرلیا اس لیے حملہ کا سارا زور اسی محاذ پر صرف کرتے رہے۔ اور مختلف تدبیروں سے ہندوستان میں وطنی قومیت کی تشکیل کو بظاہر ناممکن بنادیا۔ کہیں صوبہ جاتی جذبات بھڑکائے گئے، کہیں نسلی اختلافات سے فائدہ اٹھایا گیا، کہیں معاشرتی تفرقوں سے کام لیا گیا، اور کہیں مذہبی جذبات سے کھیلا گیا۔ پنجابی کو بنگالی سے، اچھوت کو برہمن سے، مغل کو پٹھان سے، اور ہندو کو مسلمان سے ٹکرا کر اپنے وجود کی ضرورت ثابت کی گئی۔

جھگڑا کہیں گاؤ کا زبان کی کہیں بحث   چلتا ہے بہت یہ نسخۂ گاؤ زبان

پھر بھی محض اس تنکے کا سہارا تابکے! ۱۸۵۷ء میں کچھ دنوں کے لئے یہ نسخہ بھی بیکار ثابت ہوا۔ اس نے ایک جانب تو قیام امن کے حیلہ سے تمام آبادی کو اس طرح نہتا کردیا کہ صرف ناوک مژہ اور تیغ ابرو لیسنس سے مستثنیٰ رہ سکی۔ اور حضرت اکبر کو اس استثنا کے خلاف احتجاج کی ضرورت پیش آئی۔

عہد انگلش میں بھی ہے آزادی جور بتاں   تیغ ابرو کے لئے حاجت نہیں لیسنس کی

دوسری جانب ملک کے گوشے گوشے میں نفوذ و اقتدار کا پنجہ مضبوط رکھنے کے لئے، ترقی تجارت کے بہانے سے ریلوے کا جال بچھا دیا گیا۔ سرحدی استحکامات پر ملک کی آمدنی کا معتدبہ حصہ خرچ ہوتا رہا۔ جن ممالک کے حدود ہندوستان سے ملحق یا قریب تر تھے ان پر تسلط جمانے کی سیکڑوں تدبیریں ایجاد کی گئیں۔ مصر، شام، بصرہ، قونیہ، عدن، افغانستان، ایران، ٹرکی وغیرہ بلاد اسلامیہ پر

جو مصیبتیں نازل کی گئیں یا آج فلسطین کے عربوں اور سرحد کے پٹھانوں پر نازل ہو رہی ہیں ان کی تمام دلیل صرف آج برطانیہ کے اسی قیمتی ہیرے کا تحفظ ہے جس کو ہندوستان کہتے ہیں۔ غرض اہل ہند کے لئے خود ان کا نشیمن قفس بنا دیا گیا۔ اور قفس میں تو خیر زبان آزاد رہتی ہے، یہاں اسکی بھی اجازت نہ تھی۔

مجھے بھی اذن فغاں مل سکے تو مرغ اسیر ترے قفس سے بدل لوں میں آشیاں اپنا

یہ سب کچھ ہوا مگر پھر بھی ان گورے فاتحین نے ہندوستان کو اس خوف سے اپنا وطن نہیں بنایا کہ مبادا کہیں ان کا دل زمین سے انس نہ پیدا ہو جائے۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے بیرونی فاتح آتے رہے مگر حکومت صرف انہیں لوگوں نے کی جو ہندوستان میں رہ پڑے اور اسکو اپنا وطن بنا لیا۔ اس طرح خواہ کوئی حکومت بھی غیر ملکی رہی ہو۔ انگریزی حکومت کے پیشتر ہندوستان کبھی غلام نہ ہوا تھا۔ نہ کسی دوسرے ملک کی یہ حکومت تھی۔ ہندوستان پر غلامی کی لعنت پہلے پہل ہمارے موجودہ مہربانوں کی لائی ہوئی ہے۔ یہ وہ صداقت ہے جس کو خود ایک ممتاز انگریز "برک" نے تسلیم کیا ہے۔

سابق فاتحین میں اور تم میں ایک فرق تھا وہ یہ کہ ان کی خوشحالی اور بربادی ان کے نئے وطن ہندوستان کی خوشحالی و بربادی سے وابستہ ہو جاتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے پھولے گی۔ وہ کاشتکاروں اور صناعوں سے بڑے بڑے محصول لیتے تھے مگر جن جیبوں کو خالی کرتے انھیں کو دوبارہ بھر بھی دیتے تھے۔ تاتاریوں کی یورش سے بے شک ہندوستان کو عارضی نقصانات پہنچے۔ مگر تمہاری حفاظت تو تباہ کئے ڈالتی ہے۔"

سچ کہا ہے مولانا حالی نے

روسی ہوں یا تتاری ہم کو نہیں گلہ کچھ دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا۔

ملکی صنعت کی بربادی جس کا نزلہ سب سے زیادہ مسلمانوں پر گرا۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھی۔ ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت پارچہ بافی تھی اور یہ سب مسلمانوں کے ہاتھ میں۔ اس صنعت کو جس طرح برباد کیا گیا۔۔۔

اس کی داستان حد درجہ دردناک ہے۔ یہ کہانی بھی خود ایک انگریز مورخ مسٹر ولسن کی زبانی سنئے۔

"ہندوستان کے ساتھ اس ملک نے جس کا اب وہ ماتحت ہے بڑی ناانصافی کی ہے جس کی ایک افسوسناک مثال یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء میں ایک گواہ نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بیان کیا تھا کہ اس وقت تک ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے برطانیہ کے بازاروں میں خود برطانوی ساخت کے مال سے پچاس اور ساٹھ فی صدی سستے بکتے تھے اور پھر بھی تاجروں کو نفع تھا۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ ۷۰ اور ۸۰ فی صدی محصول لگا کر انگلستان کی مصنوعات کا تحفظ کیا جائے۔ اگر یہ امتناعی محصول نہ ہوتا تو مینچسٹر وغیرہ کے کارخانے کھلتے ہی بند ہو جاتے اور بھاپ کی طاقت بھی ان کو حرکت میں نہ لا سکتی۔"

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہو علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں یہ گلچیں ہے یا دشمن ہے گلچیں یا ہے قزاقی

چونکہ سلطنت مسلمانوں ہی سے لی گئی تھی، اور اس وقت تک باوجود انتزاع سلطنت بھی مسلمان کافی طاقتور اور بیدار تھے اس لئے شروع سے ہمارے فاتحین کا طرز عمل رہا کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی ممکن ہو ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے۔ اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت یہ ہے کہ جس حصہ ملک میں جس قدر پہلے انگریزی حکومت قائم ہوئی اسی قدر اس حصے میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور تباہی بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ تباہ حال، جاہل، غیر متمدن، مفلس اور مظلوم مسلمان بنگال کے ہیں۔ اور یہی وہ خطہ ہے جہاں سب سے پہلے کمپنی کا تسلط ہوا۔ صنعت و تجارت کی بربادی کا حال آپ سن چکے اب ان کے ہاتھوں زمینداری، کاشتکاری اور اوقاف کی تباہی کا دکھڑا بھی سن لیجئے۔

کمپنی کی حکومت کے زمانے میں وصولی مالگذاری کا انتظام یہ تھا کہ معمولی درجہ کے بنیوں کو جو مالدار تھے کمپنی کو وقتاً فوقتاً مالی امداد دیتے اور امور خانہ داری کا انتظام کرتے، بڑے لمبے چوڑے ٹھیکے دیئے جاتے۔ یہ لوگ وصولی مالگذاری کے حیلہ سے سخت مظالم کرتے اور زمینداروں کو تباہ کر ڈالتے۔ باایں ہمہ مالگذاری تھی کہ دوگنی چوگنی وصولی کے بعد بھی باقی ہی رہتی اور اس باقی داری کی علت میں لاکھوں کی زمینداریاں سیکڑوں میں نیلام

ہو کر انھیں ہندوؤں کے پاس آ جاتیں۔ اگر کچھ زمینداریاں پھر بھی نیلام سے بچ رہتیں تو ان کا بھی بندوبست کر کے انھیں ہندوؤں کے حق میں کر دیا جاتا۔

وارن ہیسٹنگز کا بنیا کنتو بابو تھا جو بہت سے علاقوں کی مالگزاری کا ٹھیکہ دار تھا۔ جان کمپنی اس وقت ایک شخص کو ایک [illegible] کا ٹھیکہ دار بناتی تو [illegible]۔ گنگا گوبند ایک اور بنیا انھیں گورنر جنرل کا منظور نظر تھا۔ اس نے انھیں زمینوں سے تین کروڑ روپیہ کمائے تھے۔ دوسرے نمبر ہے دیوان رام چندر سنگھ جو خود تو ساٹھ روپیہ ماہوار پاتے تھے مگر جو [illegible] انھوں نے چھوڑا تھا اس کی تعداد ساڑھے بارہ کروڑ روپیہ تھی۔ دیبی سنگھ نامی ایک بنیا کو بنگال کے بہت بڑے علاقے ٹھیکہ پر دیے گئے تھے۔ یہ طرح طرح کے محصول ایجاد کرتا۔ وصول شدہ مالگزاری کو بھی بقایا دکھا کر شریفوں کو ہتھکڑیاں لگوا دیتا۔ زمینداریاں نیلام کرا کے چھوڑتا۔ برک کہتے ہیں۔

> ہندو بنیوں نے انگریزی گورنمنٹ [illegible] جب [illegible] تحصیل [illegible] کرتا ہے۔ مالگزاری کرتا ہے
> دوران [illegible] زمیندار [illegible] در خود گر
> سب [illegible] نیلام ہوتے ہیں [illegible]
> کی داڑھی [illegible] اور وہ [illegible] نے اپنی تجہیز و تکفین اور آباؤ اجداد [illegible] کے لیے
> [illegible] تھیں

کاشتکاروں کی مصیبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ لگان کی وصولی میں طرح طرح کی سختیاں کی جاتیں۔ بعض اوقات قیدیوں کی طرح بند کر دیے جاتے۔ مال و اسباب اور مویشی تک نیلام کر دیے جاتے، گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی جاتی اور جب وہ ترک وطن پر مجبور ہوتے تو فوجوں سے گھیرا ڈال کر واپس کر دیے جاتے۔ مسلمان کاشتکاروں سے تو داڑھی کا ٹیکس بھی وصول کیا جاتا۔ ایک انگریز افسر کا بیان ہے کہ جون ۱۸۳۱ء میں کرشن رائے زمیندار پورنا نے ہر مسلمان کاشتکار پر فی کس ڈھائی روپیہ داڑھی کا ٹیکس لگا کر

وصول کیا۔

سلطنت، صنعت، زمینداری اور زراعت سب کچھ چھن جانے کے بعد ایک پیشہ سرکاری ملازمت کا رہ گیا تھا۔ جو زیادہ تر مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ وہ بھی اس طرح ختم ہوا کہ پہلے تو اعلیٰ عہدے محض انگریزوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے پھر رفتہ رفتہ ماتحتی کی آسامیاں بھی ہندوؤں سے پر کر دی گئیں۔ کیونکہ پہلے عدالتی زبان فارسی ہونے سے مجبوراً زیادہ مسلمانوں کا تقرر لازم تھا۔ جب فارسی اٹھا کر ہر صوبہ میں وہاں کی مقامی زبان دفتروں میں رائج کر دی گئی تو مسلمانوں کی کیا ضرورت باقی رہی۔ اسی دفتری ملازمت کے لئے موزوں اشخاص کی ضرورت نے تعلیم انگریزی کی ترویج کا خیال پیدا کیا۔ لیکن شروع میں کمپنی کے ڈائرکٹر یہ کہکر مخالف ہوگئے کہ "امریکہ میں درس گاہیں قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملک ہاتھ سے جاتا رہا" اس مخالفت کے باوجود بھی انگریزی کے اجرا کی کوشش جاری رہی چنانچہ مسٹر چارلس گرانٹ ڈائرکٹر کمپنی نے ایک رسالہ اس خیال کی تائید میں لکھا جس کے حسب ذیل اقتباسات توجہ کے قابل ہیں۔

"یہ بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم ہندوں کو بتدریج اپنی زبان سکھائیں جس کی وساطت سے اپنے فلسفہ اور الہیات کی تعلیم دیں، یہ تعلیم غیر محسوس طریقہ پر خود ہندوؤں کے باطل عقائد کی بنیادیں ہلا دے گی۔ مسلمانوں نے اپنی حکومت کے دور میں ہندوؤں کے معتقدات اور اخلاق سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس لئے ہم کو اس راستہ میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ کیونکہ ہندو دل کے اتنے بودے ہیں کہ انگریزی پڑھ جانے پر بھی ناممکن ہے کہ ان میں حصول آزادی کا ولولہ یا اس کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ کم سے کم دفتر کی زبان انگریزی ہونے میں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ مسلمانوں نے بھی اپنے عہد میں دفتری زبان فارسی رکھی تھی۔ اس لئے دفتر میں انگریزی کی ترویج سے ہم کو آسانی ہوگی۔ اور ہندو خوشی سے اس کو سیکھیں گے۔ کیونکہ ان کو فارسی سے کوئی خاص انس نہیں ہے اور انگریزی سیکھ جانے سے موجودہ حکومت میں ان کی وقعت بڑھ جانے کی توقع ہے۔"

لارڈ میکالے کے الفاظ اور بھی واضح ہیں۔ وہ اپنی رپورٹ مرتبہ ۱۸۳۵ء میں فرماتے ہیں۔

"ہم کو ایک ایسا گروہ پیدا کرنا چاہیے جو حاکم اور محکوم کے درمیان ترجمان کا کام دے اور جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے انگریزوں کی سی ہو۔"

اپنے والد بزرگوار کو ایک چٹھی میں اپنے دلی جذبات اس طریقہ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"... اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے کوئی ہندو جو انگریزی پڑھتا ہے اپنے مذہب پر سچے دل سے قائم نہیں رہتا۔ اکثر تو عیسائی ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ بظاہر ہندو بنے رہتے ہیں وہ بھی محض بپاس مصلحت۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر ہم لوگوں کی رائے مسئلہ تعلیم میں مان لی گئی تو ۳۰ سال کے بعد بنگال میں ایک بھی بت پرست نہ رہ جائے گا۔"[۵۷]

بھلا ان خوش آیند توقعات کے بعد جو شروع میں کامیاب بھی رہیں انگریزی تعلیم کیوں نہ رائج کی جاتی۔ مگر آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس تعلیم کی اشاعت محض ہندوؤں میں مقصود تھی کیونکہ مسلمانوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ انگریزی پڑھ کر ملت حقہ اسلام سے منحرف ہو جائیں گے۔ یا حصول تعلیم کے بعد حصول آزادی کیلئے ساعی نہ ہوں گے۔

ان خیالات کے جو نتائج ہوئے اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مسلمان جدید تعلیم سے محروم رکھے گئے یہاں تک کہ مسلمانوں کے اوقاف کی آمدنی سے بھی مسلمانوں کے بجائے ہندو فیضیاب

---

۵۷ تبلیغ مسیحیت کا یہ جنون تھا جس کا نتیجہ بہت سے علمائے حق کو اٹھانا پڑا۔ مولوی فضل الحسن حسرت موہانی کے ماموں فاضل حسن موہانی مرحوم کو منصفی سے اس بنا پر استعفا دینا پڑا کہ انھوں نے رد نصاریٰ میں "استفسار" وغیرہ کئی ضخیم کتابیں لکھیں تھیں۔ حضرت مولانا مفتی عنایت احمد مرحوم کو نہ صرف سب ججی چھوڑنا پڑی بلکہ بہ الزام بغاوت حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا بھگتنی پڑی۔ اور مولانا حاجی امداد اللہ مرحوم کو ہجرت کی سعادت نصیب ہوئی

ہونے لگا۔ اور وہ ملازمتیں جو اس وقت ہندوستانیوں کو مل سکتی تھیں، تقریباً کل کی کل اسی جدید الخیال انگریز پرست ہندو جماعت کے ہاتھ میں آگئیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ایک طرف تو دولت کی افراط اور اقتدار کی زیادتی نے ہندوؤں کو حوصلہ مند اور ایک حد تک گستاخ بنا دیا۔ دوسری جانب مسلمان مجبوراً تنگ آمد بجنگ آمد پر عمل کے لئے تیار ہو گئے۔ مدبرین برطانیہ نے اس صورت حال سے متاثر ہو کر اب چشم التفات کا ایک گوشہ مسلمانوں کی طرف بھی مائل کرنا چاہا۔ ۱۸۷۱ء میں ایک انگریز افسر نے مسلمانوں کی تعلیم پر ایک سلسلۂ مضامین کے ذریعہ سے توجہ دلائی جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

> "ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے۔ سالہا سال سے ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ان کی وفاداری کو مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے۔ اور ان کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لئے تھیں، دوسرے کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ غفلت کے بعد ایک عاقلانہ اور فیاضانہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی۔"

یہ ظاہری فیاضی واقعی ہمدردی پر مبنی نہ تھی، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان۔۔۔۔ اس طرح پیس دیا گیا تھا کہ انگریزوں کی رائے میں اب اس سے کسی خطرے کا احتمال نہ تھا اس لئے یہ توقع کی جاتی تھی کہ انگریزی پڑھ کر یہ بھی اپنے مذہب سے بیگانہ اور اپنی روایات سے بیزار ہو جائے گا۔ اپنے اسلاف کا استخفاف اور اپنے علما کا استہزا کریگا۔ تدین کو موجب عار اور تفرنج کو باعث افتخار سمجھے گا۔ غرض مادی حکومت کی طرح دل و دماغ پر بھی انگریزوں کا تسلط قائم ہو سکیگا۔ ادھر بعض دردمند مسلمان ۱۸۵۷ء کے مصائب سے اس قدر خائف ہو چکے تھے کہ صرف برطانیہ کے توسل اور برطانوی علوم کی تحصیل کو مسلمانوں کے بقا کا ضامن و متکفل سمجھتے تھے۔ مناصب سرکاری کے ذریعہ سے جو رسوخ اور اقتدار ملک میں حاصل ہوتا تھا وہ بھی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مگر یہ بڑے عہدے بغیر انگریزی تعلیم کے مل نہ سکتے تھے۔ اس لئے بجز ایک

مخصوص دیندار طبقہ کے بقیہ تمام مسلمان انگریزی کی طرف مائل تھے۔ حکام کی توجہ اور رعایا کی تمنا دونوں کی ہم آہنگی کا زمانہ تھا۔ جب کہ سرسید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد ڈالی۔ اس زمانہ میں سب ہی یوں بھی ایک بڑی چیز تھی۔ علاوہ بریں سرسید کو جو رسوخ گورنمنٹ میں حاصل تھا اس کی بنا پر ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً ان کا کافی اثر تھا۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر سرسید کو ان رؤسا سے جو سرکاری حکام کے زیر اثر تھے کالج کے لئے چندے مل سکے۔ یہاں تک کہ ہندو رؤسا نے کافی امداد کی۔ جہاں کالج کا وفد جاتا انگریز حکام خود بڑے بڑے چندے دیتے اور مقامی رئیسوں سے بجبر دلواتے۔ مولانا نے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"ندوہ کی جماعت ذی اور ... شکستہ لوگوں کی جماعت ہے اس کا دست طلب کسی دامن پر بیباکانہ اور مدعیانہ نہیں پڑ سکتا"

اس فقرہ کا روئے سخن اسی صورت حالات کی طرف ہے۔

مگر باایں ہمہ دو طبقے ایسے بھی تھے جہاں یہ تمام اثرات بیکار تھے۔ ایک تو وہ اعلیٰ طبقہ کے رؤسا جو سرکاری حکام کے احاطہ اقتدار سے باہر تھے۔ مثلاً خودمختار ریاستیں اور ان کے امرا۔ دوسرا طبقہ عوام اور متوسطین کا تھا جس کو گورنمنٹ سے نہ کسی خطاب کی امید تھی نہ عتاب کا اندیشہ۔ اس آخرالذکر طبقے پر سب سے زیادہ اثر علما کا تھا۔ ضرورت تھی کہ مختلف النوع طبقے بھی اس جدید تحریک کی اعانت پر آمادہ کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں طبقوں میں اگر کوئی آواز یکساں طور پر موثر ہو سکتی تھی تو وہ شاعری کی آواز تھی۔ امرا پر شعر کا اثر محتاج بیان نہیں ہے، کون ہے جس کو اپنی مداحی پسند نہ ہو۔ اور ایشیائی امرا میں تو مدح و ستائش کا صلہ دینا تاریخی طور پر ایک قدیم دستور کی حیثیت رکھتا ہے۔ عوام میں بھی تبلیغ و اشاعت خیالات کا ذریعہ نظم موزوں سے بڑھکر آج تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ کون انصاف پسند اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ سرسید کی تحریک کو ہر دلعزیز بنانے کی خدمت جس کامیابی کے ساتھ مولانا حالی کی ایک مسدس نے

انجام دی ہے اس کا عشر عشیر بھی تہذیب الاخلاق کی مجلدات سے نہ ہو سکا۔

انچہ بایک سخن توان کردن   باہزاران سپاہ نتواں کرد

مولانا نے بھی عوام کو متاثر کرنے کے لیے کئی نظمیں خلاف معمول اردو زبان میں لکھیں از انجملہ مثنوی صبح امید اور ایک مختصر سی نظم جو پنیی ریڈنگ تھیٹر میں پڑھی گئی بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ کالج کے لیے مولانا نے وہ کیا جس سے ان کی غیر معمولی بلند نظرت ہمیشہ ابا کرتی رہی اور جس کو انھوں نے اپنے بڑے سے بڑے ذاتی فائدہ کے لیے کبھی ایک منٹ کے واسطے گوارا نہیں کیا۔ وہ کیا؟ امرا کی مدح وستائش خواہ وہ آیندہ حصول صلہ کی نیت سے ہو یا عطائے سابقہ کے شکریہ میں۔

الغرض اپنے نتائج فکر کی متاع گراں ارز کو چند قراضہ ہائے سیم کے عوض میں فروخت کرنا خواہ اکی قیمت پیشگی مل گئی ہو یا بعد کو ملے انھوں نے ہمیشہ انسانی شرف کی توہین سمجھا۔ درنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثر مواقع پر مولانا کو بڑی سے بڑی قیمتیں پیش بھی کی گئیں مگر انھوں نے ہمیشہ اپنے طرز عمل سے یہی جواب دیا۔

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس مسئلہ میں انکو اس حد تک اصرار تھا کہ جو امرا، واہل دول واقعۃً مدح وستائش کے مستحق تھے انکی تعریف میں بھی ان کے جیتے جی مولانا نے قصیدہ تو کیا ایک شعر بھی کہنا گوارہ نہ کیا۔ اس خیال کو انھوں نے اپنی نظموں میں بھی اکثر ظاہر کیا ہے۔ ایک مطبوعہ اردو قصیدہ میں کہتے ہیں

میں نہیں وہ جو کروں مدحت ارباب دول

اپنے مشہور فارسی قصیدے میں جو مطبوعہ دیوان میں موجود ہے فرماتے ہیں۔

گرچہ بر ہیچ ایں شعبدہ بے بر د ظہیر   کایں نہ رازیست کہ مستور ز دانا ماند

لیک با اینہمہ از گرمی ہنگامہ آز   نتوانست کزیں ہرزہ روی وا ماند

بیچارے ظہیر پر کیا منحصر ہے، یہ معصیت تو ایسی عالمگیر ہے جس سے فارسی و اردو کا کوئی قصیدہ

شاہ نظامی و سعدی سے لیکر غالب و حالی تک محفوظ نہیں ہے۔ عوفی زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ امراء کی مدح کے ساتھ اپنا فخر پیدا کر کے اس ذلت کی تلخی کم کر دیتا ہے۔

بہرحال مولانا نے قومی مفاد کی خاطر یہ زہر کا گھونٹ بھی گوارہ کیا اور کالج کی طرف سے امراء کی مدحت میں بھی کئی خطبے لکھے۔

(باقی)

مذاکرہ

"بلاغ الحق"

ازجناب مولوی حافظ سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب امتھوی

مسلمانوں کی تباہی، زبوں حالی، ادبار ونکبت، اور بام عروج وترقی سے یکایک قعر مذلت میں گرنے کا بلاشبہہ واحد سبب ہے، تو یہی، کہ انھوں نے قرآن کو چھوڑ دیا، قرآن سے منہ موڑ لیا اور قرآن کو اس طرح پس پشت ڈال دیا کہ گویا "كِتَابَ اللهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ" کے صحیح مظہر اور ٹھیک مصداق یہی تھے اعیان قوم اور اکابرین ملت نے تشخیص مرض میں اتفاق کے ساتھ علاج بھی واحد تجویز کیا کہ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا" اور مقام مسرت ہے، کہ کم وبیش ہر جگہ قرآن کے تعلیم وتعلم، قرآنی تعلیمات کے نشر واشاعت کی سعی بلیغ ہو رہی ہے۔

انھیں لوگوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو حد اعتدال سے گذر کر افراط وتفریط کو اپنا طرۂ امتیاز بنائے ہوئے ہیں، اور خدمت قرآن کے نام سے احادیث نبوی کے گنجینۂ حکمت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ بغیر حدیث ایک اپنچ نہیں چل سکتے، اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ قرآن جس پر نازل ہوا اس سے زیادہ قرآن کو سمجھنے والا، اور اس سے بہتر قرآن کو سمجھانے والا، روئے زمین پر نہ پیدا ہوا ہے، نہ حشر تک پیدا ہوگا۔ اور حدیث کیا ہے۔ اسی مہبط وحی کا قول وفعل کہ انھوں نے قرآن کو کیا سمجھا، اور کیا سمجھایا؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قرآن مکمل ہے: بلاشبہہ مفصل ہے: لاریب، آسان وسہل ہے: بالکل درست، لیکن اس سے یہ

کہاں لازم آتا ہے، کہ ہر کس و ناکس اس طرح سمجھے جس طرح رسول اللہ صلعم نے سمجھا، اور ہر عامی و جاہل کیلئے اسی طرح سہل ہو جس طرح ایک عالم و فاضل کیلئے. نحو و صرف کے کسی مبتدی طالب العلم کو اگر یہ کہا جائے کہ شرح جامی نہایت مفصل، مبسوط اور سہل کتاب ہے، تو گو یہ واقعہ صحیح ہو، لیکن ایک مبتدی شرح جامی کو کہاں تک سمجھ سکتا ہے، اور اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے، کسی صاحب عقل سے مخفی نہیں، پھر وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ اور فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا وغیرہ آیات سے یہ استدلال کہ قرآن جب سہل ہے، مفصل اور مکمل ہے، تو اس کے سمجھنے کے لئے کسی شرح، کسی تفسیر، کسی حدیث کی ضرورت نہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

ایک پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے، کہ قرآن جب ایک مفصل اور مکمل کتاب ہے، اور ساتھ ہی اس قدر سہل، کہ ہر انسان بغیر کسی تفسیر اور امداد کے سمجھ سکے، تو رسول کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، صرف قرآن بھیج دیا جاتا، سمجھنے والے سمجھ لیتے اور عمل کرنے والے عمل کر لیتے، لیکن نہیں! خدا نے قرآن کے ساتھ ایک معلم قرآن کو بھی بھیجا جس نے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، قرآن کو سمجھایا، قرآن پر خود عمل کیا، تو لوگوں سے عمل کرایا، پھر آج یہ دعویٰ کہ ہم قرآن کو بغیر حدیث کی مدد، اور بغیر رسول کی تعلیم کے سمجھے، یا سمجھ سکتے ہیں احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ صرف اتباع قرآن ہی مامور من اللہ ہے، لیکن آج تیرہ سو برس سے مسلمانان عالم اتباع حدیث کو بھی مامور من اللہ سمجھتے رہے ہیں، سارا قرآن اس ذکر سے بھرا پڑا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ	آپ فرما دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو
اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ	اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریگا اور تمھارے گناہ معاف کر دیگا۔
رَحِيمٌ. قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا	اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، آپ فرما دیں کہ اللہ کی
فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (آل عمران پ ۳)	اور رسول کی اطاعت کرو، پس اگر اعراض کریں تو اللہ کافروں کو

اس سے بڑھکر وجوب اتباع حدیث پر اور کیا شہادت ہوگی کہ خداوند جل شانہ نے اطاعت رسول پر اپنی محبت کا دارومدار رکھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ	اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسلئے کہ اللہ کے حکم سے
بِإِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ	اسکی اطاعت کی جائے، اور جسوقت لوگوں نے اپنی جانوں
جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ	پر ظلم کیا تھا آپکے پاس آتے، پھر اللہ سے مغفرت چاہتے اور
الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا	رسول بھی انکے لیے دعا مغفرت کرتے تو بیشک اللہ کو معاف
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ	کرنیوالا اور مہربان پاتے۔ پس آپکے پروردگار کی قسم، وہ مومن
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ	نہ ہوں گے جب تک کہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بنائیں
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا	اور پھر آپکے فیصلہ کو اپنے دلوں میں ذرا تنگی نہ پائیں اور
(النساء پ ۵ ع ۹)	برضا و رغبت قبول نہ کرلیں۔

نص صریح شاہد ہے کہ اطاعت رسول باذن الہی فرض ہے، اور مزید تشریح کیلئے یہانتک کہدیا گیا کہ "فلا وربك لا یؤمنون" الآیہ کہ جب تک آپس کے اختلافات اور جھگڑوں میں لوگ آپ کو حکم نہ بنائیں، اور آپکے فیصلہ کو برضا و رغبت بلا جبر و اکراہ قبول نہ کرلیں، آپکے رب کی قسم مومن نہیں ہوسکتے۔ اب یا تو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ حکم موقت تھا، اور اب منسوخ ہے، یا اتباع حدیث و سنت کو فرض ماننا پڑیگا، کہ گو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں میں موجود نہیں، لیکن آپ کے اقوال و افعال تو موجود ہیں، جن کے آگے ہم اپنے اختلافات کو پیش کرکے فیصلہ حاصل کرسکتے ہیں۔

وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا	اطاعت کرو خدا کی اور رسول کی، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو
فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (پ ۱۰ الانفال)	ورنہ پراگندہ ہوجاؤگے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

منکرین حدیث ایک ہی ساتھ دو طرح کا ارتکاب جرم کرتے ہیں، ایک تو اطاعت رسول سے انحراف

دوسرے اجماع امت سے اعراض، وہ یہ آیت وجوب اطاعت رسول، اور حرمت اختلاف اجماع پر فیصلہ ناطق ہے۔

حق یہ ہے کہ منکرین حدیث اتباع قرآن کے صرف زبانی دعویدار ہیں، یہ تڑپ، یہ جذبہ ان میں ... تھا جنہوں نے مصیبتیں جھیلیں، اذیتیں اٹھائیں، اور احادیث نبوی کو ایک ایک کرکے جمع کیا، تاکہ سمجھیں کہ اس پاک اور مقدس ہستی نے، جس پر قرآن نازل ہوا تھا، قرآن کو کیا سمجھا، اور اس پر کس طرح عمل کیا ہے، وہ پھر اپنے کو اسی پیکر قرآن کے سانچے میں ڈھال دیں، اور ناممکن ہے کہ اس طرح قرآن کا کوئی گوشہ، کوئی جزو عمل و اطاعت سے چھٹ جائے، بخلاف اس کے انکار حدیث میں یہ خطرہ حد سے سوا بڑھ جاتا ہے کہ کہیں بہت سے احکام الٰہی قصور فہم کے باعث عمل و طاعت سے رہ نہ جائیں، کہ فہم انسانی متفاوت ہیں، اور بعض محض دشمن و دخل، ہو سکتا ہے کہ قرآن میں آپ کو بہت سی باتیں ایسی نظر آتی ہوں جہاں تک دوسروں کی رسائی نہ ہوئی ہو، یا دوسروں کی نظریں وہاں تک پہنچ گئی ہوں، جو آپ کی نظروں سے مخفی ہوں، مثلاً ایک منکر حدیث نے نہایت زور و قوت کے ساتھ عذاب و ثواب برزخ سے انکار کیا ہے، اور ایک دوسرے بزرگ انتہائی زور و شدت کے ساتھ عذاب و ثواب برزخ کو ثابت فرما رہے ہیں، دونوں حدیث کو ہاتھ تک نہیں لگاتے، اور دونوں ہی کا ماخذ قرآن ہے، اب اس اختلاف کیلئے کون حکم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، قرآن تو خود معرض نزاع میں ہے، حدیث کو آپ مانتے نہیں، اجماع امت اور کثرت آراء آپ کے نزدیک کوئی چیز نہیں، پھر یہ جھگڑا کس طرح طے ہو؟

یا محض اتباع ہوائے نفسانی میں، مذہبی قیود اور پابندیوں سے آزادی کے لئے قرآن میں اجتہاد شروع کر دیا جائے، جیسے کچھ عرصہ ہوا، کہ ایک بے قید رسالہ نے قرآن کی رو سے یہ دعویٰ کیا، کہ نماز پنجگانہ نہیں، سہ گانہ فرض ہیں، اور روزے صرف ۹ دن کے۔ اب بتائیے منکرین حدیث کے پاس جواب ہی کیا تھا، حدیث سے وہ قائل کرنے سے رہے، قرآن میں اس مدعی باطل نے کتر بیونت کرکے رکھ دی، اور یہ راہ

تو خود انہیں کی ایجاد ہے۔ آخر ان مدعیان خدمت قرآن سے سکوت کے سوا کچھ نہ بن پڑا، اور جواب دیا گیا۔ تو بعض متبعین حدیث کی طرف سے جو بہت لعنت اور نشانہ ملامت ہیں۔

انکار حدیث کی ایک وجہ وضع احادیث بھی قرار دی گئی ہے، لیکن عقل ؛ اون کے لئے خود اس میں بھی درس عبرت ہے، نہ کہ جائے انکار و احتراز، کہ وہ زمانہ چونکہ خیر القرون سے ملحق تھا، اس لئے وہ شخص بھی جو فتنہ و فساد کی غرض فاسد لیکر کھڑا ہوتا، اطاعت رسول اور اتباع حدیث کے انکار سے ڈرتا تھا، کہ دنیا و دین میں کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ وضعی احادیث ہی سے سہی، انھیں اپنے کو متبع حدیث کی حیثیت سے پیش کرنا پڑتا، گو یہ سود ابہت گراں تھا، اور وہ خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہوئے، لیکن اب زمانہ کافی ترقی کر چکا ہے، مغرب کی ہوائے آزادی سے مشرق پوری طرح متاثر بلکہ مخمور ہو چکا ہے۔ اس لئے مذہبی قیود اور پابندیاں بہت بھاری اور بوجھل بیڑیاں ہیں، جن سے گریز کے لئے سب سے کامیاب اور تیر بہدف نسخہ انکار حدیث تھا، کہ جب تک احادیث نبوی کے وجود کو نہ مٹا دیا جائے، قرآن میں اپنے مطلب کے مطابق اجتہاد و تاویل کی گنجائش نہیں نکل سکتی، حالانکہ اگر بکفلم دین و مذہب یا اتباع قرآن ہی سے انکار کر دیا جاتا، تو اس سے کہیں بہتر تھا، کہ قرآن کو اپنی ہوا و ہوس کے لئے بازیچہ، اپنے اجتہاد و اختراع کیلئے تختہ مشق بنایا جائے، لیکن اس صورت میں نہ اپنوں میں قدر رہتی، نہ غیروں میں کہ غیروں کی قدر دانی تو محض اسی حد تک ہے، کہ مسلمان رہکر اسلام کی بیخکنی کرو، اور مسلمانوں کو برا بھلا کہو۔

یہ تمہید محض اس لئے تھی، کہ آج کی صحبت میں ناظرین کا تعارف اسی قسم کی ایک کتاب سے کرانا ہے، اور سلسلہ تمہید یہ چند باتیں اس لئے گذارش ہوئیں، کہ روئے سخن ذاتی اور شخصی حدود سے باہر عام منکرین حدیث سے ہے، ایسا نہ ہو کہ مصنف علام جن کا میں دل سے احترام کرتا ہوں، اسے اپنی ذات گرامی پر محمول فرمائیں۔

تقریباً ایک سال ہوئے، کہ شمس العلما، حافظ سید محب الحق صاحب پروفیسر ضا پٹنہ نے ایک کتاب

"بلاغ الحق" شائع فرمائی ہے۔ جناب حافظ صاحب قبلہ کے علم و فضل، قرآن فہمی، بصیرت قرآنی سے ماشاء واقف ہیں خصوصاً ہم جیسے مخلصین کیونکر منکر ہو سکتے ہیں، لیکن افسوس!

کایں رہ کہ تو می روی بترکستان است

کا مضمون جناب موصوف پر بھی صادق آتا ہے۔ جناب حافظ صاحب کو یہ شکایت اور حسرت ہے کہ میری کتابوں کا جواب کسی نے سنجیدگی کے ساتھ نہیں دیا، اس لئے میرا خیال تھا کہ اپنے اختلافات کو اس انداز اور سہولت سے جناب مصنف کی خدمت میں پیش کروں، کہ کچھ نتیجہ خیز ہو۔

یہ کتاب ۹۶ صفحات پر تمام ہوئی ہے، سب سے پہلی بحث اتباع حدیث وسنت سے متعلق ہے بلکہ ساری کتاب میں اسی ایک مضمون کی بار بار تکرار ہے۔ پھر عقائد، عبادات، معاملات، اور حلال و حرام وغیرہ عنوانات کے تحت دلائل قرآنی سے استنباط مسائل فرمائے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ صرف قرآن ہی تمام مسائل فقہیہ کے لئے کافی اور بس ہے، حدیث وسنت کی مطلقاً حاجت نہیں، حالانکہ اکثر مقامات میں دانستہ یا نادانستہ طور پر آپ نے حدیث وسنت سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

"عرض حال" ۱ سب سے پہلے عرض حال کے عنوان سے جناب مصنف نے صوبہ سے باہر اپنی پہلی تصنیفات کی مقبولیت کا ذکر اور اہل بہار کی ناقدردانی کا گلہ کیا ہے، حالانکہ یہ بات ٹھنڈے دل سے سوچنے کی تھی کہ باستثنائے شخص واحد، پورے صوبہ میں کوئی بھی آپ کا ہمخیال کیوں نہ ہو سکا، اور کسی نے بھی جناب کی تصنیفات کی قدر کیوں نہ کی؟ کہیں یہ شکایت "یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا" کے تحت میں تو نہیں ہے۔؟

اس کے بعد جناب مصنف پنجاب کے ایک مولانا کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وہ شریعۃ الحق پر اعتراض کرنے، اس کا جواب دینے، اس کو باطل ٹھہرانے کو ڈنکے کی چوٹ

کھڑے ہوتے ہیں ...... بعض بعض جنوں کا جواب دیا گیا، جواب کیا ذاتیات پر حملے کئے گئے، فرقہ پرستی کے جوش میں یہ بھلا دیا گیا .... دوستو! یہ جواب نہیں تردید نہیں، جواب اور چیز ہے، اور دل کے پھپھولے توڑنا اور بات، مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا، قرآن کا بطلان تو گویا کفر کا خزینہ تھا" صـ

گویا آپ کی تصنیفات بھی قرآن ہیں، اور آپکے خیالات وحی ربانی کہ آپ کی تصنیفات کا منکر قرآن کا منکر، اور آپکے خیالات کے آگے سر نہ جھکانے والا کافر، اور یہ میری محض لفظی گرفت نہیں، بلکہ آگے چل کر جناب مصنف نے مزید صراحت کے ساتھ یہی دعوی کیا ہے، ۔

"اپنے تجربہ کی بنا پر میں جانتا ہوں کہ لوگ یہ سمجھ کہ قرآن سے سر جھکا رہے ہیں، مجھے برا بھلا کہنے کو کھڑے ہوں گے اور یہ الکھا ہے آپ انھیں نے کیونکہ میں نے کسی بات کا مدعی ۔ یہ ا کچھ دعوی میرا دعوی ہی ہے جو قرآن کا دعوی"

لیکن اس دعوی کی دلیل کیا ہے، کہ آپ کا دعوی عین قرآن کا دعوی ہے۔ اور آپکے تمام قرآنی اجتہاد قرآن کی طرح اٹل ہیں، ایک شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ قرآن کی رو سے نمازیں صرف تین وقت کی فرض ہیں، تو کیا یہ دعوی قرآن کا دعوی، اور اس قول کا منکر قرآن کا منکر ہے، ایک طالب قرآن اور مبلغ قرآن کی زبان سے ایسے بلند بانگ دعوی پر مجھے افسوس ہے، علمائے متقدمین اور ائمہ مجتہدین جنھوں نے قرآن میں غور و فکر کی انتہا کر دی، اور قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دیں، ان میں سے کسی نے بھی اپنے دعوی کو قرآن کا دعوی، اور اپنے منکر کو قرآن کا منکر نہ کہا، اسی لئے ان پر قرآنی حقائق و معارف اور اسرار و رموز اس طرح روشن ہوئے، کہ مجتہدین عصر آج بھی انھیں کی تحقیقات کو رنگ آمیزیوں کے ساتھ اپنی تحقیقات کہکر پیش کر رہے ہیں۔

آپ کی تحقیقات سے اگر کوئی اختلاف کرے، اور آپ کی تصنیفات پر اعتراض کرے، تو وہ ذاتیات پر حملے کرتا ہے، دل کے پھپھولے توڑتا ہے، لیکن آپکے اعتراضات کی زد جو ائمہ مجتہدین، علمائے محدثین

فقہائے متقدمین تک پہنچتی ہے۔ یہ کوئی چیز نہیں، اور آپ کا یہ نشتر جو شہ رگ پر پڑ رہا ہے، نشتر نہیں مرہم ہے۔ ۵
مشتے نمونہ از خروارے:

"قیامت کے دن خدا اس کا فیصلہ کریگا کہ حدیث کا بدیل قرآنی تنقید کرنیوالا، یا حدیث کو کتاب اللہ
اور کتاب رسول اللہ ہونے کا منکر، اور ظنی سمجھنے والا کافر ہے یا قرآن کی آیتوں کا منکر، یا قرآن کی آیتوں سے
کفر کرنے والا، یا قرآن کی آیتوں کو غیر خود خدا کے منسوخ کئے ہوئے، جو خود اس نے نہ کیا، اپنی اپنی رایوں سے
منسوخ کرنیوالا، اور حدود قرآنی کو بربنائے روایت کم و بیش کرنے والا، اور خدا کے احکام میں اوروں کو شریک
کرنے والا کافر ہے"۔ ص ۸

یعنی آپکے سوا ساری دنیا کافر ہے، بلکہ ائمہ مجتہدین اور علمائے محدثین سب سے بڑے کافر کہ انہیں نے
فقہ اور حدیث کی تدوین کرکے کفر کی تبلیغ کی اور کفر پھیلایا، نعوذ باللہ، ص ۲۳ پر ارشاد ہوتا ہے۔

"پھر حدیث کو ظنی کہتے ہو، تو اس کو قطعی قول رسول کیوں سمجھتے ہو، یوں کیوں نہیں کہتے کہ رسول نے یوں فرمایا
ہوگا، جو اقتضائے ظن ہے، کیونکہ موضوعات کے رواج کے بعد حدیث جمع ہوئی، پھر جو بات رسول اللہ نے نہ فرمائی ہو،
اس کو آپکے ساتھ وہم و ظن کی حالت میں منسوب کرنا رسول کی شان کے خلاف، رسول پر افترا اور کیا حدیث ہی
کی رو سے جہنم کی راہ نہیں"۔

آپکے نشتر زنی کی حد یہیں تک ختم نہیں ہوتی، بلکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بھی ہاتھ صاف
کرنے سے باز نہیں آتے۔

"دین میں خلافت کا منصب داخل کیا گیا، قرآن سے نہیں حدیث سے، اس سے فرقے بنے، اور لا تفرقوا
کی نافرمانی کی گئی"۔

اس سلسلہ میں آپنے اپنی تصنیفات اور خیالات کی قطعیت کیطرف لوگوں کو مائل کرنے اور اطمینان عام
کے لئے چند تقریظیں بھی رقم فرمائی ہیں، جنمیں سب سے نمایاں اور پر زور طریقہ پر جناب مولانا حضرت سید شاہ بدر الدین صاحب

سابق سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف وامیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ کی تقریظ پیش کی گئی ہے کہ انھوں نے میری دونوں کتابیں شرعۃ الحق اور منہاج الحق کو چھپنے کے قبل بارہا تقاضا فرما کر طلب فرمایا، اور میری زبان سے من اولہ الی آخرہ سنکر عنداللہ یہ رائے دی، کہ مجھے پیری مریدی کے مسئلہ کے سوا ساری کتاب سے اتفاق ہے کہیں اختلاف نہیں"،

عرض یہ ہے کہ جب آپنے اتنی زحمت اٹھائی اورحضرت امیر شریعت نے "من اولہ الی آخرہ" سننے کی تکلیف گوارا فرمائی، اور عنداللہ انھیں آپکے خیالات سے اختلاف بھی نہ تھا، تو پھر اس زبانی تقریظ کے کیا معنی۔

آج جبکہ حضرت امیر شریعت علیہ الرحمہ ہم لوگوں میں موجود نہیں، اور نہ ان کی مہر کردہ تقریظ آپکے پاس ہے۔ آپ کو کیا حق ہے کہ ان کی طرف کسی قول کو منسوب کریں؟ جس طرح متبعین حدیث سے آپ رسول کی مہر کردہ حدیث کا مطالبہ کرتے ہیں، کم از کم آپ کو اپنے خیال اور اصول کے مطابق اتنی احتیاط ضروری تھی، ورنہ "یقولون مالا یفعلون" کا مظہر بننے سے کیا فائدہ

علاوہ ازیں آپ کی یہ روایت درایتاً بھی صحیح نہیں، کہ دنیا جانتی ہے، کہ حضور امیر شریعت علیہ الرحمہ کس قدر صحیح الخیال، کتنے راسخ العقیدہ، کیسے صاحب علم و فضل بزرگ تھے، اور پھر آپ کی یہ تقریظیں آپ کے اصول و عقیدہ کے مطابق بھی ناقابل قبول ہیں، کہ یہ خبر احاد ہیں اور خبر احاد ظنی اور کذب وافترا، اور ان الظن لا یغنی من الحق شیا۔

آگے چل کر آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں خدا کے آگے سر جھکائے سب سے بے نیاز قرآن مجید کی تبلیغ جو کرتا رہا ہوں کرتا رہوں گا"

آپنے اتنے عرصہ تک جو کچھ کیا۔ قرآن مجید کی تبلیغ کے لئے نہیں، اپنے خیالات وعقائد کی تبلیغ کے لئے کیا، آپ کی تمام تر تصنیفات اس کی شاہد ہیں، خدمت قرآن یا تبلیغ قرآن کے معنی یہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ

کسی خاص خیال اور عقیدہ کو ٹھیک قرآن میں فٹ کیا جائے۔ یہ تو قرآن کے ساتھ کھیلنا ہوا۔ اور اپنے خیالات و عقائد کا قرآن کو تابع بنانا۔ اور اس تعصب کے ساتھ قرآن کے حقیقی مفہوم تک پہونچنا معلوم!

اسی بات سے آپ کا یہ دعویٰ بھی مردود ہے کہ ہمارا کام فرقہ سازی نہیں بلکہ حسب منشاء [illegible] علماء [illegible] ہے کہ اگر اس کو حقیقت سے کوئی لگاؤ ہوتا، تو تمام مسلمانوں سے علیحدہ [illegible] کرنے اور [illegible] کی جداگانہ بنانے کا کیا مطلب؟ حدیث سے کسی تعصب اور [illegible] کے نتیجہ میں آپ قرآن کی یہی خدمت کر سکتے تھے، جو کرنے والے کر رہے ہیں۔

(باقی)

دائرہ حمیدیہ کی ایجنسی

لاہور میں

لاہور میں دائرہ حمیدیہ کی تمام اردو مطبوعات اور الاصلاح کی ایجنسی قائم ہوگئی ہے، وہاں سے مندرجہ ذیل کتابیں اپنی اصلی قیمت پر ملیں گی جو لوگ زائد مصارف کے متحمل نہیں ہوسکتے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

تفسیر سورہ فیل	۸/	تفسیر سورہ اخلاص	۵/
تفسیر سورہ کوثر	۸/	تفسیر سورہ کافرون	۴/
تفسیر سورہ لہب	۲/	الاصلاح فی پرچہ	۴/

ملنے کا پتہ: محمد عمر خاں نیوز ایجنٹ کالج بک سٹال چوک نیلا گنبد انار کلی کچہری لاہور۔

موعظتِ حسنہ

بنیادی رذائل

(۲)

از جناب مولوی عزیز الرحمن صاحب اصلاحی

کھانے کی طمع پرخوری کا روگ ان افراد میں ہوتا ہے جن کے احساسات و میلانات پست اور جن کے جذبات و وجدانات پژمردہ ہوتے ہیں جن کے ذہن سے فکری بلندی اور روحانی ترقی کے خیالات محو ہوجاتے ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد بجز انواع و اقسام کے کھانوں سے مزہ لینے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کھانوں کی لالچ ایسی برائی ہے جو معنویات کے شوق کو بالکل مردہ کردیتی ہے۔ جب کسی شخص کے معنوی مقاصد کمزور ہوجاتے ہیں تو مادی مقاصد کا زیادہ زور ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ مادی مقاصد صرف کھانے کی اشتہا کے اندر سمٹ کے رہ جاتے ہیں

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ کھانے کی طمع ایک ایسی بیماری ہے جو تمام حواس پر مستولی ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کا اثر انسان کی مزاجی خصوصیات پر نہایت گہرا پڑتا ہے۔

ثقیل اور مرغن کھانوں میں اسراف کی وجہ سے انسان اپنی جنسی خواہشوں کی تکمیل میں نڈر اور مسرف ہوجاتا ہے۔ زندگی کو ایک متاع سمجھ کر افراط سے کام لیتا ہے۔ اور اس طرح اس کے دل کے اندر احساسات کے تمام سرچشمے خشک ہوجاتے ہیں، جذبات میں درشتی آجاتی ہے۔ اور اس کا دل پتھر ہوجاتا ہے۔ اور وہ رفتہ رفتہ ابتدائی حیوانی فطرت کی طرف جھکنے لگتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ جو شخص لالچ کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے، وہ خود پرستی کا ایک پیکر ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے دردو دکھ پر نہ توجہ کرتا ہے اور نہ ان کے بارے میں سوچنے کی زحمت برداشت کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ دوسروں کی بڑی سے بڑی مصلحت میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی قربانی بھی کرسکے۔ یونانیوں اور رومیوں میں جب لالچ عام ہوئی تو اس کا دردناک نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وطنی اسپرٹ کمزور ہوگئی۔ لذیذ کھانوں کی چاٹ نے ان کے اندر سے قربانی کا جذبہ مٹا دیا۔

پُرخوری ایک ایسا مرض ہے جو فرد اور سماج دونوں کے لئے یکساں مہلک ہے۔ فرد کے اندر اس سے خرابی جگر، ضعف معدہ اور ضعف قلب کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں اور انہی کے ساتھ ساتھ ان کے لازمی نتائج یعنی سستی، استرخاء اور مردنی وغیرہ۔ اور سماج پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بلند مقاصد سے بے پرواہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ افراد اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں وہ زندگی کے لمحات کو غنیمت سمجھکر ان کو لذتوں میں گذارنا چاہتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ کھانے کی خواہش میں حد سے تجاوز کی وجہ سے دوسرے میلانات اور خواہشوں میں بھی بے اعتدالی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور اس خواہش میں اعتدال پیدا کرنے سے دوسرے میلانات میں بھی اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اعتدال دلیل ہے اس بات کی کہ انسان اپنی طبیعت کو قابو میں رکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور چونکہ اعتدال دلیل ہے طبیعت پر قابو کی اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ طامع اور پُرخور شخص حضریت کی خصوصیات سے بالکل محروم ہے کیونکہ حضریت نام ہے اعتدال کا یا دوسرے لفظوں میں انسان کے اپنے نفع ونقصان سے واقف ہونے کا۔

جو مریض اس مرض کے شکار رہیں ان کی اصلاح کی صرف ایک شکل ہے کہ ان کے دل ودماغ کو مطالعہ اور فنون وغیرہ سے دلچسپی لینے کی طرف مائل کیا جائے۔ اس طرح ان کو آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگے گا کہ اس دنیا میں کھانے پینے کی لذت سے بڑھکر بھی لذتیں ہیں اور وہی اصلی لذتیں ہیں۔

حسد | حسد کا جذبہ اس شخص میں پیدا ہوتا ہے جو اپنے دل کا اعتماد کھو دیتا ہے، جسے اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں اپنی قوتیں عاجز و درماندہ نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے مقصد کے حصول میں کچھ کرنے کے بجائے صرف ایسے لوگوں کی ٹوہ میں رہتا ہے جنھوں نے کامیابی حاصل کرنے میں اپنی عمر اور اپنی قوت کا بہترین حصہ قربان کیا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کا مرتبہ گھٹ جائے۔ انکی شان میں فرق آجائے اور وہ عام نگاہوں میں شعبدہ باز اور فریبی معلوم ہونے لگیں

درحقیقت حسد ایسا جذبہ ہے جو ولولہ کو مٹا دیتا ہے اور ہمت کو فنا کر دیتا ہے۔ انسان کو ہمیشہ بیوقوفی، کاہلی اور بدحواسی کے عالم میں پڑے رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں اس جذبہ کی وجہ سے انسان کے اندر خبث پیدا ہو جاتا ہے، اس کے تمام اخلاق پر کذب و نفاق کا تسلط ہو جاتا ہے۔

یہ بدیہی ہے کہ حاسد خود اپنے اندر کامرانی سے ہمکنار ہونے کی کوئی قوت نہیں رکھتا۔ وہ ساری قوت کامیاب کی ایذا رسانی میں صرف کر دیتا ہے۔ کامیاب آدمی کا وہ جانی دشمن ہوتا ہے، وہ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے اور مکارانہ چالیں چلنے میں مستغرق رہتا ہے، اور جہاں اسکو موقع مل جاتا ہے اپنے ارادہ میں قضا مبرم کیطرح بیباک ہوتا ہے۔

حاسد کامیابی حاصل کرنے کی کوئی قوت نہیں رکھتا ہے اس لئے چاہتا ہے کہ کسی قریب سے قریب راستہ سے اس تک پہنچ جائے۔ یعنی وہ چغلخوری، سازش، اور بڑوں کی خوشامد و تملق سے میدان جیتنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جس کے دل میں حسد کا جذبہ گھر کر لیتا ہے اس کو اسی میں مزہ ملنے لگتا ہے۔ اور اس جذبہ کی آخری حد یہ ہے کہ حاسد صرف کسی مخصوص و متعین شخص ہی کو برا نہیں سمجھتا ہے بلکہ اسے ہر باعمل اور کامیاب انسان سے نفرت و عداوت ہوتی ہے۔ اس وقت حاسد بالکل ایک مریض ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق سے وحشت ٹپکتی ہے۔ اس کے پاکیزہ اور نرم جذبات پژمردہ ہو جاتے ہیں اور بالآخر اس کا یہ روگ ترقی کر کے اسے ارتکاب جرم کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔

شکسپیر نے اپنے ڈرامہ عطیل" میں یاگو کی شخصیت میں جذبہ حسد کی ہلاکت آفرینیوں کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

یاگو غصہ سے بے تاب ہے۔ حاسدانہ بے بسی نے اسے مجنون بنا دیا ہے۔ کیسو کاسیو سے حسد ہے۔ چاہتا ہے کہ اسے ہٹا کر عطیل کے ہاں خود اس کی جگہ لے لے اور علمبرداری کی خدمت اسے تفویض کر دی جائے۔ یہ ارادہ کرتا ہے اور حریف کے خلاف لگانے بجھانے کی تمام سازشوں میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ بڑھ کر عطیل کے کانوں میں کہتا ہے کہ کیسو کاسیو اس سے گھات کر رہا ہے۔ اس کو دغا دے رہا ہے اور اس کی بیوی کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ یاگو یہ خوب جانتا ہے کہ عطیل غیر تند ہے۔ اس کے کہنے سننے سے کاسیو کو قتل کر دیگا مگر باوجود اس کے اس کو اپنی حرکت پر کچھ افسوس نہیں ہوتا کیونکہ حسد نے اس کو دیوانہ بنا دیا ہے اور اسے حد جرم تک پہنچا دیا ہے۔

لیکن بالآخر عطیل پر اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ یاگو کو کاسیو سے قتل کرا کے اس کی اس حرکت کی سزا دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ حاسد کا قدم آخر میں پھسلتا ہے۔ اس کی رسوائی ہوتی ہے۔ لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ بے بسی سے کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ جنث، فریب اور غیبت ذہنی، طاقت شخصی بلندی، اور قابلیت کی جگہ نہیں پا سکتے۔

حاسد کی امیدوں کا منتہا یہ ہوتا ہے کہ وہ کامیاب اور دوسروں کا ہمسر ہو جائے۔ جب اپنے اندر یہ قوت نہیں پاتا تو دوسروں کی ادھیڑ بن پر اتر آتا ہے۔ اس لئے کھلم کھلا اس کے مقاصد پوری سوسائٹی کے نظام سے ٹکراتے ہیں۔

متکبر | یہ خوبی کی صفت ہے کہ تم خوددار بنو، لیکن یہ بہت برا ہے کہ تم متکبر بن جاؤ۔ خودداری نام ہے پستیوں سے ترفع، شرف کے احساس اور عزت نفس کے خیال کا، لیکن تکبر تمہارے اور لوگوں کے درمیان ایک برزخ ہے۔ تم لوگوں کو حقیر و پست سمجھنے لگے تو لوگوں پر اپنی بڑائی

کا اظہار کرتے ہو، نئی عقلوں کا استخفاف کرتے ہو، ان کے مراتب سے بے پروائی برتتے ہو اور اپنے تئیں اپنا اور دوسروں کا فرمانروائے مطلق خیال کرتے ہو۔

قدیم زمانے کے امرا میں یہ برائی بہت تھی۔ اسکی وجہ سے ان کے درمیان بغاوتوں کی آگ بھڑکی، انکا شیرازہ سلطنت بکھر گیا، ان کے ملک تباہ ہو گئے اور ان لڑائیوں میں ان جنگوں سے کہیں زیادہ خون بہایا گیا جو ذہنی تعصب اور مذہبی اختلافات کی وجہ سے لڑی گئیں۔

تکبر فرد کو جماعت سے بالکل علحدہ کر دیتا ہے۔ متکبر کا دل ہمدردی کے جذبہ سے خالی ہوتا ہے۔ اسکی نظروں میں بہت سے خیالی حقوق پیدا ہو جاتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ عام لوگوں سے کنگر کوشش کرتا ہے۔ گذشتہ زمانہ میں امرا کے مخصوص امتیازات نے تکبر کی تخلیق کی تھی۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے طبقوں کے درمیان حدود قائم کئے، جس کی وجہ سے بہت سی مصیبتیں پیش آئیں۔

بڑے سرمایہ داروں اور اعلی عہدے رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کا سر غرور سے پھرا رہے، ان کی ذہنیت بالعموم قدیم زمانہ کی ارسٹاکریٹک ذہنیت کے مشابہ ہوتی ہے۔ وہ جماعت کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ اپنی پوری قوم کو اپنے آگے سربسجود دیکھیں

جو لوگ ایسے متکبرین کے مقرب ہوتے ہیں۔ ان میں تملق و خوشامد کی عادت ہوتی ہے۔ متکبر اپنے حاشیہ نشینوں کی خوشامدوں سے نہایت محظوظ ہوتا ہے۔ اور یہ ذوق جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کے اندر سے عمل، قابلیت اور خدمت کے جذبات فنا ہوتے جاتے ہیں۔

متکبر خوشامد کی قدر قابلیت سے زیادہ کرتا ہے، کیونکہ خوشامد کا مرجع خود اس کی ذات ہوتی ہے اور قابلیت کی تمام سرگرمیاں دوسروں کے لئے ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کا دماغ اس درجہ بگڑ جائے وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے یکساں خطرناک ہو جائے گا۔

خود اس کے لئے خطرہ ہے کہ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں اپنی کمزوریوں کے مواقع کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ کرتا ہے غلطی اور سمجھتا ہے کہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ عمل کی نمائش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہی عمل ہے۔ خوشامدیوں کو مقرب بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ارباب علم و عمل کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

اسی لئے مصلحین متکبرین سے بہت ڈرتے ہیں۔ لیکن خوشامدی ایسے ہی احمقوں کی تلاش میں رہتے ہیں کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسے سرپھروں کو بیوقوف بنا کر ان سے اپنا مطلب نکال لینا بہت آسان ہے۔

تکبر خواص و عوام میں سے جس کے اندر بھی ہو، ایسی رذالت ہے جو خود پسندی سے پیدا ہوتی ہے، اور ظلم و قساوت اس کے لوازم میں سے ہے۔ آدمی اس کی وجہ سے اندھا ہو جاتا ہے اور اپنے نقائص کو دیکھنے سے بالکل قاصر۔ تکبر اس کے اخلاق کو بالکل مسموم کر دیتا ہے۔ اور وہ خوشامد اور تملق کو ضرورت اور مصلحت جان کر پرورش دیتا ہے۔

تکبر کا علاج یہ ہے کہ متکبر جبکہ وہ خاص کر امراء کی جماعت سے ہو، ہفتہ میں ایک بار عام قبرستان میں جا کر دیکھے جہاں بڑائی اور عظمت کے تمام منارے یکساں سرنگوں نظر آتے ہیں، اور سب کے سب سڑنے اور فنا ہونے میں یکساں ہیں۔ اس وقت متکبر کو اپنے نفس کے حدود کا علم ہوگا، وہ اپنی بدبختی کا اندازہ کرے گا۔ اور ہمدردی و مساوات کی ضرورت کو سمجھ سکے گا۔

یہی رذائل کبریٰ ہیں جن سے اور رذائل وجود میں آتے ہیں۔ یہ تھوڑے بہت ہم میں سے ہر انسان کے اندر موجود ہیں۔ پس جو شخص جس قدر ان میں اصلاح کریگا وہ اسی قدر اچھے نمونے کے قریب ہوتا جائیگا اور جب صبر و ہمت اور طویل مجاہدہ سے ان میں سے ہر ایک سے چھٹکارا حاصل کرلے گا تو وہ ہیرو اور مقدس ہو جائے گا۔ یہی روحانی کمال اور اعلیٰ انسانیت کی اصلی شاہراہ ہے۔

حکمتِ غرب

مارکس ارلیس کے خیالات

از

جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے

وہ شخص جو عقل اور اپنے اندرونی شرارۂ الوہیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اپنا مقدم فرض سمجھتا ہے وہ آلامی اداکار دیریجک ایکٹر نہیں ہے۔ وہ نہ تو آہ سرد کھینچتا ہے، نہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے، نہ احباب کے جم غفیر کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں نہ تو موت کا جویاں ہوتا، اور نہ اس سے گریزاں۔ اس کیلئے یہ بات ذرا اہم نہیں کہ اسکی روح اس کے جسم میں ایک طویل مدت تک محبوس رہی یا قلیل مدت تک اگر اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ ایک لحظہ میں بعجلت تمام اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو وہ اس طرح رخصت ہو جائے گا گویا اس کے پیش نظر ایک مقصد متعین ہو چکا ہے جس کا حصول بہ طریق احسن ممکن ہے۔ اس کو اپنی ساری زندگی میں صرف اس بات کی ...... فکر ہوتی ہے کہ وہ اپنے دماغ کو کسی ایسی چیز کی طرف گمراہ نہ ہونے دے جو عقل اور عام اجتماعی زندگی سے بیگانہ ہے۔

تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کے بعد انسان کے دل میں رستے ہوئے زخم یا ناسور اور چھپے ہوئے گناہوں کی نجاست کا وجود ناممکن ہے، اس ایکٹر کی مانند جو اپنے پارٹ کے مکمل ڈرامہ کے ختم ہونے سے پیشتر اسٹیج سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کا پیمانۂ حیات قبل از وقت لبریز

نہیں ہوگا۔ ایسا انسان تصنع اور غلامانہ فطرت سے یکسر پاک ہوتا ہے وہ نہ تو دوسروں میں ضم ہوتا ہے اور نہ ان سے بالکل بے تعلق۔ اور نہ وہ اپنی سیرت کے کسی عنصر کے باعث محاسبہ سے خائف یا نگاہ عام سے پوشیدہ رہنا چاہتا ہے۔

اس ذہنی قوت کا احترام کرو جس کی کارفرمائی فکر و آراء پر ہوتی ہے۔ اس میں ایسی مکمل قوت ہوتی ہے کہ ہر اس رائے کو جو فطرت اور انسان کے نظام جسمانی سے بے میل ہوتی ہے اس کو عقل کی قوت پر زور اثر انداز نہیں ہونے دیتی۔ فیصلہ میں محتاط، انسان سے مانوس اور خدا کا فرمانبردار بندہ ہونا اسی قوت مدرکہ کا عطیہ ہے۔

جو خیال دماغ میں پیدا ہو ہمیشہ اس کو بصراحت متعین کر لو اور اس کا خاکہ تیار کر لو۔ اس کی مکمل تجزیہ اور اس کی ماہیت پر غور کرو۔ اس کے تمام اجزا پر فرداً فرداً اور مجملاً گہری نگاہ ڈالو کل اور اسکے ان تمام اجزاء ترکیبی کے صحیح نام کی تکرار دماغ میں بار بار کرو جو بعد کو کل میں تحلیل ہو جائیں گے۔ اگر ہم ان چیزوں کی تحقیقات جن پر زندگی میں ہماری نظر پڑتی ہے، ضمیر اور ضابطہ کے مطابق کریں تو اس سے زیادہ اور کوئی شے ہم کو عالی منش نہیں بنا سکتی بشرطیکہ ساتھ ہی ساتھ ان چیزوں پر عادتاً اس طرح نظر ڈالی جائے کہ دنیا کی ہر چیز کا فعل، دنیا کی فطرت اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ دنیا انسان کے لئے اور دوسری چیزوں کے لئے کہاں تک مفید ہے۔

ہم کو ہر چیز پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ وہ حقیقتاً کیا ہے۔ جو اس وقت ہم پر اس طرح اثر انداز ہو رہی ہے، اس کے اجزاء ترکیبی کیا ہیں؟ اس کا فطری دور زندگی کتنا ہے؟ اور یہ کن خوبیوں کو دعوت جنگ دیتی ہے۔ کیا یہ چیز حلم، جرات، صداقت، وفاداری، سادگی، خود اعتمادی اور

اس قسم کی دوسری خوبیوں کی حریف ہے۔ جب کبھی ایسی صورت حال رونما ہو، انسان کو اپنے فیصلہ پر پہنچکر اس کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ "یہ خدا کی طرف سے ہے" "یہ مصلحت الٰہی ہے جس کو مقدر، اتفاق اور افتاد کی گمتی نے میرے لئے مقسوم کر دیا ہے" "یہ ایک ایسے ہم وطن، ایک ایسے عزیز، ایک ایسے شریک کار کا عطیہ ہے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ کیا چیز اس کے فطرت سے ہم آہنگ ہے، وہ بے خبر ہے، میں واقف ہوں"، ان اسباب کی بنا پر اس کے ساتھ اجتماعی زندگی کے اصول کے مطابق مہربانی اور انصاف کا سلوک کرو جو عین فطرت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ غیر اہم چیزوں کی اضافی خوبیوں کو معلوم کرنیکی کوشش کرو۔

اگر عقل سلیم کے مطابق جوش، بشاشت، مسرت کے ساتھ، فروعی معاملات سے غیر متاثر ہوکر اپنے شرارۂ الوہیت کو اس قرض کی طرح جس کا مطالبہ کسی لحظہ ہو سکتا ہے۔ محفوظ اور پاک رکھکر تو اپنے پیش نظر کام میں استقلال کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے اور نہ کسی چیز کا منتظر ہے اور نہ اس سے خائف ہے بلکہ اپنی موجودہ فطری جدوجہد پر قانع اور صداقت تقریر کا سختی سے پابند ہے تو تیری زندگی مسرور ہوگی جس کی تکمیل مسرت میں کوئی شخص خلل انداز نہیں ہو سکتا۔

ان اطبا کی طرح جو ناگہانی امراض کے علاج کی غرض سے ہر وقت اپنے اوزار و نشتر پاس رکھتے ہیں تجھکو بھی اصول فلسفہ سے ہمہ وقت باخبر رہنا چاہیے تاکہ تو انسانی اور یزدانی میں تمیز کر سکے اور ہر کام کو، اسکی معمولی سے معمولی جزئیات کے اعتبار سے اس انسان کی طرح انجام دے سکے جو ان تعلقات سے واقف ہے جو خدا اور انسان کے درمیان رشتہ و ربط قائم رکھتے ہیں

گمراہیوں سے پرہیز کر۔ تو اپنی شرح ان قدیم یونان اور روم کے قصوں اور اس مجموعہ نظم کو جو اپنی ضعیفی میں پڑھنے کیلئے تو محفوظ کر رہا تھا کبھی بھی نہیں پڑھیگا پس منزل مقصود کی طرف تیزی سے بڑھ۔ ان مہمل امیدوں کو چھوڑ دے۔ اگر تجھکو اپنی اور اپنے خاندان کی فکر ہے تو قبل اس کے کہ پانی سر سے گذر جائے تو خود اپنی حاجت روائی کر۔

جسم، روح و دماغ تین مختلف چیزیں ہیں۔ جس کا تعلق جسم سے، تحریک طبعی کا روح سے در اصول کا دماغ سے ہے۔ ظاہری چیزوں کے اثرات جنگل کے حیوانات بھی اپنے اندر محسوس کرتے ہیں تحریکات طبعی سے متاثر ہونا ایک ایسی قوت ہے جو بہائم اور ان لوگوں میں، جو مردانہ یا نسوانی خوبیوں سے محروم ہیں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ یہ فلارس[۵۱] (Phalaris) اور نیرو[۵۲] (Nero) جیسے ملحدین اور غداروں اور ان پست فطرت انسانوں میں بھی موجود تھی جو خلوت میں کسی مذموم فعل کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اشخاص جنکا تذکرہ کیا گیا ہے، تمام مکروہات میں ملوث ہیں تو ایک مخصوص چیز باقی رہجاتی ہے۔ اور یہ چیز نیک سیرت انسان کی مخصوص ملکیت ہے یعنی اپنی عقل کی رہنمائی کے مطابق ان باتوں کو اختیار کرنا جنکو وہ اپنا فرض تصور کرتا ہے۔ اور اس چیز کا خیر مقدم کرنا جس کو مقدر نے زندگی سے منسلک اور وابستہ کر دیا ہے۔ اور چشمہ الوہیت کو جو اس کے سینے کے اندر جاری ہے نجاست سے پاک رکھنا، اس کو ہجوم تاثرات سے متلاطم نہ ہونے دینا۔ اس کے سکون کو برقرار رکھنا، راضی برضا ہونا صداقت و انصاف کے خلاف قولاً یا عملاً گناہ سے اجتناب کرنا۔

اگرچہ ساری دنیا ایسے شخص کے دعوی پر کہ وہ سادہ، باحیا اور مسرور زندگی بسر کرتا ہے ہنسی یا مذاق اڑاتی لیکن وہ اس جادہ مستقیم سے ایک انچ نہیں ہٹتا۔ جو مقصد حیات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کی طرف نقاہت، سکون اور سفر آخرت کی مستعدی کے ساتھ فیصلہ تقدیر سے بالکل راضی ہو کر جانا چاہئے۔ (باقی)

---

۵۱ Phalaris ایگر اگس (سسلی) کا خود مختار فرمانروا جو بعد کو اپنی انتہائی مظالم کے باعث بست برنجی میں زندہ جلا دیا گیا
۵۲ Nero (خاندان سیزر کا آخری خود مختار فرمانروا جس کے مظالم ضرب المثل ہیں)

تلخیصات

قرآن مجید اور موجودہ اثری تحقیقات

ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی قرآن مجید کا جو ترجمہ انگریزی میں کررہے ہیں اسکا ذکر کرتے ہوئے ۱۱ اپریل کے صدق میں فرماتے ہیں:-

تاریخی، جغرافی، اثری، حواشی کا کام اندازہ سے زیادہ پھیل گیا ہے، پھر بھی ابھی بڑی حد تک بالکل تشنہ ہے۔ ضرورت اس سلسلہ میں بہت بڑے کتبخانہ کی ہے، قرآن مجید کی جو مخصوص چیزیں اس میں ہیں، مثلاً قوم عاد، قوم ثمود، وغیرہا۔ ان کا تو یورپ علانیہ منکر رہے ہی، باقی جو چیزیں بائبل اور قرآن میں مشترک ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت موسٰیؑ وغیرہ کے اکثر قصص ازمنہ خیالی یورپ ان سے بھی، بلکہ ان کے مبادی سے بھی یکسر انکار کر بیٹھا، چنانچہ اس نے نہ صرف طوفان نوح کے وقوع سے (اسکی "عالمگیری" کا تو ذکر ہی نہیں) انکار کیا، بلکہ یہ تک پکار کر کہدیا، کہ "ابراہیم" ایک فرضی نام ہے، اس نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ سب قصے بعد کو گڑھ لئے گئے ہیں"۔ مسیحی اور یہود علماء مذہب کا طبقہ بھی مسلمانوں ہی کے طبقۂ علماء کیطرح "سائنس" کے نام سے مرعوب ہے۔ یہ بیچارے بھی بائبل کی تصریحات در تصریحات کے باوجود "سائنس" سے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے، سب نے اپنی اپنی کتابوں میں ترمیم شدہ عقائد پیش کرنا شروع کردیئے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، جیوش انسائیکلوپیڈیا، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن تک کے مقالات ہیں، اور سب سے بڑھکر حیرت انگیز یہ کہ ڈکشنری آف دی بائبل تک میں جو خاص مذہبی اشخاص کی تالیف ہے۔ یہی رنگ، تذبذب، تشکیک

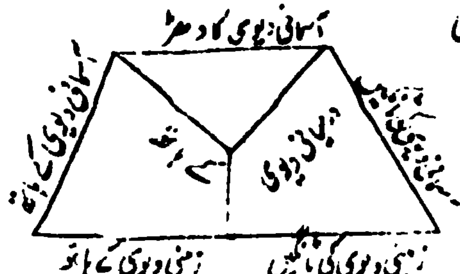
وتردد کا صاف جھلکتا نظر آتا ہو۔ انیسویں صدی کے ثلث آخر، اور بیسویں صدی کے ربع اول کی مذہبی تصانیف سب اسی معاندانہ نقطۂ نظر کا شکار ہیں یہاں تک کہ زمانہ نے پھر ایک پلٹا کھایا، اور اب ادھر چند سال سے علم آثریات ماتحت جو کھدائی کے کام بہت زائد ہوئے، اور ماہرین آثریات کی تحقیق کا دائرہ وسیع و عمیق ہوا، تو نگارہی افراد تبدیل ہونے لگا اور نابینائی کی جگہ بصارت پیدا ہونے لگی چنانچہ اب جو مقالات و تصانیف، سر چارلس مارسٹن اور سر لیونارڈ وولی وغیرہ جیسے چند ماہرین آثریات کے قلم سے نکل رہی ہیں، ان سب میں نہ صرف ابراہیمؑ کی شخصیت کا اثبات شد ومد کے ساتھ ہے بلکہ ان کے شہر آزر کا پورا حلیہ، جزئیات و تفصیلات کے ساتھ از سر نو دریافت ہو گیا ہے۔ یہ ایک مسئلہ صرف بطور نمونہ ومثال کے عرض کیا گیا۔ اسی طرح ایک دو نہیں، بیسوں بلکہ پچاسوں مقامات قرآن مجید میں آتے ہیں۔ جہاں بڑی ضرورت، بیسویں صدی کے شارح قرآن کے لئے یہ ہے کہ اگر وہ سیروا فی الارض کی تعمیل میں خود بنفس نفیس سیاح نہ ہو، تو کم از کم اتنا تو ہو کہ امریکہ، برطانیہ، جرمنی فرانس، اطالیہ کے ماتحت کھدائی اور آثری تحقیقات کے جو عظیم الشان کام، شام میں، فلسطین میں، مصر میں، عراق میں، حجاز میں، یمن میں انجام پا چکے ہیں اور روزانہ انجام پا رہے ہیں، ان سب سے خوب واقف ہو۔ تاریخ اپنے راز ایک ایک کرکے فاش کر رہی ہے، اور زمین ہے کہ اپنے دفینے اگلے دیتی ہے اگلے شہر کے شہر، سیکڑوں نہیں ہزاروں برس کے مٹے ہوئے کھنڈر، از سر نو آباد ہو رہے ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد کی میونسپلٹی، بلکہ اس وقت کی چنگی کی رسیدیں تک، دریافت ہو گئی ہیں

ضرورت صرف اس کی ہے، کہ کوئی دین کا خادم، اس سارے دفتر تحقیق سے، آیات قرآنی کے تازہ ترین شواہد فراہم کرتا رہے۔

تاریخی، جغرافی، و آثری تحقیقات کا یہ دفتر بے پایاں، تو "علمی" نقادوں اور روشن خیال"

ملحدوں سے مقابلہ کے لئے پیش نظر ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے علاوہ قرآنمجید کا ایک بہت بڑا حصہ، دوسرے ادیان وملل، بخصوصاً یہود ونصاریٰ، ثنویین ومشرکین عالم کے رد واصلاح میں ہے۔ ان آیات کی تفسیر پوری وضاحت کے ساتھ ممکن نہیں۔ تاوقتیکہ شارح کی نظر ان عقائد باطلہ پر مفصلاً نہ ہو۔ ادھر مذاہب شرکیہ کا تعدد، حد شمار سے خارج ہے۔ غریب مسلمان مفسر جس کی آنکھیں توحید اسلام کی گود میں کھلیں، تصور بھی نہیں کرسکتا، کہ شرک کے کیسے کیسے، اور ان گنت مظاہر ہیں۔ قرآن میں صفات باری وافعال باری سے متعلق جس قدر بھی آیات ہیں، ان سب میں ایک پہلو رد شرک کا بھی ہے۔ مثلاً جہاں جہاں اس مضمون کی آیتیں ہیں کہ اللہ آسمان وزمین کا پروردگار ہے (رب السموات والارض) یا اس نے انھیں پیدا کیا ہے (خلق السموات والارض)، وہاں مفہوم میں ضمناً ان مشرکی قوموں کا رد بھی آگیا ہے، جنھوں نے آسمان وزمین کو غیر مخلوق مانا ہے۔ یا انھیں مستقل دیوتا قرار دیا ہے۔ اور پھر جہاں ان الفاظ کے ساتھ وما بینہما کا اضافہ ہے، یعنی اللہ خالق ہے آسمان اور زمین کا اور ان کے مابین (درمیان) کا، وہاں شارح کی نظر اس حقیقت پر رہنی چاہئے کہ بہت سی متمدن ومہذب قوموں کا علاوہ آسمان وزمین کے ایک تیسرا مستقل معبود مستقل دیویاں تھیں۔ ان کے عقیدہ کی مظہر اس کے دور کے کتبے ہیں، جن کے فوٹو آج یورپ وامریکہ کی لکھی ہوئی تاریخ ادیان میں درج ہیں۔ مصری تثلیث کی شکل یوں درج ہے کہ اوپر ایک دیوی برہنہ، قوس کی طرح، ایک طرف اپنی لمبی ٹانگیں کھڑی کئے ہوئے اور دوسری طرف اپنے لمبے ہاتھ لٹکائے ہوئے، اور وسط میں اپنا دھڑ پھیلائے ہوئے۔ اس کا نام آسمان ہے۔ اور دھڑ کے حصہ میں تارے دکھائے گئے ہیں۔ اس کے بالکل نیچے ایک طرف اس کے پیروں اور دوسری طرف اس کے ہاتھوں کو چھوتی ہوئی۔ دوسری دیوی کا نام زمین ہے۔ اور ان کے درمیانی فاصلہ کا احاطہ کئے ہوئے ایک تیسری دیوی کھڑی ہوئی ہے۔ وہی مابین السموات والارض والی، ہاتھوں سے آسمان کو سنبھالے ہوئے اور پیروں کو

زمین پر جا سوتے ہوں ملاحظہ ہو نقشہ ذیل



اسی طرح حق تعالیٰ کا بار بار یہ فرمانا کہ واپسی اسی کی طرف ہوتا ہے، ہر امر اسی کے پاس آئے گا۔ (الیہ المصیر وانیہ ترجع الامور) وغیرہ ان قوموں کی تردید میں ہے جو خدا کو خالق کائنات تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ جاتے ہیں کہ آخری پیشی اسکی عدالت میں نہیں، بلکہ فلاں دیوتا فلاں اقنوم کے ہاں ہوگی، اور جزا و سزا جو کچھ ہوگی، اسی فلاں کے ہاں سے ہوگی۔ علی ہذا خدا تعالیٰ اپنے لئے صفات حیات و قیومیت کا اثبات اپنے کو حی و قیوم کہلانا۔ ان گمراہوں کے مقابلہ میں ہے جن کے عقیدہ میں، خدا پر ایک بار موت طاری ہو چکی ہے۔ یا ہر سال کسی نہ کسی قالب میں طاری ہوتی رہتی ہے۔ باوجود اپنے تکملہ کے لئے کسی نہ کسی دوسرے اقنوم کا محتاج ہے۔ یا جو خدا ہمیشہ سے موجود نہیں بلکہ کسی نہ کسی چیز سے پیدا ہوا ہے، مثلاً کنول کے پھول سے، یا کیچڑ کے پھل سے وقس علی ہذا عدہ۔ بلکہ ہزارہا حواشی، ان حقیقتوں کو پیش نظر رکھکر دینے پڑے ہیں۔

اہل علم کی خصوصیات

ذیل میں ہم، اصحاب علم کی خصوصیات اجمالاً ذکر کرتے ہیں:-

(۱) عزلت پسندی۔

صاحب علم بالطبع زاہد، متقشف، سوسائٹی کی مرغوبات سے متنفر، گوشۂ تنہائی میں زندگی گذارنے کا خواہشمند اور اپنی ساری توجہ صرف اعلیٰ زندگی کے حصول میں صرف کر دینے کا شائق ہوتا ہے۔

صاحب علم دنیاوی شان و شوکت کا شیدائی نہیں ہوتا۔ وہ صرف زاہدانہ زندگی کو پسند کرتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ طبعاً عزلت پسند ہوتا ہے۔ تمام چیزوں کے روشن اور ان کے تاریک پہلو اس کے سامنے ہوتے ہیں وہ انسانی زندگی کے تمام اطراف کو اس طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح کوئی شخص کسی اونچے پہاڑ پر چڑھکر اپنے گرد و پیش کے تمام حالات کا معائنہ کرے۔

(۲) تواضع۔

صاحب علم حقائق کے آگے جھک جاتا ہے تاکہ اسرار و غوامض اس پر برابر منکشف ہوتے رہیں تواضع میں اسے ایک خاص روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی کو وہ اپنی کامیابی کا زینہ سمجھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کو اور دوسروں کو انصاف کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بے جا حمایت، بے جا تعصب اور بے جا فخر و مباہات کی راہ کبھی نہیں چلتا وہ جانتا ہے کہ علم اور اس کے نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں آج ایک نظریہ قائم کیا جاتا ہے، کل اس کی دھجیاں اڑا دی جاتی ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور کبھی بھی کسی نظریہ کے اٹل ہونے کا دعوی نہیں کرتا۔

(۳) عالم خیال کی سیر

صاحب علم میں ایک آرٹسٹ اور ایک شاعر دونوں کی روح کارفرما ہوتی ہے بحیثیت ایک آرٹسٹ کے وہ مظاہر فطرت کے نقش و نگار سے دل بہلاتا ہے اور بحیثیت ایک شاعر کے وہ فضاء تصور میں جولانیاں کرتا ہے اور دنیائے تخیل میں طرح طرح فرضی منصوبے قائم کرتا ہے اور کبھی کبھی انہی تخیلات میں کھو جاتا ہے کہ پھر اس کا سراغ نہیں لگتا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر علما فنون لطیفہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس میں کمال حاصل کرکے رہتے ہیں بعض مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً اینشٹین ستار بجانے میں ماہر تھا۔ ہنری پوئنکارے فوٹوگرافی میں امام تھا۔ میڈم کوری بال تراشنے میں یکتائے روزگار تھی۔

(۴) صبر:

صبر، ارادہ کا خادم اور ارادہ صاحب علم کی کامیابی کی کلید ہے۔ صاحب علم کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اس کا قلب، اور ذہن یاس و حسرت کے جذبات سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے۔ تلخ تجربے کبھی اس کو تھکاتے نہیں اور نہ کبھی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے۔ بلکہ ان چیزوں کا اس پر الٹا اثر پڑتا ہے بجائے اس کے کہ ناکامیاں اس کے ارادے کو کمزور کریں وہ اپنے ارادوں میں پختہ ہو جاتا ہے وہ ٹھوکروں سے ثابت قدمی اور پامالیوں سے سرفرازی کا سبق حاصل کرتا ہے اور یہی اس کی زندگی کا خاص پہلو ہے

لگی ہے میری لگن تو ہوتی دوانی اور

ارادہ کی پختگی، جو قوی اور کمزور ارادہ کے انسانوں میں حد فاصل ہے، ایک صاحب علم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ مخالف عناصر کو مغلوب کرنے کیلئے بار بار کوشش کرتا ہے اور صبر کو کامیابی کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔

(۵) محبت انسانیت۔

صاحب علم تمام عالم انسانی اور اپنے پورے وطن کی خدمت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص جماعت سے نہیں ہوتا۔ وہ سیاسی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق محض تمام اصول و مبادی سے ہوتا ہے۔ اس سے کم پر وہ کبھی راضی نہیں ہوتا۔

اکثر حکومتیں اپنے علماء کی ایجادات کے فوائد کو صرف اپنے لئے مخصوص کرلیتی ہیں لیکن جو علماء اپنے صحیح مرتبہ سے واقف ہیں وہ اپنے دماغی ثمرات کو قوموں اور جماعتوں کے لئے مخصوص کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں تمام انسانیت کے لئے کرتے ہیں۔

عبدالرحمن ناصر

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی۔ علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کردی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورہ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہوگئی ہیں۔
کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۳۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴ر

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶ر

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر
منیجر

DELHI

رجسٹرڈ نمبر ۔ ۲۹۰۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اسکی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپیہ یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہونگے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپیے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ھدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاحی پریس مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ میں چھاپ کر شایع کیا

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورہ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہی کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں وہ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱۔۵۰ ر

تفسیر سورہ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ کاغذ عمدہ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۲۴ صفحے قیمت ۔۸۰ ر

تفسیر سورہ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں علمائے عیان کا مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ [illegible] کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت بہتر۔ کاغذ [illegible] حجم ۱۹ [illegible]

منتخب

بلاغ کا اعلان امرتسر کے ایک رسالہ "بلاغ" میں جو مہمل تفسیر بیان للناس کے نام سے چھپ رہی ہے اس کے چند صفحات کے عجائب ہم نے مارچ کے الاصلاح میں پیش کئے ہیں۔ ہمارے مضمون سے متاثر ہو کر کارکنان بلاغ نے مئی کے پرچہ میں مندرجہ ذیل اعلان کیا ہے۔

"حضرت خواجہ احمد الدین صاحبؒ کی وفات تک تفسیر کا جس قدر مسودہ خواجہ صاحب کا تحریر کردہ تھا شائع ہو چکا۔ میاں عبداللہ صاحب پہلوان نے خواجہ صاحب کے خطبوں کے نوٹ لے رکھے تھے جن کی مدد سے آجکل تفسیر بیان للناس مرتب ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں بہت ممکن ہے کہ باوجود کوشش وسعی کے بھی مرتب خواجہ صاحب کے اصل منشا کے اظہار سے قاصر رہے اس لئے تفسیر کے اس حصہ کا جو آجکل شائع ہو رہا ہے ذمہ دار کسی حالت میں بھی خواجہ صاحب مرحوم کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

خواجہ صاحب کی وفات کے بعد بلاغ میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ تفسیر ایک مجلس شوریٰ ان نوٹوں کی مدد سے کرے گی جو پہلوان صاحب کے پاس موجود ہے۔"

"خواجہ صاحب فوت ہو گئے تو تفسیر ناتمام رہ گئی، آپ کے احباب میں سے جناب عبداللہ صاحب پہلوان نے خواجہ صاحب کے خطبات جمعہ سے نوٹ لکھے ہوئے تھے اور آپ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا کہ ان نوٹوں سے بقیہ حصہ تفسیر کا مکمل کیا جائے گا۔ اب تفسیر پہلوان صاحب کے اسی یادداشت سے مرتب کر کے شائع کی گئی ہے۔

...... بعض احباب کی رائے اس وقت بھی یہی تھی کہ تفسیر کا وہ حصہ جو خواجہ صاحب اپنی زندگی میں لکھ چکے ہیں کافی ہے یادداشت سے تفسیر کا مرتب کرنا ایسی ذمہ داری کا کام ہے جو مشکل سے انجام ہوگا۔"

ہم نہایت دردمندانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ کارکنان بلاغ اپنے ان دوستوں کا مشورہ قبول کر لیں جو ان کی تفسیر نگاری کے مخالف ہیں۔ اور خلق خدا کو گمراہ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں۔ اس پوری "مجلس شوریٰ" میں ایک شخص بھی ان چیزوں کا اہل نہیں ہے۔ پہلوان صاحب، جن کو حواریین کے اس حلقہ میں گویا پطرس کی حیثیت حاصل ہے، اپنے لئے کوئی موزوں کام تلاش کر لیں۔ اور تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے

ماشاء اللہ پہلوان ہیں۔ محلہ کے نوجوانوں کو جمع کرکے کشتی کا فن سکھاتے ہیں۔ وہ ناحق تفسیر و حدیث کے جھمیلوں میں کہاں پڑ گئے!

شوریٰ کے بقیہ ارکان بھی اگر تفسیر نگاری کا شغلہ چھوڑ دیں تو کچھ بیکار نہیں ہو جائیں گے۔ اور بھی روٹی کمانے کی بہت سی راہیں ہیں۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ اس تفسیر نگاری کے مخالف تنہا ہم ہی ہیں۔ مگر آپ حضرات کے خاص احباب کی بھی یہی رائے ہے تو خیر اسی میں ہے کہ اس مشورہ کو قبول کرنے میں جلدی کیجئے!

خواجہ صاحب کی تفسیر متعلق بیان سے اتر کر اب میری سیر رہ گئی ہے انشاء اللہ اس زعفران زار کی سیر بھی جلد کر سکیں گے۔

الاصلاح جاری رہیگا! پچھلے پرچہ میں الاصلاح کے متعلق جو نوٹ لکھدیا گیا تھا، اس سے الاصلاح کے ہمدردوں کو نہایت تشویش ہوئی۔ ان کے اطمینان کیلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ الاصلاح کو بند کرنیکا کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ سوال دسمبر میں سامنے آسکتا تھا۔ مگر اب اسکا اندیشہ بھی انشاء اللہ نہیں ہے۔ دائرہ اور الاصلاح کے ایک مربی نے اطمینان دلایا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں الاصلاح جاری رکھا جائیگا۔ پس اعلان کیا جاتا ہے کہ قارئین مطمئن رہیں۔ الاصلاح انشاء اللہ بند نہ ہوگا۔

ایک ہمدرد بزرگ نے ڈھائی سو روپئے الاصلاح کے خطرہ کے وقتوں کے لئے علیحدہ کر دیئے ہیں۔ بعض ہمدردوں نے نئے خریدار بھیجے ہیں۔ ایک بزرگ نے ۵ کی رقم سے اعانت کی ہے۔ دو ناموں کا معاونین کی فہرست میں اضافہ ہوا ہے۔

یہ باتیں نہایت امید افزا ہیں۔ لیکن یہ وہی شکل ہوئی جسکی نسبت واضح طور پر عرض کر دیا گیا تھا کہ مجھکو اور رفقا کو پسند نہیں ہے۔

بہرحال اب بھی ہماری خواہش یہی ہے کہ الاصلاح کے قارئین کوشش کرکے الاصلاح کے خریداروں کا حلقہ وسیع کریں مستقل شکل یہی ہے۔ ایک ایک خریدار پیدا کر لینا ہر شخص کیلئے تو شاید کچھ مشکل ہو مگر اکثروں کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ تھوڑے سے اہتمام سے یہ کام ہو جائیگا۔ اگر الاصلاح کے خریداروں نے اس امر کی طرف توجہ کی، اور دسمبر تک الاصلاح کو اس قابل کر دیا کہ وہ اپنے اخراجات کی خود کفالت کر سکے تو جن ہمدردوں کی اعانت کا ہم نے ذکر کیا ہے ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے عطیے استاذ امام کی عربی تالیفات کی طبع و اشاعت کیلئے خاص کر دیں کہ وہی اصلی مقصود ہے اور افسوس ہے کہ اسی کیلئے ابھی کچھ نہیں ہو رہا ہے۔

معارف قرآن

تفسیر سورہ قیامہ

تصنیف
استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۱) وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲) أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ
أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ (۳) بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ (۴) بَلْ يُرِيْدُ الْإِنْسَانُ
لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ (۵) يَسْئَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (۶) فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷) وَخَسَفَ
الْقَمَرُ (۸) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۹) يَقُوْلُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ (۱۰)
كَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱) إِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمُسْتَقَرُّ (۱۲) يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ
بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ (۱۳) بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهِ بَصِيْرَةٌ (۱۴) وَّلَوْ أَلْقٰى مَعَاذِيْرَهُ (۱۵)
لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (۱۶) إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ (۱۷) فَإِذَا قَرَأْنٰهُ
فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهُ (۱۸) ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۱۹) كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (۲۰)
وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۲۱) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۲۲) إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۲۳)
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (۲۴) تَظُنُّ أَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (۲۵) كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ
التَّرَاقِيَ (۲۶) وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (۲۷) وَّظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ (۲۸) وَالْتَفَّتِ السَّاقُ

بِالسَّاقِ (۲۹) اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ (۳۰) فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی (۳۱)
وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۳۲) ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی (۳۳) اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی (۳۴)
ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی (۳۵) اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (۳۶) اَلَمْ یَکُ
نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی (۳۷) ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی (۳۸) فَجَعَلَ مِنْهُ
الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی (۳۹) اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی (۴۰)

[illegible] کی قسم اور نفس ملامت گر کی قسم۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اسکی ہڈیوں کو کبھی یکجا نہ کرینگے؟ ہاں، ہم اس کی پور پور کو ٹھیک کر سکتے ہیں، مگر آدمی اس کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے: وہ روز کب ہے؟ لیکن جب نگاہ خیرہ ہوگی، اور چاند گہنائے گا، اور چاند سورج یکجا ہوں گے، تب آدمی کہے گا کہاں بھاگوں، کچھ نہیں کہیں بچاؤ نہیں۔ تیرے خداوند کے یہاں ٹھکانا ہے۔ اس دن آدمی کو جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا بتا دیا جائے گا۔ بلکہ انسان اپنے لئے آپ سوجھ ہے، اگرچہ اپنے بہانے پیش کرے۔ نہ چلا اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کہ جلدی سیکھ لے۔ ہمارا ذمہ ہے اسکو جمع کرنا اور اسکو سنانا۔ پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اسکی پیروی کر۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اسکی تفصیل۔ کچھ نہیں، بلکہ تم دنیا کو چاہتے ہو، اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر، اور کتنے چہرے اداس ہوں گے۔ گمان کریں گے کہ ان پر کمر توڑنے والی مصیبت ٹوٹے گی، کچھ نہیں۔ جب جان ہنسلی تک آپہنچے گی، اور پکاریں گے کون ہے جھاڑنے پھونکنے والا، اور گمان کریگا کہ یہ جدائی کی گھڑی ہے۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹے گی۔ تیرے خداوند کی طرف اس دن چلنا ہے، پس نہ سچ مانا، اور نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے پھر افسوس ہے اور افسوس ہے۔ کیا انسان سمجھتا ہے کہ وہ بے قید چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ ٹپکائی ہوئی منی کی

ایک بوند تھا؛ پھر جو اہو کی ایک پھٹکی، پھر اس کو خلق کیا اور درست کیا پس بنایا اس سے جوڑا، نر اور ماده، کیا وہ خداوند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟

(۱) اس سورہ کا عمود۔ منکرین قیامت وجزا کے شبہات کی تردید ہے۔ ان کے انکار کی بنیاد دو چیزیں تھیں۔

الف:۔ دنیائے فانی کی محبت۔ قاعدہ ہے کہ انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے۔ اس کے خلاف ایک لفظ سننا گوارا نہیں کرتا۔

ب طاعت اور تقوی سے متکبرانہ اعراض۔ اس لئے کہ طمع مال اور حب جاہ کی آرزو میں انسان کو ایک پرفریب جال میں پھنسا لیتی ہیں۔

ان نے اس سورہ میں اللہ تعالی نے ان دونوں باتوں کا ذکر فرمایا۔

امر اول کا ذکر یوں فرمایا۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ — کچھ نہیں تم دنیا کو چاہتے ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔

دوسری بات کی طرف یوں اشارہ فرمایا۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ — پس نہ تصدیق مانا نہ نماز پڑھی، بلکہ انکار کیا اور منہ موڑا پھر اپنے لوگوں میں اکڑتا ہوا چلا یا۔

پہلی تصویر ان لوگوں کی تھی جو دنیا سے محبت کرتے ہیں۔ یہ دوسری تصویر ان لوگوں کی ہے جو اپنے اہل و مال کے گھمنڈ میں خدا سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

ان لوگوں نے انکار کے لئے جس شبہ کو آڑ بنایا تھا وہ یہی عدم شبہ تھا جس کو قرآن نے خود انہی کی زبانی بار بار نقل کیا ہے۔ مثلاً أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے، تب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ دوسری جگہ۔ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ جواب کا طریقہ

ایسا اختیار فرمایا جو بالکل ان کے حسب حال ہو۔ اور ان کے شبہہ کو دور کر کے ان کو غفلت کی نیند سے جگا دے۔ چنانچہ اس سورہ میں ایسی تنبیہات و دلائل جمع کئے گئے ہیں جو مخاطب کو پوری طرح قائل اور ہشیار کردینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔

اس سورہ کے اسلوب استدلال کے متعلق ایک اور خاص بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے۔ سابق سورۃ میں ان کے تکبر و انکار کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا تھا۔ اور ساتھ ہی جہاں تک زجر و توبیخ کی ضرورت تھی کلام میں اس کی شدت اور درشتی بھی موجود تھی۔ اس وجہ سے اس سورہ میں ان کے انکار و تکبر کی تفصیل نہیں کی گئی بلکہ زیادہ تر دلائل بیان ہوئے۔ اور کلام کو موثر اور دلنشین بنانے کے لئے ضروری تھا کہ ایسا ہی ہو۔ ایک کاریگر پہلے لوہے کو تپا کر نرم کرتا ہے تب اس پر ہتھوڑا مارتا ہے یہی صورت ایک متکلم اس وقت اختیار کرتا ہے جب مخاطب کوئی متکبر اور جھگڑالو قوم ہو۔ وہ پہلے زواجر و تنبیہات سے دلوں کو نرم کرتا ہے۔ اور ان میں سماحت کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کے سامنے دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ پس فطرت انسانی کی اسی رعایت کی وجہ سے قہر و غضب کی وہ شدت جو پہلی سورت میں تھی اس میں نہیں ہے۔ گو اس کی گرمی کسی قدر اس میں بھی ہے۔ سابق سورہ کا انداز بہت تیز تھا۔ مثلاً فرمایا ہے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا	چھوڑ دے مجھکو اور جسکو میں نے بنایا تنہا اور دیا
وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَبَنِينَ	اس کو مال کثیر اور بیٹے حاضر ہونے والے۔ اور اس کی
شُهُودًا وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا	راہ ہموار کی جیسی چاہئے۔ پھر متوقع ہے کہ اور بڑھاؤ
ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ	دوں گا ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے
لِآيَاتِنَا عَنِيدًا سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا	اور اس کو چڑھاؤں گا ایک چڑھائی۔ اس نے سوچا
إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ	اور اندازہ کیا۔ پس ہلاک ہو کیسا اندازہ کیا، پھر نگاہ کی پھر
قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ	تیوری چڑھائی اور منہ بنایا، پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا

ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ	اور کہا یہ تو بس جادو ہے جو پہلوں سے ہوتا چلا
اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ	آ رہا ہے۔ نہیں ہے یہ مگر انسان کی بات۔ میں اسکو
الْبَشَرِ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ وَمَآ اَدْرٰىكَ	داخل کروں گا سقر میں اور تجھے کیا معلوم سقر
مَا سَقَرُ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ	کیا ہے، نہ باقی رکھے گی نہ چھوڑے گی .....
....	....
....	....
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ	ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یاددہانی سے اعراض
كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ	کر رہے ہیں، گویا بدکے ہوئے گدھے ہیں، بھاگے ہیں
قَسْوَرَةٍ (مدثر)	شیر سے۔

اس کلام کو سامنے رکھکر اگر سورہ قیامہ کے انداز بیان کو دیکھو گے تو فرق دونوں میں نمایاں معلوم ہوگا۔ اس میں کلام کی یہ شعلہ فشانی نہیں ہے۔

تاہم غضب کی کچھ چنگاریاں اس میں بھی دبی ہوئی ہیں جن کو ایک حساس ذوق آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس میں انسان کی جرأت اور سرکشی کا ذکر ہے۔ پھر اس کے جواب میں جھڑکی اور دھمکی کا انداز ہے، نیز استفہام اور تہدید کا اسلوب بار بار استعمال ہوا ہے۔ پس یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے ... میں بیان کیا، اپنے اسلوب کے اعتبار سے پہلی سورت سے بالکل الگ نہیں ہے بلکہ بہت کچھ ملتی جلتی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس سورت میں انسان کا یہ قول نقل کیا کہ وہ پوچھتا ہے "روز حشر کب آئے گا" اور یہ اس کے انتہائی سرکشی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اس تفصیل و توضیح اور اس اتمام حجت کے بعد جو قرآن نے اس مسئلہ کو ... کرنے کے لئے اختیار فرمائی ہے، کسی کے لئے اس سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لیکن محض اس ... وہ دن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ہم کو تھوڑی سی مہلت

توفیق عمل اور توبہ کے لئے دے رکھی ہے۔ انسان اکڑتا ہے اور مذاق سے پوچھتا ہے کہ "وہ دن کب آئیگا؟ اگر اسکو آنا ہے تو کیوں نہیں آجاتا؟ آخر یہ جہاز کہاں لنگر انداز ہوگیا؟" انسان کی یہ ذہنی حالت مقتضی ہوئی کہ اس مذاق کے جواب میں جھڑکی اور تہدید کا پہلو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ دیکھو جواب میں اس دن کے آنے کی تاریخ نہیں بتائی مگر اس دن ان کی جو حالت ہوگی اس کی تصویر ان کے سامنے رکھدی۔ اور قرآن نے جواب کا یہ اسلوب اکثر اختیار کیا ہے۔ مثلاً سورہ ذاریات میں ہے:-

يَسْئَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۔ يَوْمَ	پوچھتے ہیں کہ کب ہے دن جزا کا؟ جس وقت وہ لوگ پتائے
هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ	جائیں گے۔ چکھو مزا اپنے فتنہ[51] کا یہی وہ چیز ہے جس کیلئے
هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ	تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔

---

۵۱ قرآن پاک کی آیتوں کے ترجمہ میں سر چکرا جاتا ہے۔ ہر قدم پر ایسی مشکلیں پیش آتی ہیں کہ کافی غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد بھی ایک لفظ کا ترجمہ کرنے کیلئے اردو میں کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا اور مجبوراً کسی ایسے ترجمہ پر قناعت کرنا پڑتا ہے جس پر دل مطمئن نہیں ہوتا۔ مثلاً "فتنہ" کے لفظ پر دیر سے غور کر رہا ہوں لیکن اردو کا کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو اس جامع حقیقت کے کسی ایک ہی گوشہ کی کوئی جھلک دکھا سکے جو اس ایک لفظ کے صرف تین حرفوں کے اندر سمٹی ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں "فتنہ" کا لفظ متعدد معانی میں آیا ہے اور ہر معنی کی تائید آیات قرآن اور کلام عرب کا ایک ذخیرہ۔ جو شخص لفظ کے مختلف استعمالات پر مطلع ہے، عربی میں سیاق و سباق کی رہنمائی سے بے تکلف صحیح مفہوم تک پہنچ جاتا ہے لیکن اردو میں کیا کیجئے! اردو میں اسکے متعدد معانی میں سے ہر ایک کی تعبیر کیلئے بھی شستہ الفاظ موجود نہیں۔ اور پھر اردو کی کم مائیگی پر اپنی بے بضاعتی مستزاد۔

بہرحال یہاں حسب رعایت سیاق و سباق "اپنے فتنہ کا مزہ چکھو" کا مفہوم یہ ہوگا کہ دنیا کے جن زخارف و شہوات پر تم ریجھے ہوئے تھے اب انکی اصل حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہے۔ دنیا میں تم غفلت و سرمستی کی مدہوشیوں میں انکا اصلی ذائقہ نہ معلوم کر سکے لیکن اب آنکھیں بھی کھل چکی ہیں اور ان زخارف کی اصل حقیقت بھی بے نقاب ہو چکی ہے، بیچ میں کوئی پردہ حائل نہیں رہا پس ان کا اصلی مزہ چکھو۔

"فتنہ" کے ایک دوسرے معنی مصائب و شدائد اور مختلف رنج و غم آزمائشوں میں ڈالکر کسی شخص کو دین سے پھیرنے کے بھی ہیں اور اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں آیا ہے۔ اور یہ معنی بھی یہاں لگتے ہیں لیکن اسکی صحیح تعبیر کے لئے جب تک ایک پوری عبارت نہ لکھی جائے، مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ قرآن کا ایک ہی لفظ ان تمام حقائق کا جامع ہے۔ ترجمہ میں اس طرح کی جہاں کوتاہیاں ہوں ان میں اہل علم کی رہنمائی کا طلبگار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان لغزشوں کو معاف فرمائے۔ (مترجم)

بس اسی اسلوب پر یہاں بھی جواب کے لئے ایسا پیرایہ اختیار فرمایا جو ان کی اس منکرانہ اور متکبرانہ ذہنیت کے لائق ہو۔ فرمایا۔

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَ — لیکن جب نگاہ خیرہ ہوگی، اور چاند گہنائیگا، اور چاند
جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُولُ الْإِنسَانُ — سورج یکجا ہونگے، تب آدمی کہے گا کہاں بھاگوں
يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ

یعنی آج تو وہ دن بہت دور نظر آتا ہے اور وہ گھمنڈ کے نشہ میں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اس کے لئے جلدی مچائے ہوئے ہیں لیکن جب وہ سامنے آجائیگا تو گھبراہٹ کی بدحواسی میں کہیں گے کہ "این المفر" کہاں بھاگ کے چلے جائیں۔ پھر اس دن ان کی جو حالت ہوگی اسکی پوری تصویر کھینچ دی۔

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ أَن — اور بہت سے چہرے اس دن اداس ہونگے، گمان
يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ — کرینگے کہ ان پر کوئی کمر توڑنے والی مصیبت ٹوٹے گی۔

اسی متکبرانہ سوال کے بعد ان کے متکبرانہ اعراض کا ذکر فرمایا۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ وَلَٰكِن كَذَّبَ — پس نہ سچ مانا، نہ نماز پڑھی لیکن انکار کیا اور منہ موڑا
وَتَوَلَّىٰ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ — پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔

پھر ان کی اس حالت پر بطریق حسرت افسوس کیا۔

أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ — افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے، پھر افسوس تجھ پر اور افسوس

اس طرح کی حسرت کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ملتی ہیں۔

يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن — افسوس ہے بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی
رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ — رسول مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے

جس طرح "ویل" کا لفظ جھڑکی اور غضب کے لئے استعمال ہے اسی طرح "اولیٰ" کا لفظ

نسبت کے لئے آتا ہے۔ خنساء کا شعر ہے

همت بنفسی کل الهموم

فاولی لنفسی اولی لها

یہاں ایک خاص بات اسلوب سے متعلق قابل لحاظ ہے کہ "اولیٰ لک" میں ضمیر بجائے غائب کے مخاطب کی آگئی ہے۔ حالانکہ پیچھے سے کلام غیبت کے اسلوب پر چل رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کو موثر اور پر زور بنانے کے لئے یہی اسلوب زور دار تھا۔ اگر "اولیٰ لک فاولیٰ" کے بجائے "اولیٰ له فاولیٰ" ہوتا تو کلام میں یہ تاثیر نہ پیدا ہوتی۔ علاوہ ازیں کلام شروع سے اخیر تک بالکل استفہام کے اسلوب میں ڈھلا ہوا ہے اس کا سبب بھی یہی ہے۔ کیونکہ یہ پوری سورت اول سے اخیر تک زجر و توبیخ پر مشتمل ہے۔

(۳) اس سورہ میں جھڑکی اور سوال کے جو مواقع ہیں ان کے محاسن کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک باریک بات کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں اس کو خوب غور کرکے سمجھ لینا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ جب خطاب بانداز عتاب ہوتا ہے تو اس وقت کلام میں فصل و التفات اور ظاہری اقتضاب بہت ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا متکلم غصہ میں ہے۔ بات شروع کرتا ہے، پھر رک جاتا ہے اور غصہ گھونٹ پی کر پھر دوسرے اسلوب پر بات شروع کرتا ہے اور خاتمہ کلام جھڑکی پر ہوتا ہے۔ اس طرح کے التفات کی مثالیں شعرائے عرب کے کلام میں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ایک شاعر ایک بات کہتا چلا جارہا ہے پھر دفعتاً سکوت کرکے کہتا ہے ؎ فدع ذا وسل الهم عنك بجسرة۔ یعنی ان باتوں کو چھوڑو، اور اپنے دل کا غم دور کرو اور ایسی ایسی اونٹنی سے اپنے ارادہ کو پورا کرو۔۔۔۔۔۔

اس سورت کے اسلوب کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے سورہ علق، سورہ تکاثر اور سورہ ہمزہ کے اسالیب پر بار بار غور کرنا چاہئے یہ سورتیں اس کے اسلوب سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ اور ان میں غضب کی نمود بھی ہے۔ اس اسلوب کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ غور کرنے کیلئے ہم چاہتے ہیں کہ سورہ کے

مضمون کا بالکل سادہ اور مختصر خاکہ تمہارے سامنے رکھدیں۔ پس بطریق ایجاز اس کو یوں سمجھو۔

"کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اٹھایا نہ جائے گا، جزا نہ ہوگی، شرارت کی وجہ سے کہتا ہے کہ وہ دن کب آئے گا۔ جب آجائے گا تو بھاگ نہ سکے گا۔ ہرگز نہیں اس کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں۔ اللہ ہی کی طرف ٹھکانا ہے۔ بلکہ انسان باوجود بصیرت کے اندھا بنتا ہے کچھ نہیں وہ دنیا کو چاہتا ہے اور آخرت کو چھوڑتا ہے۔ کچھ نہیں جب جان ہنسلی میں آپہنچی اور وہ اپنے پروردگار کے پاس لیجایا جائے گا تو اس وقت دنیا اس کے کس کام آئے گی؟"

اس مضمون پر غور کرو، التفات اور ظاہری فصل واقتضاب کس قدر نمایاں ہے۔ حالانکہ پورا کلام نہایت مربوط سلسلۂ معنی پر مشتمل ہے۔ پس کلام کا یہ انداز، غضب اور مخاطب کی حالت کی شناعت کو ظاہر کر رہا ہے۔

اس میں اسلوب التفات کی سب سے زیادہ نمایاں مثال آیت لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ الخ ہے۔ اس کی تفسیر ہم آگے بیان کریں گے۔

(۴) اوپر جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ یہ سورہ زجر و توبیخ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ پس جو شخص بلاغت عرب کی اداؤں سے اچھی طرح واقف نہ ہوگا وہ اس سورہ کے منطقی اور استدلالی پہلو کو نہ سمجھ سکے گا۔ کیونکہ وہ اس کے اندر خبر و استدلال کی عام راہ سے گھسنا چاہے گا، اور یہ عام شاہراہ سے بالکل الگ ہے۔

اس کلام کے استدلالی پہلو کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کو بلاغت کی خیرہ کردینے والی شعاعوں کے حصار سے الگ کیا جائے۔ بغیر اس کے کمزور نگاہیں اس کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ پس اب ہم کلام کو اس کے تمام محاسن بلاغت سے مجرد کرکے دیکھتے ہیں تاکہ اسکی منطق پوری طرح واضح ہوسکے۔

کلام اپنی مجرد حالت میں یوں ہوگا۔

"انسان نے قیامت کا انکار کیا، اور یاددہانی سے اعراض، اور خیال کیا کہ وہ غیر مسئول چھوڑ دیا جائیگا۔ اپنے اعمال کا بدلہ نہ پائے گا۔ چنانچہ اس کو اس سے ہوشیار کیا گیا لیکن وہ مذاق سے پوچھتا ہے کہ قیامت کا

دنیا بنائے گا، اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ فنا ہونے نہ پائے گا بلکہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اپنے سب بھلے برے اعمال کا بدلہ پائے گا۔ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں گے اور اس کے پور پور کو جوڑیں گے۔ ابھی وہ اس دن کو جھٹلاتا ہے۔ لیکن جب یہ واقعہ پیش آئے گا تب آنکھیں کھولے گا اور اس کا اقرار کرے گا بلکہ وہ خود اپنے نفس کے سامنے بھی گواہی دے گا بلکہ خود اس کے نفس لوامہ نے اس کے سامنے یہ گواہی دی تھی لیکن اس دنیائے فانی کی محبت نے اس کو آخرت سے غافل رکھا۔ پس ضرورت تھی کہ اس کو پہلے وحی جلد جلد دی جائے تاکہ وہ اس بات کو سمجھ سکے۔ کیا وہ موت کو نہیں یاد کرتا کہ اس دنیائے فانی سے کسی ایک دن کوچ کرنا ہے اور اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اگر ایسا کرتا تو وہ صدقہ دیتا اور نماز پڑھتا کیا وہ اپنی پیدائش کے مادہ پر غور نہیں کرتا جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ دوبارہ پیدا کر دے"۔

اس مادہ و بساط پر تم کلام کی منطق کو بالکل بے نقاب دیکھ سکتے ہو لیکن اس اندازِ بیان کو قرآن کے اندازِ بیان سے کیا نسبت! یہی ذرے ہیں جنکو قرآن کے نظم اور اعجازِ بیان نے آفتاب بنا دیا ہے۔ نہ وہ تمہاری گرفت میں آسکتے نہ تم ان پر نگاہ جما کر دیکھ سکتے۔ البتہ جو قرآن پر تدبر کرتے ہیں ان کو اس کرک اور دمک کے اندر بھی اطمینانِ قلب اور تشفی کی دولت گرانمایہ مل جاتی ہے۔ اور قرآن کے دلائل ان پر روشن ہو جاتے ہیں۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ — اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے
رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ — ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں پھر ان کے جسم اور
إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ — دل خدا کی یاد کی طرف جھک جاتے ہیں۔

جب آیات کی صحیح تاویل سمجھ لینے کے بعد تم پورے مجموعہ پر غور کروگے۔ تو دلیل کا پہلو بالکل واضح ہو جائے گا۔ اس وقت ہم کلام کے اجزاء اور کلمات کی تشریح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(باقی)

ذبیح کون ہے؟

۵

پانچویں دلیل

قربان ہونے کے اصلی حقدار حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے

۹ - توریت میں اس امر کی تصریح ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اپنے باپ کے پہلوٹھے بیٹے تھے اور حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک خداوندی شریعت کا یہ مسلم حکم رہا ہے کہ قربانی صرف پہلوٹھی کے بچے کی ہوسکتی ہے اور پہلوٹھی کے ہونے کی فضیلت کو کوئی چیز باطل نہیں کرسکتی۔ دلائل کی تفصیل فصل ثانی د - ۸ میں گذرچکی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے خیال کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے ہرچیز میں کامل بننے کا حکم دیا تھا، ایک ایسے معاملہ میں چوک جائیں جو ان کے عروج و کمال کا اصلی زینہ ہے۔ اور شریعت کے قدیم ترین حکم سے اغماض کرکے، اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کو خدا سے دریغ رکھیں۔ اور حضرت اسحاقؑ کو قربان کریں جن کی ولادت کے لئے نہ صرف یہ کہ انھوں نے دعا نہیں کی بلکہ جس وقت ان کی ولادت کی بشارت ان کو ملی ہے، وہ ایسا فقرہ فرماتے ہیں جس سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کو پاکر وہ ہر خواہش سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کی بارگاہ میں ایک ایسی چیز پیش کریں گے جس سے اعلیٰ اور زیادہ محبوب چیز ان کے پاس موجود ہے، درانحالیکہ ہر قربانی کرنے والے کی سب سے پہلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اسکی قربانی خدا کی پسند اور اس کے حکم سے زیادہ سے زیادہ مطابق ہو۔ یہ بات تو علانیہ محال معلوم ہوتی ہے۔

چھٹی دلیل

حضرت اسحٰق کا متاہل ہونا اس بات سے مانع ہے کہ وہ قربان ہوں

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق کی نسل میں برکت کی خوشخبری اللہ تعالیٰ نے اسی وقت دی جس وقت ان کی ولادت کی خوشخبری سنائی۔ برعکس اس کے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں برکت کی خوشخبری یا تو حضرت اسحٰقؑ کی بشارت کے بعد دی یا زیادہ سے زیادہ اسی وقت۔ کتاب پیدائش (۱۷: ۱۹-۲۰) میں ہے۔

> تب خدا نے فرمایا کہ بیشک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا تو اس کا نام اضحاق رکھنا اور میں اس سے اور بعد اس کی اولاد سے اپنا عہد جو ابدی عہد ہے باندھوں گا۔ اور اسمٰعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کی ذریت کی کثرت کی خوشخبری سنائے اور دوسری طرف ان کو ذبح کرنے کا حکم دیدے؟ اور یہ بات اپنی جگہ پر پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ اس وقت حضرت اسحٰقؑ کمسن تھے۔ انھوں نے نکاح نہیں کیا تھا۔ انھوں نے نکاح اس وقت کیا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ (دیکھو کتاب پیدائش باب ۲۴)[1] اور ان کے اولاد یا تو اس وقت ہوئی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ جیسا کہ پیدائش (۲۵: ۱۱) میں ہے۔

---

[1] اور ابرہام ضعیف اور عمر رسیدہ ہوا اور خداوند نے سب باتوں میں ابرہام کو برکت بخشی تھی۔ اور ابرہام نے اپنے گھر کے سن خوردہ نوکر سے جو اس کی سب چیزوں کا مختار تھا کہا تو اپنا ہاتھ ذرا میری ران کے نیچے رکھ کہ میں تجھ سے خداوند کی جو آسمان و زمین کا خداوند ہے قسم لوں کہ تو کنعانیوں کی بیٹیوں میں سے جن میں میں رہتا ہوں کسی کو میرے بیٹے سے نہیں بیاہے گا بلکہ تو میرے وطن میں میرے رشتہ داروں کے پاس جا کر میرے بیٹے اضحاق کے لئے بیوی لائے گا۔ (پیدائش ۲۴: ۱-۵) (مترجم)

"اور ابرہام کی وفات کے بعد خدا نے اس کے بیٹے اضحاق کو برکت بخشی۔"

یا اس وقت جبکہ انکی عمر بالکل آخر ہو چکی ہے۔ چنانچہ پیدائش (۲۵:۷) میں ہے۔

"اور ابراہیم کی کل عمر جب تک کہ وہ جیتا رہا ایک سو پچھتر برس کی ہوئی۔"

پھر اسی باب کی آیت ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیصو اور یعقوب کی ولادت کے وقت حضرت اسحقؑ ۶۰ برس کے تھے[۵]۔ اس حساب سے حضرت یعقوب اس وقت پیدا ہوئے ہیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کے صرف ۱۵ برس باقی رہ گئے تھے۔ اولاً تو یہ تناقض ہی ایک عجیب و غریب چیز ہے لیکن اگر تناقض کو تورات کی ایک عادت اور وہ بات خیال کرکے نظر انداز کر دیا جائے تو اتنا تو بہر حال مسلم ہے کہ حضرت اسحاقؑ بڑھاپے کو پہنچ کر صاحب اولاد ہوئے ہیں اور تورات و قرآن کی تصریحات کے مطابق یہ امر فریقین میں مسلم ہے کہ قربان ہونے والا جو بھی ہو، نوخیز اور نوعمر تھا۔ پس یہ کہنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کی قربانی صاحب اولاد ہونے کے بعد کی ہوگی۔

اگر یہ کہو کہ حضرت ابراہیم علیہ سلام کو یہ بات معلوم تھی کہ ذبح ہونے کے بعد اسحقؑ کی ذریت میں برکت ہوگی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو معلوم تھا کہ وہ اپنی جس اولاد کو خدا کی راہ میں قربان کریں گے وہ مرے گی نہیں بلکہ زندہ رہے گی، اور اس کے بعد اس کی اولاد خوب پھلے گی پھولے گی۔ تو اس میں ان کی آزمائش کیا ہوئی؟ یہ تو ایک مذاق ہوا۔

تم کہوگے، اگر یہ بات ہے تو یہ اشکال تو حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ میں بھی پیش آتا ہے کیونکہ جب وہ بالکل کمسن تھے اس وقت ان کی ذریت کی کثرت کی خوشخبری اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کو دی تھی۔ لیکن، یاد رکھو، حضرت ہاجرہ کو دی تھی، حضرت ابراہیم کو نہیں دی تھی اور معلوم ہے کہ ذبح کا حکم حضرت ابراہیمؑ کو دیا ہے حضرت ہاجرہ کو نہیں دیا ہے۔ ہاں اگر بشارت کے بعد ذبح کا حکم بھی حضرت ہاجرہ ہی کو دیا ہوتا تو لاریب یہ اعتراض پڑتا اور اس کا جواب مشکل تھا۔ اس کے برعکس حضرت اسحاقؑ کے بارہ میں ایک طرف تو تم

۵۔ "جب وہ (یعقوب) ربقہ سے پیدا ہوا تو اضحاق ساٹھ برس کا تھا" (پیدائش ۲۵:۲۶)

تسلیم کرتے ہو کہ ان کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دی کہ "میں اسحاق سے تیری ذریت کو بڑھاؤں گا" اور دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ جب پیدا ہوئے تو کمسنی ہی میں ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے تھے شادی بھی نہیں کی، کوئی اولاد نہیں ہوئی ان کے ذبح کا حکم دیدیا۔ ان هذا لشیء عجاب

ساتویں دلیل

قربانی کا واقعہ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت سے پہلے پیش آیا

دوسری دلیل کے ضمن میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ قربانی کا واقعہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش سے پہلے پیش آچکا تھا اور اس پر ہم نے جو دلیل قائم کی ہے وہ ناقابل تردید ہے۔ یہاں ہم ایک قدم اور آگے بڑھکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ کا ذبیح ثابت ہونا تو درکنار خود ان کی ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی برکت ہے۔

کتاب پیدائش کے سترہویں باب میں جس میں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں برکت و کثرت کا ذکر ہے بہت سی اہم باتیں بیان ہوئی ہیں اور ہم پورے اطمینان کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور سب سے زیادہ خاص بات یہ ہے کہ اس میں بعض واقعات تعین زمانہ کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، جس سے ہم کو بعض ایسے مسائل کے استنباط میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے جو ہمارے موضوع سے نہایت قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔

اس باب میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ کمال اطاعت کی راہ اختیار کریں۔ اس وقت ان کی عمر ۹۹ برس کی تھی۔ اور حضرت اسحاقؑ ہنوز پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ختنہ کا حکم نازل کیا چنانچہ ایک ہی دن حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ حضرت اسمٰعیلؑ اس وقت تیرہ سال کے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ

ایک ابدی عہد باندھا۔ اور ختنہ کو اس ابدی عہد اور ان کی امت کا شعار قرار دیا۔ نیز حضرت اسمٰعیل کی ذریت کی کثرت اور حضرت اسحاق کی ولادت اور ان کی اولاد میں برکت کی خوشخبری دی۔ یہ باتیں تو رات کے مذکورہ باب میں بیان ہوئی ہیں ان کو پیش نظر رکھو اس کے بعد ہمارے استنباط پر غور کرو۔

ہم کہتے ہیں کہ کمال اطاعت کا حکم عظیم الشان برکات کا وعدہ اور ایک ابدی عہد کا قیام بیتہ عظیم الشان امور ہیں کہ ان کے متعلق یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کو محض ختنہ کی شریعت سے وابستہ کر دیا جائے، بلکہ یہاں کوئی اور بھاری بات ہے جس کا ذکر علمائے یہود نے حذف کر دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہاں یہ بات ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیکر جانچا اور جب وہ اس امتحان میں پورے اترے ان کو برکت اور حضرت اسحٰق کی ولادت کی بشارت دی۔ واقعہ کی اصل حقیقت یوں ہے لیکن یہود نے اس پر پردہ ڈالدیا ہے۔ اس سلسلہ کی روشنی میں یہ بات صاف کھل جاتی ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت منجملہ ان برکات کے ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے ظہور میں آئیں۔

اس کی مزید توضیح ان تصریحات سے ہوتی ہے جو واقعہ ذبح کے سلسلہ میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ برکت اس لئے دی کہ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا سے دریغ نہیں رکھا۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس بیٹے کو قربان کیا اس کے لئے برکت نسل کی بشارت اس وقت تک نہیں آتی جب تک وہ اس امتحان سے فارغ نہیں ہو جاتے چنانچہ بشارت کے الفاظ یہ ہیں: " اب میں اس کو برکت دوں گا اور خوب بڑھاؤں گا۔" اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا برکت پانا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ابتلاء، کمال اطاعت کا حکم، اور عہد ابدی کا قیام۔ یہ ساری باتیں ایک زنجیر کی کڑیاں اور ایک زمانہ کے واقعات ہیں اور یہی زمانہ ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت ملی ہے۔ پھر سوچو کہ جب حضرت اسحاق ہنوز پیدا

نہیں تو ہم یا تو قربان کیسے ہو گئے؟

حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت سے خود واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کر کے کمال اطاعت و اسلام کا جو عظیم الشان نمونہ پیش کیا حضرت اسحٰقؑ کی ولادت اسی قربانی کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ اس قربانی کی اصل حقیقت یہ تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو خداوند کی نذر کر دیا جائے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور فرمایا کاش اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ اس حقیقت کا مطلب حرف ح فصل ۸ میں ہم بیان کر چکے ہیں اور مزید تفصیل تیرہویں فصل میں ملے گی۔

حضرت اسمٰعیلؑ کا سن اس وقت تیرہ برس کا تھا۔ یہ سن بچے کی زندگی میں بجائے خود ایک بہترین دور ہے اور اگر اس کے ساتھ ظاہری و باطنی پاکی و پاکیزگی کی تمام گیرائیاں بھی جمع ہو جائیں تو سبحان اللہ ایسے فرزند سعید کی قدر و قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے! یہ زمانہ ہو گا کہ عقل و رشد کی کرنیں پیشانی سے نمودار ہو رہی ہوں گی، باپ کے دل میں گھسنے اور نگاہوں میں کھبنے کے لئے وہ تمام خوبیوں سے آراستہ ہو چکے ہوں گے۔ حسن و تہذیب و ادب کی تمام دلربائیوں کے ساتھ باپ کے چھوٹے بڑے کاموں میں شریک ہوتے ہوں گے۔ ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ باپ کو خود اپنی جان سے زیادہ پیارے نہ رہے ہوں گے۔ پس یقیناً ایسے محبوب بیٹے کی قربانی کا حکم دینا ایک ابتلائے عظیم ہے اور چونکہ اس امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کامیاب رہے اس لئے مستحق ٹھہرے کہ ایک عہد ابدی کی عزت جاوداں اور دوسری بے شمار برکتوں اور سعادتوں سے سرفراز ہوں نہ یہ کہ محض ختنہ کی ایک رسم پر عمل کر کے وہ یہ سب کچھ پا گئے۔ یہ بات بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے۔ اور افسوس ہے کہ جو لوگ حق سے منہ موڑتے ہیں وہ ایسے ہی گڑھوں میں گرتے ہیں۔

آٹھویں دلیل

حضرت اسمٰعیل خداوند کی نذر تھے اور یہی قربانی کی حقیقت ہے

(۱۲) چند باتیں بطور مقدمہ ذہن میں رکھو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا تمام مال و اثاثہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو دیا اور اپنی حرموں کے بیٹوں کو کچھ انعام وغیرہ دے کر ان کو اپنے بیٹے اسحٰقؑ کے پاس سے مشرق کے ملک میں بھیجدیا۔ [۵۱] (پیدائش ۲۵-۱-۶)

حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کو زیادہ دور نہیں بھیجا بلکہ جبکہ ان کی وفات ہوئی تو انہی لوگوں نے ان کو دفن کیا۔ [۵۲]

ان مقدمات سے دو باتیں نہایت واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

الف۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے سے یا حضرت اسحٰقؑ سے زیادہ دور نہیں کیا تھا۔ بلکہ گاہ گاہ دونوں بیٹے باپ کی ملاقات کو بھی آیا کرتے تھے۔ یہ بات حرموں کے بیٹوں کو حاصل نہ تھی۔

ب۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ نہ تو میراث میں شریک کیا۔ اور نہ جس طرح لونڈیوں کی اولاد کو انعام وغیرہ دیے اس طرح ان کو کوئی انعام و عطیہ بخشا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی ذات سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس بیٹے کو اپنی عنایت سے محروم کردیں جو آخر عمر تک ان سے جدا نہ ہوا، جو ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور معلوم ہے اکلوتے ہونے کی مزیت ایسی مزیت تھی کہ اس کو کوئی بیجا چال نہیں کرسکتی تھی۔

اس اشکال کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ خداوند کی نذر کردیے گئے تھے۔ اور یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے (جیسا کہ حرف و او فصل ۲ میں ہم ثابت کرچکے ہیں) کہ جو شخص خدا کی نذر کردیا

---

[۵۱] اور ابرہام نے اپنا سب کچھ اضحاق کو دیا۔ اور اپنی حرموں کے بیٹوں کو ابرہام نے بہت کچھ انعام دیکر اپنے جیتے جی ان کو اپنے بیٹے اضحاق کے پاس سے مشرق کی طرف یعنی مشرق کے ملک میں بھیجدیا (پیدائش ۲۵-۵-۶)

[۵۲] اور اس کے بیٹے اضحاق اور اسمٰعیل نے مکفیلہ کے غار میں، جو ممرے کے سامنے، حتی صحر کے بیٹے عفرون کے کھیت میں ہے۔ اسے دفن کیا (پیدائش ۲۵-۹)

[illegible] تھا، میراث میں [illegible] کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا حصہ خداوند ہے۔

[illegible] نے [illegible] کی کہ ان کو قربان کرنے کے معنی اس کو اللہ تعالیٰ کی نذر کر دینا [illegible] کے گھر کا [illegible] حرف الف فصل ۲ میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔

نویں دلیل

خداوند کے حضور

حضرت اسمٰعیل کا خداوند کی نذر ہونا بہت سی دلیلوں سے ثابت ہے از انجملہ ایک واضح دلیل پیدائش [illegible] میں ہے کہ جب وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی انھوں نے فرمایا

[illegible] خداوند سے کہا کہ کاش اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔

یہ تیرے حضور یعنی تیرے آگے کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ خداوند کی خدمت اور اس کے گھر کی چاکری کے لئے خاص کر دیے گئے تھے ورنہ یہ فرمانے کا کیا موقع تھا کہ "تیرے حضور جیتا رہے"۔ اس کے معنی تو یہی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ خداوند کے حضور میں مستعد اور اس کے گھر کی خدمت کے لئے وقف تھے۔ [illegible] قربانی کی اصل حقیقت ہے جیسا حرف ج فصل ۲ میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

(باقی)

مذاکرہ

"بلاغ الحق"

(۲)

از جناب مولوی حافظ سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب اثنوری

حدیث | جناب مصنف آیت "قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ" الآیۃ کو عنوان بحث قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "محبت خدا و رسول وجہاد فی سبیل اللہ کو تو خدا نے نہایت اہتمام بالشان طریقہ پر فرض کر دیا، اور اس کی خلاف ورزی پر تہدید بھی کی"۔ پھر آگے چل کر تسلیم کرتے ہیں، کہ یہ صحیح ہے کہ "جس سے محبت ہوتی ہے اس کے تذکروں میں جی بستا ہے اور دل کو تسکین ہوتی ہے"۔ اب فرمائیے نتیجہ متبعین حدیث کی موافقت میں نکلتا ہے، جو محبت خدا و رسول میں اتنے سرشار ہیں، کہ اپنے حبیب اور محبوب کی ہر ہر ادا اور تمام حرکات و سکنات کو اپنے لئے نمونۂ عمل اور واجب الاتباع جانتے ہیں۔ یا منکرین حدیث کے حق میں، جو احادیث رسول کو نہایت بے پروائی کے ساتھ ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں۔ چنانچہ جناب مصنف نے بھی اس کلیہ سے یہی اوٹا نتیجہ ثابت کیا ہے۔

حدیث وسنت کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور منکرینِ حدیث کے دلائل کا اتنی مرتبہ جوابِ شافی دیا جا چکا ہے، کہ اب مزید لکھنا فضول اور تضییع اوقات ہے لیکن چونکہ اس تصنیف کا دارومدار ہی اس بحث پر ہے، اس لئے ان اعتراضات کے متعلق بھی سرسری اشارہ کر دینا از بس ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ:

"بعد زمانہ مدید حدیث جو جمع ہوئی، تو اسکے الفاظ بھی متفق طور پر رسول کے نہیں،

جب الفاظ کی نسبت رسول کے ساتھ نہیں، تو معنی کی قطعیت کہاں رہی؟"

گو کتابت حدیث کا سلسلہ تو عہد رسالت مآب ہی سے شروع ہو چکا تھا البتہ احادیث نبوی کی جمع و تدوین باضابطہ طور پر عہد رسالت کے کچھ عرصہ بعد ہوئی، لیکن یہ عرصہ سلسلۂ روایت کے لحاظ سے بہت قلیل ہے، مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ سنہ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور اسی بیس پچیس برس کی باتوں کو اس زمانہ پر قیاس کر لیجئے، کہ کس طرح کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، بہتیرے لوگ اس دور کے لوگوں کے ملنے والے ہوں گے، اور کچھ لوگ اس دور کے بھی ہوں تو عجب نہیں، اس لئے اُن تک حدیث کی روایتیں محض ایک یا دو سلسلہ سے پہنچی ہوں گی، اور یہ اس عہد کے مشاہیر رجال اور صاحب علم و فضل لوگ ہوں گے جن کی عدالت اور زہد و تقویٰ کو پرکھ لینا اس عہد کے لوگوں کے لئے کچھ دشوار امر نہ تھا، اس لئے یہ مدت صرف کہنے کے لئے مدت ہے، اور حدیث و سنت سے گریز کے لئے ایک بہانہ۔

اسی طرح دوسرا اشکال کہ حدیث کے الفاظ بھی متفق طور پر رسول کے الفاظ نہیں، یہ بھی ایک حیلہ ہے، یا قوم کو دھوکا دینا، اور رواۃ حدیث پر غلط اتہام، روایت حدیث میں عموماً یہ التزام ہے، جو روایت ہو بالفاظ رسول ہو، اسی لئے حدیث کے راویوں کی ایک اہم صفت ضبطِ تام، اور قوتِ حافظہ پر بھی نہایت سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی جاتی ہے، کہ راوی کہیں اپنے حافظہ کی کمزوری اور عدم احتیاط وقلت ضبط کی وجہ سے روایت حدیث میں اپنے الفاظ شامل نہ کر دے۔

اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

"اسکے سوا مرفوع متصل کے سوا کسی قسم کی حدیث نہیں، جس کا سلسلہ رسول تک پہنچتا ہو، پھر جس کا سلسلہ بھی رسول تک نہ پہنچے، وہ رسول کی حدیث کیوں کر ہو سکتی ہے؟"

حدیث کی دراصل تو دو ہی قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا سلسلۂ روایت رسول انام علیہ الصلوٰۃ والسلام

تک پہنچتا ہو، اور یہ مرفوع ہے، اور دوسری قسم جس کا سلسلۂ روایت صحابہ تک منتہی ہوا اور یہ موقوف ہے، متصل، منقطع، مرسل، معضل، وغیرہ تو کیفیت اسناد کے لحاظ سے حدیث کی قسمیں ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ مرفوع متصل کے سوا کسی قسم کی حدیث نہیں، جس کا سلسلہ رسول تک پہنچتا ہو، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ حدیث موقوف کے سوا تمام تر حدیثوں کا سلسلہ رسول تک پہنچتا ہے، ہاں کیفیت اسناد کے لحاظ سے سب کے مدارج مختلف ہیں، اب رہی حدیث موقوف، تو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو آپکے اخلاق حسنہ اور صفات عالیہ کے صحیح مظہر تھے، اُن کے قول و فعل کے متعلق سوائے اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے جو کچھ سنا، رسول سے سنا، اور جو کچھ سیکھا، رسول سے سیکھا، قرآن کریم میں حضرت ابراہیم کے ساتھ اُن کے صحابہ کو بھی ہمارے لئے اسوۂ حسنہ کہا گیا "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ" تو پھر اصحاب رسول اللہ کی سنت ہمارے لئے اسوۂ حسنہ کیوں نہ ہو، اور حدیث و سنت سے کیوں خارج کر دی جائے، لہذا حدیث مرفوع کی طرح حدیث موقوف بھی بلا حجت قابل قبول ہے، ہاں جو کچھ حجت ہو سکتی ہے، سلسلۂ اسناد کے ضعف و قوت میں۔

اسکے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے :۔

"اسلئے مرفوع متصل ہی ایک قسم کی حدیث ہے، جو من حیث سلسلہ رسول کی حدیث کہی جا سکے، بشرطیکہ صحیح اور حسن کی ترازو پر بھی ٹھیک اترے، اور نہ قرآن کی مخالف ہو، نہ حدود قرآنی کو کم و بیش کرنے والی۔"

"ذٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ" اچھا یونہی سہی لیکن اس کا فیصلہ کیونکر ہوگا کہ کون حدیث مخالف قرآن ہے، اور کون حدود قرآنی کو کم و بیش کرنے والی، مثلاً اسی مسئلہ متنازعہ فیہا میں، کہ آپ کو اتباع حدیث و سنت کے لئے سارے قرآن میں کوئی ایک آیت بھی نظر نہیں آتی، اس لئے آپ اس قسم کی تمام احادیث کو مخالف قرآن، لغو، مہمل اور رسول پر افترا کہتے ہیں، اور عامۂ مومنین کے لئے جو حدیث

کو واجب العمل جانتے ہیں، قرآن نے نماز اور سیدھا جنت کا راستہ بتلاتے ہیں، لیکن خلفائے راشدین، صحابہ کرامؓ ائمہ مجتہدین و محدثین، اور سلف صالحین کسی کو بھی یہ مضمون مخالفِ قرآن معلوم نہیں ہوتا، اب بتائیے تنہا آپ کی رائے معتمد ہے، اور موافقِ قرآن، یا عہدِ صحابہ سے اس وقت تک تمام مسلمانوں کی متفقہ رائے، لہذا اگر یہ اعتراف صدقِ دل اور خلوصِ نیت کے ساتھ ہے، تو محض تھوڑی سی ترمیم کے بعد یہ تجویز لائق عمل ہو سکتی ہے، کہ اگر کوئی حدیث مرفوع متصل صحیح یا حسن، قرآن کی مخالف، یا حدودِ قرآنی میں کمی بیشی کرنے والی نظر آئے، تو محض اپنی رائے پر بھروسہ، اور اپنی تحقیقات کو حرفِ آخر نہیں سمجھنا چاہئے، کہ ہو سکتا ہے، یہ اپنا قصورِ فہم ہو، اسلئے اس قسم کے اختلافات میں اجماعِ امت اور کثرتِ آرا کو فیصلہ کن سمجھنا چاہئے، جس پر قرآن کی نص صریح شاہد ہے، "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" اور "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاۤءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ" اور بلاشبہ یہی دین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

اس اعتراف کے بعد آپ پھر گریز کرتے ہیں:-

"ہم دل و جان سے مانتے ہیں، کہ قرآن تو نازل ہوا، لیکن وحی میں قوم نے اختلاف کر کے حدیث بھی وحی ہے"

یعنی حدیث بھی وحی ہے، ورنہ کہہ دیجئے، کہ رسول نے رکعاتِ نماز، نصابِ زکوٰۃ، کفارہ، حدود وغیرہ میں کیفیت خود وضع کر لی، اور تیسرے مسائل جن پر تمام مسلمانوں کا بلا اختلاف عمل ہے، نعوذ باللہ اپنے دل سے گھڑ لئے۔

اصل یہ ہے کہ وحی متلو اور غیر متلو کے متعلق اہلِ سنت والجماعت کے صحیح عقیدہ کو نہ تو ٹھیک طور پر سمجھا گیا، نہ سمجھنے کی کوشش کی گئی، اسلئے بخیالِ ازالۂ غلط فہمی عرض ہے، کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے عام انسانی علم و فہم اور عقل اور سمجھ سے مافوق جو قوت عطا کی تھی، جس کو شرحِ صدر، علم و حکمت، فہم و ادراک

وغیرہ الفاظ سے قرآن نے تعبیر کیا ہے، اس کے ذریعہ قرآن کی رسول نے جو تشریح کی، وہ گرچہ لفظاً وحی نہیں، لیکن اس اعتبار سے وحی ہے کہ اس تشریح واجتہاد کا ماخذ قرآن ہے، اسلئے قرآن وحی متلو ہے، کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور وہ لفظاً بھی وحی ہے، اور معنیً بھی، اور حدیث وحی غیر متلو ہے یعنی پیغمبر کا وہ بے خطا اجتہادِ قرآنی، جو قرآن میں لفظاً تو نہیں ہے مگر معناً موجود ہے، اور اسکی تلاوت نہیں کیجاتی۔

آگے چل کر متبعینِ حدیث کے دلائل پر آپ تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سب سے پہلی دلیل" وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى " سے ثابت کیا جاتا ہے کہ نطق کا لفظ موجود ہے، اسلئے آپ کا ہر بولنا وحی ہے،" هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ "کتاب کیلئے بھی نطق کا لفظ موجود ہے، دوسرے یہ نطق قرآن کے متعلق ہے،" عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى " اس کو واضح کر رہا ہے کہ آپ قرآن خواہشِ نفسانی سے نہیں بولتے"

اولاً تو یہ الزام غلط ہے، متبعینِ حدیث کا دعویٰ تو یہ ہے کہ دین کے متعلق آپ کا ہر نطق وحی ہے، اور آپ خود دل سے ایک حرف نہیں فرماتے، اور پھر اس کا کیا مطلب ہوا کہ نطق کا لفظ تو کتاب کے لئے بھی موجود ہے، تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جس معنی میں نطق کا لفظ کتاب کے لئے آیا ہے، اسی معنی میں رسول کے لئے بھی، یعنی جس طرح کتاب حقیقی معنی میں نہیں بول سکتی اسی طرح رسول بھی بولنے کی صلاحیت نہیں رکھتے! یہ تو عجیب انوکھا استدلال ہے، اسی طرح یہ کہنا کہ "عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى" اس کو ظاہر کر رہا ہے کہ آپ قرآن خواہشِ نفسانی سے نہیں بولتے"، کہ جب متبعینِ حدیث کا دعویٰ ہی یہی ہے کہ حدیث بھی وحی ہے، تو "عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى" سے اس کی تردید اور قرآن کی تخصیص کیوں کر ہوئی، یہ تو عین ان کا دعویٰ ہے۔

متبعینِ حدیث کی دوسری دلیل " مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا " پر آپ کے دو اعتراض ہیں، ایک تو یہ کہ اس آیت میں " لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ " کی طرح معنی پڑھے گئے ہیں، کیونکہ یہ آیت تقسیم غنیمت کی آیت کا ٹکڑا ہے"، دوسرا اعتراض یہ ہے، کہ "حدیثِ رسول

تو دے نہیں گئے، اور یہ اسکے کیا معنی ہوں گے کہ جو نہ دیں وہ نہ لو"

نمبر ۲ کے متعلق عرض ہے، کہ بلاشبہ نظم کلام سیاق و سباق پر نظر کرتے ہوئے یہ حکم تقسیم غنیمت کے لئے معلوم ہوتا ہے، مگر یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ "العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المحل" اس طرح تو بہت سے احکام کاٹ کر کم دئے جا سکتے ہیں، کہ یہ مخصوص موقع کے لئے تھا، اسلئے عمومیت لفظ پر نظر رکھئے، اور دیکھئے کیا عموم مستفاد ہوتا ہے۔

نمبر ۳ کے متعلق عرض ہے، کہ حدیث بلاشبہ رسول دے گئے ہیں، حضور نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا، صحابہ نے اجازت سے لکھا، اس کی تعلیم دی، تبلیغ فرمائی، کتب احادیث و سیر کا صدق نیت کے ساتھ مطالعہ راہ ہدایت کے لئے دروازے کھول دے گا، اور "وما نهكم عنه فانتهوا" کا ترجمہ جو نہ دیں نہ لو کرنے کی کیا ضرورت ہے، یوں کیوں نہیں کہا جاتا، کہ جس سے منع کریں باز رہو، اس طرح آیت کے معنی میں وسعت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی اشکال بھی باقی نہیں رہتا۔

تیسرے استدلال "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا" کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

> "اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" پورا جملہ قابل توجہ ہے، قضی کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ حکم فیصلہ خصومات کے متعلق ہے، دوسرے جس کا خدا اور رسول دونوں نے فیصلہ کیا اور وہ فیصلہ قرآن کا ہے، آپ قرآن سے فیصلہ دینے کے مامور تھے"

قضی کا لفظ نہیں بلکہ پورا جملہ بتا رہا ہے، کہ یہ حکم عام ہے، خدا اور رسول کا فیصلہ کسی امر کے متعلق، کسی بات کا حکم ہو ہر حال میں اٹل اور واجب الاتباع، اور اختیار ساقط، اور اس سے یہ استدلال کہ یہ فیصلہ قرآن کا ہے، قرآن پر ہاتھ صاف کرنا، قرآن کی آیتوں کا توڑ مروڑ اور "اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ" کا مظاہرہ

کرنا، اسکے بعد کی آیت نے اس مضمون کو نہایت واضح کر دیا ہے، جس کو آپنے خود نقل فرمایا ہے کہ:۔

"رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت زید کو حکم دیا تھا" امسك علیك زوجك" اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، چونکہ یہ خدا اور رسول دونوں کا حکم نہ تھا، اسلئے حضرت زید نے طلاق دیدی، "۔ نبی کے فرمانے کو مشورہ سمجھا، یا یونہی نہیں، گئے بھی تھے مشورہ ہی لینے اسلئے اُن کا اختیار باقی رہا"

آپ خود لکھتے ہیں، کہ یہ خدا اور رسول دونوں کا فیصلہ نہ تھا، بلکہ صرف رسول کا حکم تھا اور ...... رسول کے حکم کے بعد اگر اختیار باقی ہی رہتا، تو ایسی سخت تنبیہ کیوں ہوتی، حضرت زید کا رسول کے حکم کو مشورہ سمجھنا، اس حکم کے خلاف طلاق دیدینا، اور اس پر یہ تنبیہ اور وعید نازل ہونا کہ کسی مومن اور مومنہ کو خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد اپنے کاموں میں اختیار باقی نہیں رہتا، اور جس نے خدا اور رسول کی نافرمانی کی، کھلی گمراہی میں پڑگیا، تو دلیل قاطع ہے، کہ رسول کے حکم کے آگے سر جھکا دینا چاہئے، رسول کے فیصلہ کو برضا و رغبت قبول کر لینا چاہئے، اور اس وعید الٰہی سے ڈرنا چاہئے، نہ کہ حکم رسول کو مشورہ سمجھ کر ٹھکرا دینا، اور اس وعید کا مستحق ہونا۔

متبعینِ حدیث کا چوتھا استدلال اور بھی قوی ہے، واذ اسر النبی الی بعض ازواجه حدیثا فلما نبأت به واظهره الله علیه عرف بعضه واعرض عن بعض فلما نبأها به قالت من انبأك هذا قال نبأنی العلیم الخبیر، رسول اللہ صلعم نے بعض ازواج مطہرات سے کوئی بات پوشیدہ طور پر کہی، تو جب آپ کی زوجہ محترمہ نے کسی سے وہ بات کہدی اور خدا نے بھی آپ پر اس کو ظاہر کر دیا، آپنے بعض بات، کہنے والی بیوی پر جتا دی، اور بعض کو ٹال گئے، تو جب آپنے بیوی کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے کہا کہ آپ کو اس کی اطلاع کس نے دی، آپنے فرمایا خدائے علیم وخبیر نے یعنی اظهره الله علیه اور نبأنی العلیم الخبیر کے صاف اور کھلے ہوئے الفاظ شاہد ہیں، کہ وحی قرآنی کے علاوہ

آپ کو اور باتیں بھی وحی سے معلوم ہو جاتی تھیں۔

لیکن آپ کے خیال میں یہ قرآن میں عدم تدبر کا نتیجہ ہے اور قوم کو دھوکا دینا، فرماتے ہیں کہ "لما نبأت بہ" بیوی نے وہ ظاہر کر دیا، تو بات ظاہر ہو گئی، اور نبی کو جس نے مطلع کیا اس کے نام کی ستاری خدا نے کی، تو ہمارے رسول نے بھی اس کو ظاہر نہ کیا، جس نے نبی کو مطلع کیا تھا، اس سے نبی نے بعض بات کا اقرار کیا بعض سے اعراض، خدا سے نہیں وہ خود اپنا حال ہے۔

اس بیوی نے بات تو ظاہر کی تھی، لیکن اس پوشیدہ طریقہ پر اور رازدارانہ انداز سے کہ جس وقت رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے خبر دی انھیں اچنبھا و تعجب ہو گیا اور بیساختہ پوچھ بیٹھیں "من انبأک ہذا" اس لئے آپ کا یہ فرمانا کہ بیوی نے تو ظاہر ہی کر دیا تھا، اور بات کھل گئی تھی، بالکل لغو ہے، آنحضرت صلعم کی زوجہ محترمہ کے ظاہر کر دینے کے باوجود بات ہنوز صیغہ راز میں تھی، اور نبی کو ذریعۂ علم اگر ہو سکتا تھا تو وحی الٰہی، کیونکہ اگر آپ کی زوجہ محترمہ نے کسی کو اطلاع دی بھی تھی، تو وہ بھی ازواج مطہرات ہی سے کوئی تھیں، اور انھیں ان کی رازداری پر پورا اطمینان بھی تھا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع پر حیرت ہو گئی، اور جن کو اطلاع دی گئی تھی، انھوں نے بھی پوری طرح رازداری کی، آگے کی آیت سے یہ مضمون مستنبط ہوتا ہے کہ اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ، جنھوں نے نبی کے راز کو ظاہر کر دیا تھا، ان کی غلطی تو واضح تھی، لیکن تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ تنبیہ اس امر پر دال ہے، کہ جن کو خبر دی گئی تھی، انھوں نے اطلاع پانے کے بعد نبی کو اطلاع کیوں نہ دی، اور ایک دوسرے کی رازدار کیوں ہو گئیں، معلوم ہوا کہ دونوں کی غرض مشترک تھی، اور دونوں ایک دوسرے کی رازدار تھیں۔

مخبر نبی کے نام کی ستاری خدا نے کی، تو ہمارے رسول نے بھی اسکے نام کو ظاہر نہ کیا، یعنی ستاری کے لئے خدا اور رسول نعوذ باللہ دونوں جھوٹ بولے، اور ایک کو دوسرے سے بدظن اور رنجیدہ

کرنے کے لئے ایک چنگاری چھوڑ دی۔

لطہٰ آپ کی تیسری تاویل میں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ آپ "عرّف" کا ترجمہ اقرار کیا فرماتے ہیں، حالانکہ صرف و نحو کا مبتدی طالب العلم بھی جانتا ہے، کہ "عرّف" "اعتراف" یعنی "افتعال" سے نہیں، بلکہ باب "تفعیل" یعنی تعریف سے ہے، اور "تعریف" کے معنی اقرار کرنا کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا، لغت میں "تعریف" کے معنی ثنا ساکردن، آگاہیدن، وگم شدہ جستن، وخوشبوے گردانیدن واسم نکرہ را معرفہ کردن، ووقوف آوردن بعرفات، (صراح ومنتخب) لکھے اتنے معنی لکھے ہیں اقرار کردن شاید چھوٹ گیا: اسلئے تا وقتیکہ آپ "عرّف" کے معنی "اقرار کیا" ثابت نہ فرمادیں، میں آپکے اس استدلال کو لغو سمجھتا ہوں، کہ نبی سے آپنے بعض بات کا اقرار کیا بعض سے اعراض، خدا سے نہیں، وہ تو دانائے حال ہے، بلکہ آیت کے صاف معنی یہ ہوئے کہ کہنے والی بیوی سے آپنے بعض بات جتادی، اور بعض بات کو ٹال گئے، یعنی کمال رافت ورحمت، اور اپنے علو اخلاق کی وجہ سے آپنے اتنا بھی گوارا نہ کیا، کہ ساری باتوں کو کہکر زیادہ نادم وپریشان کریں۔

اب بتائے یہ منکرینِ حدیث کا عدمِ تدبر فی القرآن ہے، یا منکرینِ حدیث کے قصور فہم کا نتیجہ؟

کچھ دور کے بعد صفحہ ۳۴ پر ارشاد ہوتا ہے:۔

"اس پر کمزوری کے ساتھ یہ منہ بولا اقرار بھی، کہ قرآن قطعی ہے، اور حدیث ظنی، مگر ظن نے قطعیت کو ڈھانک لیا، اگر یہ اقرار منافقانہ نہیں، تو "ان الظن لا یغنی من الحق شیئا" پر ایمان لانا تھا"

محدثین خبر احاد کو جو ظنی کہتے ہیں، اسکے معنی صرف یہ ہیں کہ حدیث قرآن کی طرح قطعی نہیں ہے، لیکن اصول روایت ودرایت میں انتہائی احتیاط، اور صحت حدیث کے لئے تمام امکانی تدابیر کو مدنظر رکھتے ہوئے، بقرینۂ غالب فرمودۂ رسول ہے۔ لہٰذا یہ ظن اقرب بصحت ہے، لیکن آپ لوگ تو مجرد وہم د

ظن پر عمل کر کے اِنْ یَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ، کے مورد بنتے ہیں، اور ذرا نہیں ڈرتے، کہ شاید یہ حدیث فرمودہ رسول ہو، جیسا کہ اس کی صحت وصداقت پر روایت ودرایت کے اصول شاہد ہیں، تو ہم اس اتباع ظن کے پیچھے، رسول کی نافرمانی کے جرم میں ماخوذ ہوں، اگر دعوی اتباع قرآن کا دعوی منافقانہ نہیں، تو "اِنْ یَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ" پر بھی نظر کیجئے، اور محض ظن اور اٹکل پر رسول کی نافرمانی کا وبال اپنے سر نہ لیجئے، "وَلَا یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ اِنْ کَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ"،

آگے چل کر احادیث کے جانچنے کے لئے آپ دو ترازو پیش فرماتے ہیں، ایک تو عقل، جس کے متعلق آپ کا خود فیصلہ ہے، کہ یہ کامل بھروسہ کی چیز نہیں، دوسری ترازو حق وباطل کے جانچنے کی آپ کے نزدیک قرآن ہے، "اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا"، لیکن مشکل یہ ہے، کہ بغیر عقل وفہم ہم اس ترازو سے بھی کیونکر کام لے سکتے ہیں، اور عقل تو اپنے ماحول سے متاثر رہتی ہے، کبھی فرقہ پرستی کے تعصب، کبھی نفسانیت کی دیوانگی سے ٹھوکریں کھاتی ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ ہم کسی اثر، کسی تعصب، کسی نفسانیت کی وجہ سے قرآن کو اسکے صحیح منشا کے مطابق سمجھنے کی کوشش ہی نہ کریں، اور اسکے حقیقی مفہوم کو اپنے تعصب کے نشہ میں نفسانیت کی دیوانگی سے کتر بیونت کر کے رکھدیں، اسلئے نہ تنہا اپنی عقل پر بھروسہ کرنا چاہئے، نہ مجرد اپنی قرآن فہمی کو وحی قرآنی، بلکہ اجماع امت اور کثرت آرا کو بھی ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے، کہ جس طرح تواتر قطعی ہے، اور اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں، اسی طرح کسی ایک امر پر ایک جماعت کثیرہ کا اتحاد واتفاق اس کی صحت وقطعیت کی دلیل قطعی ہے، اور اس میں بھی کسی غلطی کا امکان نہیں۔

طرفہ تر یہ ہے، کہ آپنے باوجود انکار حدیث، حدیث سے بھی استدلال فرمایا ہے، جس سے بدگمانیاں اور بڑھتی ہیں، اور منکرین حدیث کی نیک نیتی وصداقت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے، چونکہ یہ رٹی ہوئی باتیں ہیں اور بالکل پامال مضمون، اسلئے جواب سے قطع نظر آپ کی بصیرت کے لئے میں بھی ایک حدیث پیش کر دوں،

اور مزید اطمینان کے لئے یہ بھی عرض کردوں، کہ ایک تو یہ حدیث مرفوع متصل اور حسن ہے، دوسرے کثرت طرق سے مروی ہے۔

عن ابی رافع قال قال رسول اللہ	ابو رافع سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا
صلعم لا الفین احدکم متکئا علی اریکتہ	کہ میں تم لوگوں میں سے کسی کو بھی ہرگز ایسا نہ
یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او	پاؤں کہ وہ اپنے مکلف تخت پر تکبر کے ساتھ
نھیت عنہ فیقول لا ادری ما وجدنا	تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور اسکے پاس میرا فرمان
فی کتاب اللہ اتبعناہ (رواہ	پہنچے جس کے متعلق میں نے حکم دیا ہو یا منع کیا
الترمذی وقال ھذا حدیث حسن	ہو تو وہ جواب دے کہ میں نہیں جانتا، جو کچھ
واحمد وابوداؤد وابن ماجہ والبیھقی	میں نے کتاب اللہ میں پایا اس کی اتباع
فی دلائل النبوۃ (مشکوۃ المصابیح)	کیا۔

اب اس حدیث کو قرآن پر بھی پیش کر لیجئے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا	اور جو شخص ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول
تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ	کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کی راہ کے سوا
الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ	دوسری راہ پر چلے، تو ہم اُسے اسی طرف پھیر دینگے
وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء ۲۳)	جدھر وہ متوجہ ہوا اور جہنم میں ڈال دینگے جو برا ٹھکانا ہے۔

ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں، کہ کسی سبیل سے رسول کا فرمان پہنچے، اور سلسلۂ اسناد و روایت پر نظر کرنے کے بعد راہِ ہدایت ظاہر ہو جائے، کہ یہ حدیث رسول ہے، پھر "ویتبع غیر سبیل المؤمنین" پر نظر کریجئے تو مضمون اور بھی آئینہ ہو جاتا ہے کہ کیا تیرہ سو برس سے آج تک مومنین کی یہی راہ رہی ہے، جو منکرین حدیث کے چند مخصوص افراد، اور محدود حلقہ کے سوا کون ہے، جس نے اتباع حدیث

انکار کیا ہو؟ لہٰذا اس حدیث اور آیت کا روئے سخن کھلا کھلا منکرینِ حدیث کی طرف ہے، اور اس وعید شدید کے ساتھ گویا آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اس فتنۂ انکارِ حدیث کی پیشینگوئی کر دی تھی، العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

اسوۂ حسنہ! اس باب میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، کہ قرآن میں رسول کے اسوۂ حسنہ کے اتباع کی جو ہدایت ہے، اس کا منشا صرف یہ ہے کہ "جن لوگوں نے جہاد سے منہ موڑا تھا، انکو منہ موڑنا نہ تھا، بلکہ جہاد میں رسول کی پیروی اور جانبازی دکھانی تھی" یہ دور از کار تاویل! اور متبعینِ حدیث پر الٹا الزام! کہ قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام کرنے کا کوئی مجاز نہیں، مگر مسلمانوں کا یہ شیوہ ہو گیا ہے" میں کہتا ہوں یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں، خاص منکرینِ حدیث کا شیوہ ہو گیا ہے "مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ" کو کس نے خاص کیا، اور اس کی عمومیت اور وسعتِ معنی کو کس نے برباد کیا، کہ یہ تقسیم غنیمت کے متعلق ہے، "اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" پر کس نے یہ ظلم لگا دی، کہ یہ فیصلہ خصومات کے متعلق ہے، "اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ" اور "نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ" میں کس نے یہ تحریف کی، کہ اللہ سے مراد کوئی انسانی ہستی اور علیم وخبیر کے معنی خدا نہیں بشر کے ہیں، ان تمام آیات میں لفظ کو اسکے وسعتِ معنی پر چھوڑ دیجئے، اور اللہ اس قسم کی رکیک تاویلات سے قرآنِ کریم کی فصاحت وبلاغت کو مجروح نہ کیجئے، کیا کسی انسانی کلام میں بھی اس قسم کی لغویت کا نمونہ مل سکتا ہے، کہ ایک لاثانی اور بہترین معلمِ اخلاق کے تمام اعمال و افعال میں بلا وجہ تخصیص صرف ایک ہی عمل، نمونۂ عمل ہو، کیا رسول کے دوسرے اعمال وافعال و اخلاق جن کے لئے قرآنی سرٹیفکٹ ہے، نمونۂ عمل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جو صرف حضور کی جرأت ودلیری و جانبازی کو نمونۂ عمل کہا گیا۔ ان ھذا لشیٔ عجاب۔ آخر اس ترجیح بلا مرجح کی وجہ؟

آپ دلیل یہ پیش کرتے ہیں، کہ ہم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صحابہ کے اسوۂ حسنہ کے

تعمیل کی بھی ہدایت کی گئی ہے، اسلئے ان آیتوں کے معنی کسی طرح یہ نہیں ہوسکتے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام یا ان کے صحابہ کی وضع قطع، اُن کا تمدن، اُن کی طرز معاشرت اور ان کی حدیثوں کی تعمیل کریں جو معدوم ہیں، تو یہ اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم ہوگا، یا تکلیف مالا یطاق "،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی تعمیل میں تو تکلیف مالا یطاق ہے، لیکن اُن کے مذہب وملت کی پیروی کس طرح آسان ہوگئی، جو حکم ہوا، "فَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا" جس طرح ملتِ ابراہیمی کی پیروی سہل کر دی گئی، اسی طرح اسوۂ ابراہیمی کی پیروی بھی آسان ہے، کہ اسوۂ رسول پر عمل کیجئے، جس طرح ملتِ ابراہیمی اور محمدی ایک ہے، اسی طرح اسوۂ محمدی اور اسوۂ ابراہیمی بھی دو نہیں ہوسکتے، اور پھر اسوۂ حسنۂ ابراہیمی کی تشریح بھی اُسی جگہ کر دی گئی ہے، کہ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہاں اسوہ سے یہی اسوۂ ابراہیمی مراد ہے، لیکن حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو علی الاطلاق کہا گیا، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا،

اور آپکے تمام دلائل سے قطع نظر، سوال یہ ہے، کہ "لقد کان لکم" سے روئے سخن کس کی طرف ہے؟ اور اس کے مخاطب کون ہیں؟ منافقین جو مسلمانوں کو بہکاتے تھے، اور یہ عہد کرکے، کہ پیٹھ نہ پھیرینگے، بھاگنے کو تیار تھے، یا مومنین، اگر آپکے خیال میں منافقین مخاطب ہیں، جو جنگ سے منہ موڑ رہے تھے، تو یہ اس لئے لغو، کہ "لِمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ" کی شان منافقین میں کہاں سے آگئی، اور جن کے لئے یہ قطعی اور اٹل فیصلہ تھا، کہ "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ"،

ایسے شقی ازلی کیلئے علام الغیوب کی طرف سے اس پند ونصیحت کے کیا معنی؟ اور اگر یہ

خطاب مومنین سے ہے، اور بلاشبہ انھیں سے ہے، تو آپ کی تاویل سے اُن پر یہ غلط اتہام قائم ہوتا ہے، کہ مومنین نے بھی جنگ سے منہ موڑا، حالانکہ اُن کو منہ موڑنا نہ تھا، بلکہ جہاد میں رسول کی پیروی اور ہمارا ہی دکھانی تھی، لیکن قرآن اُن کی ہمت و جرأت اور ایفائے عہد پر مرحبا کہہ رہا ہے، "وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا"، کیا قرآن کی شہادت کے خلاف، مومنین صادقین اور صحابۂ رسول کے متعلق یہ الزام ایک مسلمان کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

"اگر اسوۂ حسنہ کے خاص حکم کو عام ہی سمجھنا چاہتے ہو، تو یوں سمجھو خدا نے قرآن مجید نازل فرما کر دین کو کامل کیا، اُس کی اطاعت کا رسول کو بھی مامور کیا، آپ نے اطاعت کا حق ادا کیا، اور عبودیت کی شان دکھلا دی، اس لئے یہی قرآن کتاب اللہ ہے، یہی سنت رسول اللہ ہے، تو یہی آپ کا اسوۂ حسنہ ہوا"

یہ تو ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس حکم کی خصوصیت میں کس طرح کی لغویت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا یہ حکم عام ہی ہے، اور آپ کے خاص کرنے سے خاص نہیں ہو سکتا، اب رہا یہ کہ قرآن ہی آپ کا اسوۂ حسنہ ہے، تو یہ کیوں کر باور کیا جائے، قرآن سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا، کہ آپ نے اطاعت قرآن کا حق کس طرح ادا کیا، اور عبودیت کی کیا شان دکھلا دی، یہ تو حدیث و سنت سے ہی معلوم ہو سکتا ہے لہٰذا احادیث و سنت لاریب واجب الاتباع ہے۔

حدیث و سنت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا، اور میں نے بھی کوشش اختصار کے باوجود کافی طوالت کر دی، اب دوسرے مضامین کی طرف رجوع کرتا ہوں، اہل بصیرت اور حق پسندوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے اور بس "إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ"۔

(باقی)

مقالات

سیرت شبلی

از مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے علیگ

طبقہ امرا میں سے وہ اصحاب جو قومی درد بھی رکھتے تھے کالج میں تشریف لاتے تو ان کے استقبال کا مخصوص اہتمام ہوتا، ظاہری نمائش و طمطراق کے وہ تمام طریقے برتے جاتے جو موجودہ پر فریب تمدن نے تہذیب کے نام سے رائج کر رکھے ہیں، اور جن کو استادانہ انداز میں انجام دینا ہمیشہ سے ہمارے کالج کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مگر سرسید کے زمانہ میں ان ظاہر داریوں کے علاوہ یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ جس طریقہ پر ممکن ہو ان اکابر ملت میں قومی ضروریات کا صحیح احساس پیدا کیا جائے اور تحریک جدیدہ کے فوائد کا اتنا گہرا نقش ان پر ڈالا جائے کہ یہ ارباب استطاعت کالج کے مستقل ہمدرد بن جائیں۔ ان مواقع پر علامہ شبلی سے نظموں کی فرمائش ہوتی، اور وہ بخوشی تعمیل کرتے۔ تاہم اس میں بھی انھوں نے اتنا فرق مراتب ملحوظ رکھا تھا کہ گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام کی تشریف آوری پر انھوں نے کبھی کوئی نظم نہیں لکھی کیونکہ اس صورت میں ذاتی غرض کا شائبہ بھی ہو سکتا تھا اور بادخوانی کے سوا اس کا کوئی مستقل قومی مقصد نہ تھا۔

نواب سر آسمان جاہ مشیر الدولہ بہادر علی گڈھ تشریف لائے تو رودکی کے مشہور قطعہ کے تتبع میں ایک لاجواب قطعہ لکھا جس کا ایک شعر اس وقت میرے حافظہ میں ہے:

آسمان جاہ از سوئے ملک دکن   جانب ہندوستان آید ہمی

ہز ایکسیلنسی نواب محمد فضل الدین خاں سکندر جنگ اقبال الدولہ وقار الامرا بہادر مدار المہام
جب ہزاکسلنسی بجنس نظام حیدرآباد کالج میں تشریف لائے تو مولانا نے یہ ترکیب بند پڑھا۔

در جہاں چوں علم شوکت و دانش گذرد — نامہ دستور دکن بر سر عنواں گذرد
پیش چوں رتبہ نواب وقار الامرا — آنکہ گردوں بدرش بندہ فرماں گذرد
اے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم — بہ سر مدرسہ با ایں سروساماں گذرد
در دبستان ہنر جلوہ گاہ نشست — خواجہ ابریست کہ بر طرف گلستاں گذرد
گہ رفتے بہ ما کوکبہ پیش رود — تشنہ بنگر کہ بر او چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہے ریزہ رود بہ سر خاک — موکب خواجہ بما نیز بداں ساں گذرد
بیش واقعہ مور و سلیمان باشد — گر حدیث از شرف و پایۂ مہماں گذرد
دل او ... نو آمدہ ما نیست بجا — خوش بود گر سخن از عالم احساں گذرد
یادگار زمرہ دولت آصف جاہی ست — بہ نظر ہرچہ دریں منزل و ایواں گذرد
میوزیم کو شرف ہیبت ناموس دارد — جائے آنست کہ از طارم کیواں گذرد
خاص و عام از نم رشح کرمش سیراب اند — ابر ہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گذرد
صاحبا گوش بمن دار کہ تا شرح دہم — آنچہ بر ما ز تبہ کاری دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پائگی رتبہ ما — بیش از آں بود کہ در وہم سخنداں گذرد
حالیا کار بہ آں بے سروپائی کشید — کہ بہ ما گر کہ رسد بر زدہ داماں گذرد
بگذر از غم و آزار پیاپے بر ما — آنچہ بر شیشہ ز افتادن سنداں گذرد
ہرچہ از بے کسی و ذلت و خواری بینی — خود عیاں است و مپرس آنچہ بہ پنہاں گذرد
گر از ایں مکتب و ایں مدرسہ ویرانی گشت — ہم آں بود کہ ایں درد و درماں گذرد

این مسیحانہ اگر بہر مداوای خاست ہم آن بہ کہ رنجور خود از جاں گزرد
بہ سد پرورادہ ہر کہ بود طالب فن آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گزرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامہ او خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گزرد

ہر دم این مدرسہ لاریب دگر می گردد
اندکے باش کہ این قطرہ گہر می گردد

تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود جوئے این فیض بدینگونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالب فن روئے بدو خواہد کرد تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود
گر بدینگونہ بود مائدۂ فیض دراز یک جہاں زلہ ربائے سر خواں خواہد بود
دوست افسانۂ شادی بزباں خواہد راند خصم را دیدہ حسرت نگراں خواہد بود
ہست چوں در کنف قیصر و دارائے دکن ایمن از فتنہ و آسیب زماں خواہد بود
ملک و ملت ہدف تیر حوادث بود است آستانش حرم امن و اماں خواہد بود
آرزوہا است در اندیشہ دراز فضل خدائے آنچہ اندیشہ نمودیم ہمہ آں خواہد بود
گر بہ آئین سلف بہرہ ربائیم ز علم رخش اقبال دگر بہ تہ راں خواہد بود
باز در راہ طلب گرم بخیزیم ز جائے خواب دوشینۂ ما چند گراں خواہد بود
می تواں غلغلہ اوج و ترقی انگیخت تا کجے بر لب ما آہ و فغاں خواہد بود
بود آں ہم کہ بما نیز گہے یار شود چرخ تا چند بہ کام دگراں خواہد بود
ہاں نہ سنجی کہ نژاد عرب و آل لوے این چنیں خستہ و رسوائے جہاں خواہد بود
این چمن نازکہ پروردۂ ابر کرم است ہاں مپندیش کہ تاراج خزاں خواہد بود
بس بود این کہ نداریم سر تاج و کلاہ بخت زیں بیش چہ در فکر زیاں خواہد بود

با خستگی تن فطرت تو باقی است
خاک گشتیم و ہنوز آں سر سودا باقی است

جب نواب خلیفہ سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ اور مصنف "اعجاز التنزیل" تشریف لائے تو مولانا نے جلسہ دعوت میں سپاسنامہ کی فرمائش سے چند فارسی کے بند پڑھے۔ جن میں پہلا بند یہ ہے۔

اے دل ایں مایۂ افتخار کہ بود　　آخر ایں مستی از خمار کہ بود
چشم شوق بہ رہگزار کہ بود　　ہوس سرمۂ غبار کہ بود
ایں ہمیں خانہ جلوہ گاہ کہ شد
پردۂ دیدہ فرش راہ کہ شد

مولانا نے بعض محسنین کی وفات پر نہایت دلگداز مرثیے بھی لکھے ہیں۔ جنرل اعظم الدین کا مرثیہ تو دیوان میں شامل ہے۔ یہاں ہم نواب سر سالار جنگ کا مرثیہ جو دیوان میں نہیں ہے مکمل نقل کر دیتے ہیں، کیونکہ نواب صاحب کا نام سرپرستان کالج کے طبقہ سابقین اولین میں غالباً سر فہرست ہے۔

آہ ایں چہ غم بود کہ بسوخت نوحہ گر　　آہ ایں چہ ماتم است کہ خوں شد دل و جگر
نہ تنہا ہمیں نہ دولت ملک است در خطر　　ہم شرع را نماند کنوں حامی دگر
سالار جنگ مرد و جہاں گشت ویراں تر
شادی ز دل رمید و دل از جاں رمیدہ تر

ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار　　کز بین او نظام ریاست شد استوار
آئین رسم و داد ازو بود برقرار　　بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است
ہر کس چو شمع ز آتش غم در گرفتہ است

آں کار فلک بہ درگہ او سر نہادہ است — افسر بہ فرق او زمہ و خور نہادہ است
چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است — طرح جفائے تازہ ستمگر نہادہ است
تا ایں خبر بہ کوچہ و برزن فتادہ است
کار جہاں بہ نالہ و شیون فتادہ است

آں سرورے کہ مثل نبودش کسے بدہر — آئینہ دار طلعت او بود ماہ و مہر
ہم دانشش نصیب و ہم از داوریش بہر — ماہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبش سپہر
در تنگنائے تیرہ مغاک آرمیدہ است
خورشید زیر پردۂ خاک آرمیدہ است

امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود — پشت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود
زیب و طراز مسند و افسر جز او کہ بود — با آسمان بہ جاہ برابر جز او کہ بود
اکنوں اگر کنارہ ازیں خاکداں گرفت
آوازہ اش محیط زمین و زماں گرفت

آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہ او — آں کس کہ آسماں نہ رسیدے بجاہ او
اکنوں کہ گشت خلد بریں جایگاہ او — رحم است بر ریاست و روز سیاہ او
مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نہ داشت است
دردے بود کہ ہیچ مداوا نہ داشت است

آں داور جہاں کہ بدانش یگانہ بود — پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود
فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود — تا بنگریم تیر اجل را نشانہ بود
خار است ایں کہ بر ہمہ را در جگر نشست
بار غمے است ایں کہ فلک را کمر شکست

درفتنش گرچہ جہاں در فغاں بود		اما ہر آنچہ خواستہ آسماں بود
باشد ہمہ بیسود بود چہ زیاں بود		اکنوں دعائے شبلی دلخستہ آں بود
کاورا بود بہ گلشن دارالقرار جائے
خود زیر دامن کرم کردگار جائے۔

۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سید صاحب کی قیادت میں وفد حیدرآباد کی بھی شرکت کی۔ حیدرآباد میں نواب وقار الامراء بہادر کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے تقریریں کیں۔ مولانا نے ایک نہایت ہی موثر اور لطیف ترکیب بند پڑھا جسکے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

اے بزرگان گرامی نسب و اہل کبار		و اے عزیزان وفا پرور و اخلاص شعار
ہیچ دانید کہ از راہ نوردان دکن		ہیچ دانید کہ ما تازہ عزیبان دیار
تا چہ خواہیم و چہ جوئیم و چہ در سر داریم		چہ کسانیم و رسیدیم دریں جا بچہ کار

اس کے علاوہ تحریک جدید کے سلسلہ میں تعلیمی کانفرنس وغیرہ کے جو جلسے ہوتے رہے ان میں مولانا حالی کے دوش بدوش علامہ مرحوم نے بھی نظمیں پڑھیں۔ اور ان کا وہی اثر ہوا اور ہونا چاہئے تھا جو کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کی مجلس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی بے نظیر نظموں کا ہوتا ہے۔

شاعری کے ذریعہ سے کالج اور قوم کی جو خدمت علامہ مرحوم نے کی اس کا اعتراف بڑے بڑے بزرگان ملت نے کیا ہے چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم فرماتے ہیں۔

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

نثر تو ڈپٹی صاحب نے اپنے حصہ میں لے لی تھی تاہم نثر اور خطابت میں بھی مولانا کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے۔ مولانا شاعر، انشا پرداز اور مذہبی عالم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے اور بڑی

خصوصیت ان کی تقریر کی یہ تھی کہ وہ محض گرمی محفل کی چیز نہیں ہوتی تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جب چاہا رلا دیا مگر حاصل کچھ نہ نکلا، نہ وہ دوران تقریر میں مثنوی مولانا روم کی الاپ محفل اشعار کے ترنم اور قصص حکایات، لطائف و ظرائف سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان کی تقریر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کا نچوڑ اور کار آمد معلومات کا ذخیرہ ہوتی تھی اور علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس درجہ مدلل مرتب، دلنشین اور جامع کہ اگر قلمبند کر لی جائے تو بغیر کسی رد و بدل کے اپنے موضوع بحث پر ایک مستقل رسالہ کا کام دے۔ افسوس کہ اس زمانہ میں اردو مختصر نویسی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اور مولانا اپنی تقریریں پہلے سے لکھ لینے کے عادی نہ تھے، نہ بعد کو منضبط کر کے ان کی قیمت وصول کرنا پسند کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ نوادر الکلم محفوظ نہیں رہ سکے۔ ان... تقریروں کے ماسوا مولانا نے مستقل علمی اور تاریخی مضامین بھی کالج کے دوران قیام میں کالج کی تعلیمی مجالس کیلئے یا سید صاحب وغیرہ کی تحریک پر لکھے ہیں۔ یہ مضامین اپنی اپنی جگہ پر بے مثل ہیں ان میں سے بعض کا مجموعہ رسائل شبلی کے نام سے بارہا شائع ہو چکا ہے۔ متعلقہ فرائض کے سرانجام اور ان عارضی خدمات کے علاوہ وہ بھی مختلف طریقے سے کالج کو مستقلاً فائدہ پہنچاتے رہے۔ کالج میگزین کے نام سے ایک ماہوار ادبی رسالہ جاری کیا جسکی خود اڈیٹری کی۔ انجمن اخوان الصفا و لجنۃ الادب کی سرگرمیوں میں کافی حصہ لیکر طلبہ میں انشا و خطابت کا ذوق پیدا کیا۔ سب سے بڑا احسان مولانا کا یہ تھا کہ اس یورپ زدگی کے ہنگامے میں جہاں تک انکی زبان و قلم نے یاوری کی مسلمان نوجوانوں کو ان کی قومی روایات قومی تمدن اور اسلاف کے شاندار کارناموں کی یاد دلا کر ایک سیاسی حیثیت سے غلام قوم کو کم سے کم دماغی اور ذہنی غلامی سے بچانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک بار یونین میں یہ تحریک پیش کی کہ مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم یورپ کے جدید طرز سے بہتر تھا۔ اور بحث و مباحثہ کے بعد کثرت رائے اس تحریک کے حق میں ہوئی۔ صداقت کی یہ کامیابی فضائے علیگڑھ میں اور بالخصوص اس زمانہ میں اس درجہ غیر متوقع تھی کہ مولانا نے اپنے ایک خط میں اس کا تذکرہ کیا۔

"یہاں میں نے مجلس مباحثہ میں اس بات پر تقریر کی کہ ہمارا گذشتہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے بہتر تھا، اور بہت دیر کے بعد طلبہ نے میرے ساتھ رائے دی، یہ مولوی بالکل مجھ سے متفق تھے"

سیر چشمی اور فیاضی مولانا کو اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس لئے اتنی قلیل تنخواہ پر بھی ڈاکٹر کالج کی مالی امداد کرتے تھے، چنانچہ مشہور خطبہ کے وقت اپنا ایک ماہ کا مشاہرہ اور کورس کی آمدنی سے سو روپیہ سالانہ نذر کیا، سرسید اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی تصنیفات کا مالی فائدہ بھی کالج نے اٹھایا۔

ایک دوست نے اپنے قائم کردہ کلب کے لئے مولانا کی تصنیفات ہدیۃً مانگیں تو مولانا کو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑا۔

"میں اپنی تصانیف نذر نہیں کر سکتا، میری تصنیفات جو اس وقت تک معرضِ بیع میں ہیں المامون اور جزیہ ہیں، یہ دونوں کتابیں سید صاحب نے کالج کے لئے چھاپی ہیں، مجھکو حقِ تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا وہ دے نہیں سکتا۔"

قسطنطنیہ کا سفر آج جبکہ وسائلِ سفر کی کثرت اور تمدن کی پیدا کردہ آسائشوں نے سیاحت کو بھی ایک طرح کا تفریحی مشغلہ بنا دیا ہے، ڈگریاں لینے کے لئے وطنی سرمایہ کو دیارِ غیر میں صرف کرنے والے مسلمان تو ہزاروں ملیں گے لیکن خالص علمی تحقیق کی غرض سے سفر کی زحمت برداشت کرنے والے شاید کہیں خال خال نظر آئیں گے۔ مگر ہمارے اسلاف نے ایک ایک روایت اور ایک ایک نکتہ کی تحقیق کے لئے دور دراز کی منزلیں اس وقت طے کی ہیں جبکہ سفر واقعۃً سقر تھا۔ مولانائے مرحوم کو قدیم اسلامی روایات کے احیا کا جو شغف تھا اس کا تقاضا تھا کہ سیر و تفریح کے لئے نہیں، تبدیلِ آب و ہوا یا طلبِ جاہ و منصب کی غرض سے نہیں، بلکہ محض علمی و مذہبی خدمت کے بلند مقصد کو پیشِ نظر رکھکر ممالکِ اسلامیہ کا سفر اختیار کریں۔

کتبخانہ اسکندریہ اور الجزیہ جیسے نادر تحقیقی مضامین کی تصنیف میں مولانا کو جو کامیابی ہوئی اور ملک کے نکتہ شناس اشخاص نے ان مضامین کا خیر مقدم جس خلوص کیساتھ کیا۔ اس نے مولانا کی بیحد ہمت افزائی کی۔ چنانچہ انھوں نے اسلامی تاریخ کو اپنا مستقل موضوع تصنیف قرار دے لیا۔ اور یہ تہیہ کر لیا کہ سیاسی و علمی حیثیت سے جو ہستیاں تاریخ اسلام میں خصوصی طور پر ممتاز گزری ہیں۔ ان کے کارناموں کو جدید انداز پر ترتیب دیکر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ تصانیف کا نام "ہیروز آف اسلام سیریز" یا "سلسلہ نامور ان اسلام" تجویز کیا تھا۔

اس سلسلہ کی دو کڑیاں "سیرۃ النعمان" اور "المامون" شائع ہوکر مقبول ہوچکیں تو ہمت اور بلند ہوئی۔ اور اگرچہ اس وقت بھی سیرت نبوی کو ہاتھ لگانے کی جرات نہ ہوئی، تاہم اپنی تصنیفی مساعی کیلئے جو موضوع انھوں نے انتخاب کیا وہ سیرت کے علاوہ ہر ایک موضوع سے بلند اور عظیم الشان تھا یعنی سرور عالم کے اس رفیق خاص کی سیرت جو حضور کو بڑی دعاؤں کے بعد ملا تھا۔ اور جس کے متعلق خود زبان رسالت کا یہ فیصلہ تھا۔ لوکان بعدی نبیا لکان عمر

اگر محض تاریخ و سیرت کی مروجہ کتابوں سے اقتباس و ترجمہ کرکے ایک کتاب مرتب کرنی ہو تو تاریخی تصنیف سے زیادہ آسان کوئی کام نہیں ہے مگر مولانا نے اپنی تصانیف کا معیار بہت بلند رکھا تھا۔ یہاں ایک سطر لکھنے کے لئے بسا اوقات ایک ہزار صفحات کا مطالعہ بھی ناکافی ہوتا تھا۔ مولانا کو اپنی تصانیف کیلئے کیا کاوش کرنی پڑی ہے۔ خود ان کی زبان سے سنئے

زمزمہ کر بتار سخن میزنم — ہاں بنگر تا بچہ فن میزنم
پا چو دریں معرکہ افشردہ ام — پایہ فن تا بکجا بردہ ام
خاک در میکدہ ہا بیختم — کیں می صافی بقدح ریختم
غارت بتخانہ چیں کردہ ام — تا صنمے چند گزیں کردہ ام

دست ازیں کار نگہداشتن — نامہ بہ لعل و گہر انباشتن

کار من است ایں عدہ ہر خام نیست — ایں بود آں مے کہ بہ ہر جام نیست

ظاہر ہے کہ ان شرائط کے ساتھ اس وجود گرامی کے کارناموں کی تفصیل آسان نہ تھی جس کی ایک جنبش تیغ نے کسریٰ و ہرقل کے قصر اقتدار کو پاش پاش کر دیا، جس کے حکیمانہ ہدایات نے معرکہ حرب و قتال کو فن اخلاق کا ایک باب بنا دیا، جس کے عدل و انصاف نے دلوں سے نوشیرواں کی یاد بھلا دی، جس نے اسلامی حریت و مساوات کا وہ نمونہ پیش کیا جو تاریخ عالم میں بے نظیر ہے اور رہیگا۔ جس نے ایک طرف تو فن جنگ اور اصول جہانبانی کی داغ بیل ڈالی، اور دوسری جانب علم تفسیر، فقہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس اونٹ کی مہار تھامکر کشورکشائی کی اور مدینہ پر بیٹھکر روم و فارس تک فرمانروائی کی۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ مسلمانوں کی بدبختی سے ان کا علمی ذخیرہ بھی سلطنت کی طرح غیروں کے دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ بغداد کا تخت گرا تو یہ دولت نا شناسوں کے گرمیٔ سطوت سے چکنا چور ہوا، اندلس کا کتبخانہ مہذب دنیا کی عنایت سے نذر آتش ہوا، کہیں کہیں کچھ نوادر جو اسلاف نے بیادگار رکھے تھے وہ اخلاف کی نااہلی سے یا تو کیڑوں کی غذا ہوگئے یا یورپ کے کتبخانوں میں پہنچے۔ ان حالات میں علامہ مرحوم کو محسوس ہوتا تھا کہ الفاروق کی تالیف کیلئے محض اتنا ہی سرمایہ کافی نہ ہوگا جو ہندوستان میں ممکن الحصول ہے، بلکہ ممالک اسلامیہ کی خاک چھاننی بھی ضروری ہوگی۔ چنانچہ ارادہ طے کیا کہ مئی سنہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ کے لئے چل کھڑے ہوں گے

(باقی)

حکمتِ غربا

مارکس اریلیس کے خیالات

۶

از جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے۔

جب ہمارے اندر کا با اقتدار عنصر فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو آینوالے حالات اور واقعات سے ہمنوا ہو کر وہ خود ہی ان تمام امکانی صلاحیتوں سے آسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے جو اس کو عطا کی گئی ہیں۔ اپنی اثر پذیری کیلئے یہ عنصر کسی خاص شے کا محتاج نہیں ہے حصول مقصد کے بجائے جب اس کو موانع سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ان موانع کو وہ اپنے لئے مساعد بنا لیتا ہے۔ اس کی مثال بہت کچھ آگ کی ہے۔ جو انھیں چیزوں میں لگ کر بڑھتی ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ایسی چیزیں ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو تو گل کر دینے کیلئے کافی ہو سکتی ہیں، لیکن دہکتی ہوئی آگ اس تمام ایندھن کو ایک لحظہ میں جلا کر ختم کر دیتی ہے جو اس پر ڈالا جاتا ہے۔

لوگ ہمیشہ کسی دیہات میں یا سمندر کے کنارے، یا پہاڑوں پر جائے پناہ کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اور تو خود بھی ایسے ہی چیزوں کا عادتاً متمنی ہے، لیکن یہ ساری باتیں بالکل احمقانہ ہیں۔ کیونکہ تجھے ہر وقت آزادی حاصل ہے کہ تو خود اپنے اندر پناہ گزیں ہو۔ کیا انسان کے لئے اس پرسکون گوشۂ عافیت سے جو اس کو خود اپنی ہی روح کے اندر حاصل ہے کوئی اور بہتر گوشۂ عافیت مل سکتا ہے۔ یہ سکون سب سے زیادہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کا تزکیۂ نفس، ایسا مکمل ہو چکا ہے کہ پورا سکون حاصل کرنے کے لئے اس کو

صرف اپنے ہی پاک نفس سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں یہ سکون اور تزکیۂ نفس ہم معنی ہیں۔
پس جب توجہات تازہ کا متلاشی ہو تو آزادی سے اسی گوشۂ عافیت کی طرف چلا جا۔

چند مختصر اور بنیادی اصولوں کی بابت قدر کر کہ تو اپنے تمام درد و کلفت دور کر اور سکون کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو سکے اور جن چیزوں کی طرف واپس جا رہا ہے ان سے تو غمزدہ نہ ہو۔ کونسی چیز تیرے لئے باعث کوفت ہے؟ کیا یہ کہ انسانوں کے دلوں میں برائی ہے؟ اس بنیادی اصول کو یاد کر کہ سب ذی شعور مخلوق باہم متصل ہے۔ ایک دوسرے کی خاطر عالم وجود میں آتی ہے۔ تحمل اور درگزر کرنا انصاف کا جزو ہے۔ لوگوں کے گناہوں کا سرچشمہ ان کی مرضی و ارادہ نہیں ہے۔ اس بات پر غور کر کہ تجھ سے پہلے کتنے آدمی دشمنی، شک، نفرت اور ہنگامہ آرائی کی زندگی بسر کر چکے ہیں اور بالآخر سب پیوند خاک ہو گئے۔ اس بات پر غور کر اور سکون اختیار کر۔ لیکن شاید صورت حالات نے تیرے لئے پریشانی مقدر کر دی ہے۔ اس معمہ کو بھی یاد کر جو "وجود باری تعالیٰ" اور "نظریۂ ذرات" کے انکار یا قبول سے رونما ہوتا ہے۔ اور ان تمام ثبوت پر بھی نظر ڈال جن سے دنیا ایک دستوری حکومت ثابت ہوتی ہے۔ ممکن ہے نفس امارہ تجھکو بے چین کر رہا ہو لیکن اس بات کو یاد رکھ کہ جب دل ایک بار تو اپنی ہی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور اپنی قوت محسوس کر لیتا ہے تو پھر اس کا کوئی واسطہ یا تعلق تیری شیریں کلامی یا تلخ کلامی سے نہیں ہوتا۔ نشاط و غم کے عقائد پر بھی غور کر جن کی طرف متوجہ ہو کر تو نے اس کو قبول کیا ہے۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ شہرت و نام و نمود کے تصور اور اوہام کی خاطر تو بے چین ہو لیکن اب اس بات کو دیکھ اور غور کر کہ تمام چیزیں کتنی جلد فراموش ہو جاتی ہیں وقت کا کیسا عظیم الشان بحر بیکراں تیرے ماضی اور مستقبل کے درمیان حائل ہے۔ جو خراج تحسین لوگ پیش کرتے ہیں وہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے۔ جو لوگ تصنع کے ساتھ تیری تعریف کرتے ہیں وہ عقل اور استقلال سے بالکل محروم ہیں۔ ایسی تعریف و تحسین صد درجہ محدود ہوتی ہے کیونکہ تمام روئے زمین کی وسعت بمنزلہ

ایک نقطہ کی ہے۔ کل کا یہ کیسا حقیر جزء ہے جہاں ہم سب بستے ہیں۔ اصل یہ ہے یہاں رہنے والے بہت تھوڑے اور بالکل حقیر ہیں۔ کیا یہ لوگ تیرے مداح ہو سکتے ہیں؟

تیرے پاس صرف اتنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یعنی اپنی ذات کا جو قلیل رقبہ تیرے پاس ہے اس طرف جا ۔۔۔ بھول بسّے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ تو اپنے لئے کسی چیز کو انتشار انگیز نہ ہونے دے کشاکش اور تنازع کی ضرورت نہیں۔ اپنی آزادی قائم رکھ اور ہر چیز کا مقابلہ مردانہ وار بحیثیت ایک انسان ایک مرد، ایک رکن حکومت اور ایک فانی مخلوق کے کر۔ اپنے ان اصولوں میں جن کی طرف تو فوراً رجوع ہوا کرتا ہے ان دو مزید اصولوں کا اضافہ کر۔ پہلا اصول یہ ہے کہ بذات خود چیزوں کو روح کیساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ چیزیں باہر کی طرف بالکل ساکت ٹھہری ہوتی ہیں۔ سارے ہیجان کا سرچشمہ صرف اندرونی رائے ہوتی ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ساری چیزیں جو تو دیکھ رہا ہے وہ جلد تبدیل اور فنا ہو جائیں گی۔ اس بات پر بار بار غور کر کہ خود تیری آنکھوں نے کتنے انقلابات دیکھے ہیں۔ اس بات کو سمجھ لے کہ دنیا صرف تبدل اور آئندہ کی جگہ ہے۔ دنیا گویا صرف ایک رائے کی مظہر ہے جس پر انسان تاحیات قائم رہتا ہے۔

اگر ہمارا ذہنی جزء سب میں مشترک ہے تو قوت مدرکہ بھی ہم میں مشترک ہونی چاہیے جو ہم کو حیوان ناطق کا رتبہ بخشتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو قوت مدرکہ بھی جو امر و نہی کی محرک ہوتی ہے لازمی طور سے سب میں مشترک ہوتی ہے۔ بس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہی قانون کا وجود ہے اور اگر صرف ایک ہی قانون ہے تو ہم سب ایک ہی حکومت کے تابع اور ایک ہی جسد سیاسی کے اعضاء ہیں۔ اس شہر کائنات سے ذہن و عقل کی وہ قوتیں پیدا ہونی چاہئیں جو ہمارے تخیل قانون کے مطابق ہیں ان قوتوں کا اور کوئی دوسرا سرچشمہ نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہمارا خاکی عنصر ہم کو کسی کائنات خاکی سے عطا کیا گیا ہے اور ہمارا سیال عنصر ب بالکل مختلف عنصر ہے، اور سانس، حرارت، گرمی، ہر ایک اپنا مخصوص سرچشمہ رکھتی ہیں اسی طرح ت مدرکہ کا بھی ایک متعین سرچشمہ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ایک مقولہ ہے کہ عدم باعث وجود نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح جیسے کہ عدم سے جز عدم کچھ بھی نہیں حاصل۔

(باقی)

ادبیات

آہ اقبال!

ازجناب مولوی محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ

یونہی ہوتے رہیں گے حشر تک شام و سحر پیدا — نہ ہوگا اب مگر اقبالؔ سا صاحب نظر پیدا
ملا تھا تجھکو جو روزِ ازل فیضانِ فطرت سے — کہاں ہر پیکرِ خاکی میں وہ سوزِ جگر پیدا
نہ اٹھا پھر کوئی رمزِ اَنا کا عارفِ کامل — ہوا تھا ایک تو ہی خود شناس و خودنگر پیدا
تڑپتا ہی رہے گا ذرہ ذرہ خاکِ مشرق کا — تری رنگیں نوائی نے کیا ہے وہ اثر پیدا
دیا ہے آب و گل کو تو نے وہ درسِ پرافشانی — کیے ہیں قطرۂ شبنم نے بھی اب بال و پر پیدا
کیا ملت کو پھر ذوقِ یقیں سے آشنا تو نے — ترے دم سے ہوئی پھر چشمِ باطن میں نظر پیدا
ہوئیں تجھ سے نوائے صبح میں کیفیتیں پنہاں — دلِ درد آشنا میں لذتِ آہِ سحر پیدا
زسرتاپا یقیں مستِ خودی وقفِ خودآگاہی — کہاں اب دہر میں ہوتے ہیں ایسے باخبر پیدا

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

(اقبال)

غزل

از

جناب مولوی احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی وکیل اعظم گڑھ

زباں پہ نام ہوں جو بجلیاں گرانے کی — عجیب طرز ہے ان کی بھی دل میں آنے کی
جو آرزو ہے مجھے ان سے دل لگانے کی — ہجوم غم میں ادا سیکھ مسکرانے کی
نگاہ شوق سے کیفیت محبت پوچھ — یہ داستاں تو زباں پر نہیں سنانے کی
نہ دیکھ میرے نشیمن کی سمت اے صیاد — کہ بجلیوں کو بھی طاقت نہیں جلانے کی
ہم آستان محبت کے ہیں وہ خاک نشیں — مٹا سکیں نہ جنہیں گردشیں زمانے کی
وہ دل ہے ننگ محبت وہ دل ہے ناقابل — کہ جس میں تاب نہ ہو عرش کے ہلانے کی
ازل سے گوش بر آواز ہے یہ عرصۂ دہر — کشش عجیب ہے کچھ عشق کے ترانے کی
قفس ہے گو بہت آراستہ ترا صیاد — وہ زندگی ہے کہاں میرے آشیانے کی
ٹپک رہی ہے جو آنکھوں سے تیری اے ساقی — وہی تو اصل میں اک چیز ہے پلانے کی
ترا سوال ہے اور اک سکوت حیرت ہے — کسے مجال ہے طاقت ہے لب ہلانے کی
وہ کیف تشنہ لبی ہے مرا کہ جس پہ نثار — تمام شورش و مستی شراب خانے کی
رہی ہیں روز ازل سے رہیں گی تا بہ ابد — یہ شورشیں دل بیتاب کے فسانے کی
یہ مہر و ماہ بھی قدموں پہ تیرے گر پڑتے — مگر تمیز کہاں ہے نظر اٹھانے کی

غبار راہ نہیں میں، کہ اڑ کے رہ جاؤں
میں وہ ہوں خود جو پلٹ دے ہوا زمانے کی

وہ روح قلب کی گہرائیوں میں ہے پنہاں
وہ کوئی چیز نہیں دیکھنے دکھانے کی

بہار لالۂ و گل، جلوۂ مہ و انجم
یہ صورتیں ہیں فقط ان کے مسکرانے کی

بجز جنوں نہیں اس بندگاہ ہستی میں
یہ عقل مصلحت اندیش کام آنے کی

ہر ایک موج جو اٹھتی ہے میرے ساغر سے
تجلیاں ہے لیے کل شراب خانے کی

وہ تیرے شیشۂ دل میں ہوں کیسے عکس فگن
کہ پہلی شرط ہے ہر نقش کے مٹانے کی

کہاں وہ دار و رسن کی سعادت ابدی
کہاں یہ شورش بے کیف قید خانے کی

فضائے عرصۂ کونین دیکھتا ہوں میں
کہ اس میں کتنی ہے وسعت مرے سمانے کی

یہ مہر و ماہ کی ہیں کل بلندیاں معلوم
فقط ہے دیر جنوں کے قدم اٹھانے کی

چلا ہے چاک گریباں یہ لیکے کیا احسان
کہ جان ہے نذر مدینے کے آستانے کی۔

تلخیصات

"پھر وہی قید قفس پھر وہی صیاد کا گھر"

جرمنی میں آزادی نسواں کا حشر!

مغربی تہذیب نے عورتوں کو جو آزادی دے رکھی تھی اس کے نتائج نظروں کے سامنے ہیں۔ لیکن اب زیادہ دنوں تک یہ آزادی باقی نہ رہ سکے گی۔ جرمنی میں اس کا ردعمل شروع ہو چکا ہے اور وہ جس زور کا تھا جتنا اس سے زیادہ زوردار ہے۔ ہٹلر نے عورتوں کو پھر گھر کی چار دیواری میں بند کر دیا ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم اب سابق عورت کے لئے بہر نتیجہ ممنوعہ قرار دیدی گئی۔ جرمنی چاہتا ہے کہ عورتیں کچھ نہ کریں، صرف بچے پیدا کریں جن کی آئندہ جنگ میں ملک کو ضرورت ہے۔ ایک نازی لیڈر الفرڈ روزنبرگ کہتا ہے "جو عورت بچے نہیں پیدا کرتی، بیاہی ہو یا بن بیاہی، وہ ان کے لئے لعنت ہے"۔

لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم علانیہ ممنوع نہیں قرار دی گئی۔ لیکن اس راہ میں اتنی دشواریاں پیدا کر دی گئی ہیں کہ اس کا حاصل کرنا ان کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ برلن یونیورسٹی کی یونین کا صدر کہتا ہے "یونیورسٹیاں صرف مردوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کا اصلی مقصد صرف یہ ہے کہ ان کو ماں بننے کے لئے تیار کیا جائے۔ ہم عورتوں کی تعلیم محض کلچر کے خیال سے بالکل بے سود سمجھتے ہیں"۔

لڑکیوں کو ماں بننے کیلئے ایک سادہ کلچر سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ اور یہ چیز وہ ثانوی مدارس میں حاصل کر لیتی ہیں یہ مدرسے ان کی عام صحت اور ورزش کا بھی زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ تندرستی ماں بننے کے لئے سب سے مقدم شے ہے۔ ان اسکولوں میں ضروری اور مفید معلومات،

کھانا پکانا و صفائی کے آداب، حفظان صحت اور ورزش کے ضروری طریقے سکھائے جاتے ہیں اور تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں کے دلوں میں نازی اصول جاگزیں ہوں۔ ان کو جنگ کی برتری، حکومت کی سربلندی، اور ہٹلر کی تنظیم کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اور انہیں نسلوں اور خاندانوں کے ذہنی وخلقی تفاوت کے نظریہ کو مقبول بنایا جائے۔

ثانوی نصاب کے ختم کرلینے کے بعد، لڑکی کچھ عرصہ تک، کسی گھر کی خادمہ، یا کسی فارم کی مزدور یا بچوں کی انا بنکر گھریلو اور عملی زندگی کے تجربات حاصل کرتی ہے۔

حکومت نوجوانوں اور بن بیاہی لڑکیوں کو اپنے خزانہ سے قرض دیکر ازدواجی زندگی کے لئے ابھارتی رہتی ہے۔ تاکہ انھیں گھریلو زندگی میں کوئی زحمت نہ محسوس ہو۔ بعد ازاں چند برسوں کے اندر ان قرضوں کو وہ بالاقساط ادا کردیتے ہیں۔ اگر ایک مقررہ میعاد کے اندر کوئی بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو چوتھائی قرض ساقط ہوجاتا ہے۔ اس طرح پر عورت کے ہاتھوں سے عمل ونفع کا پچھلا میدان جاتا رہا۔

اس تحریک کے ائمہ چاہتے ہیں کہ عورت کو تمام عملی سرگرمیوں سے ہٹاکر صرف معمولی گھریلو کاموں میں قید کردیں، لیکن ہنوز عورت کے لئے وہی کام ممنوع ہوئے ہیں جن کے لئے مرد نیز ہی سے لپک رہے ہیں اور جن کو وہ آسانی سے انجام دے کر نفع اٹھا سکتے ہیں۔ کارخانوں، فارموں اور سرکاری محکموں میں چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے دروازے اب بھی لڑکیوں اور عورتوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی اسی وقت تک کھلے رہیں گے جب تک مرد اُن کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ مردوں نے جہاں توجہ کی، عورتوں کو یہ تنگ میدان بھی ان کے لئے فوراً خالی کردینا پڑے گا۔

اب جرمنی میں، عورت سیاسی محکموں اور بڑے بڑے انتظامی عہدوں پر بالکل نظر نہیں آتی بلکہ معلمہ اور لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت میں بھی بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ ان کے لئے یونیورسٹیوں کے دروازے بالکل بند ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں قانونی کالجوں نے صرف سات لڑکیوں کا داخلہ کیا۔ کیونکہ

وہ چاہتے ہیں کہ عورت کسی موزوں ملازمت کی خواہش نہ کر سکے آج وہاں نہ کوئی عورت کسی اسکول جج یا مشیر ہے اور نہ کسی یونیورسٹی کی پروفیسر۔ بڑے بڑے تمام علمی عہدے صرف مردوں کیلئے مخصوص ہیں ۲۵ برس کی عمر سے پہلے کسی عورت کے لئے سرکاری ملازمت کا تعلق جائز نہیں ہے۔ مرد اور عورت اگر ہر حیثیت سے برابر ہوں تو حکومت مرد کو ترجیح دیتی ہے۔

حکومت اس کی وجہ یہ بیان کرتی ہے کہ اس کے پیش نظر یہ ہے کہ لڑکیاں ازدواجی زندگی کی طرف مائل ہوں۔ لیکن اگر یہ بھی ہو جائے کہ جرمنی کے تمام مرد شادی کرکے اپنی بیویوں کے نان نفقہ کے ذمہ دار ہو جائیں، جب بھی جرمنی میں ۸۰۰۰۰۰ لڑکیاں اور عورتیں بے مرد کی بچ رہیں گی۔

جرمنی میں عورت اس وقت نہ صرف مادی حیثیت سے ستم رسیدہ ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی مظلوم ہے۔ اس نے زندگی کی تمام تر چہل پہل سے محروم ہو کر اپنی دنیا اپنی چار دیواری کے اندر بسانی چاہی لیکن موجودہ گورنمنٹ اس کے اس چھوٹے سے دائرہ کے اندر بھی اس کو آزاد چھوڑنا نہیں چاہتی چنانچہ ان کو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت آزادانہ طریق پر اپنے حسب منشا کر سکے۔ بلکہ نازی گورنمنٹ بچوں کی تربیت کی ذمہ دار خود بن گئی ہے تاکہ ان کو شروع ہی سے اپنے نازی اصولوں پر لے چل سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ نہایت ظالمانہ ہے یہ ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کرنا ہے جو عورت آسانی سے نہیں برداشت کر سکتی۔ یا تو عورت کو باہر کی چہل پہل دو اور اگر اس کو اس سے الگ کرکے گھر کے اندر قید کرنا چاہتے ہو تو اس دائرہ کے اندر اس کو وہ سب کچھ دو جو اس کا ہے۔ اور یقیناً اس میں سب سے اہم اس کا بچہ ہے، جس کی مادی اور اخلاقی تربیت کی وہ تنہا ذمہ دار ہے۔

کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمن خواتین اس قید بند پر کیسے خوش رہ سکتی ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بن بیاہی لڑکیاں شوہر کی تمنا کرنا سیکھیں اور اس کے لئے موثر پروپگنڈا جاری کر دیں۔

اور شادی شدہ عورتیں اپنی اہلی زندگی پر قناعت کریں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں بچے پیدا کریں۔ کچھ دنوں کے بعد طبیعتیں آپ سے آپ بدل جائیں گی۔

موجودہ حکومت کا رعب دلوں پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ عورتوں میں اس طرز عمل کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ یاس وناامیدی کی حالت میں اس تماشہ کو دیکھ رہی ہیں اور اب سمجھنے لگی ہیں کہ عورت صرف بیوی اور ماں بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ کیسی بیوی اور کیسی ماں؟ ایسی بیوی جو بچے پیدا کرنے کا فرض انجام دے۔ اور ایسی ماں جو دودھ پلانے کی خدمت بجا لائے۔ اور اس کا تو خیال بھی نہ کرے کہ وہ گھر کی مالکہ اور بچے کی ماں ہے۔

عورت نے اپنے حق سے زیادہ لیا تھا زمانہ نے اس کو مع سود کے واپس لے لیا۔

ایک عمدہ عربی ریڈر

امثال الحکیم

از استاذ امام مولٰنا حمید الدین فراہیؒ

ہم لوگوں کو عربی کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے کے لئے عرصہ سے ایک عمدہ عربی ریڈر کی تلاش تھی۔ مگر کوئی مناسب ریڈر نہ ملی۔ مصر کے مدارس میں جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں وہ منگوائیں۔ مگر یہاں کے نصاب سے ان کا میل نہ ہوا۔ اتفاق سے مولانا کے کاغذات میں دیکھا گیا تو ایک نہایت عمدہ عربی ریڈر مل گئی جو انھوں نے نصاب تعلیم کے لئے تیار کی تھی۔ یہ ریڈر دائرہ نے چھپا کر شائع کردی ہے، عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کے لئے بہترین چیز ہے۔ اساتذہ و مہتمین دیکھکر انشاء اللہ اس کو پسند کریں گے۔ مدرسۃ الاصلاح نے اپنے نصاب کے لئے اس کو پسند کر لیا ہے۔ کتابت وطباعت بہترین، کاغذ عمدہ۔ قیمت ۸؍

منیجر

تقریظ و تبصرہ

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

دلی کا سنبھالا۔ مصنفہ جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۵۵ صفحے۔ کتابت و طباعت پاکیزہ اور خوشنما۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد عہ

دلی مرحوم کی رام کہانی یوں تو تاریخوں میں ہم نے بہت پڑھی ہے۔ لیکن اس کتاب کو پڑھکر دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے اور حالی مرحوم کے یہ شعر بے اختیار زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

دہلی مرحوم کے زمانۂ عروج کے آخری ایام کی تہذیب، اس زمانہ کے علما، شعرا، اور ہر قسم کے باکمالوں کی فنی خصوصیات اور مشاعروں کا مرقع اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اس دور کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

قرآن پاک۔ مصنفہ مولوی عبدالواحد سندھی، جامعی۔ استاذ مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ تقطیع ۲۲×۲۹/۱۶ ضخامت ۱۰۳ صفحے۔ کتابت و طباعت نہایت روشن۔ کاغذ سفید گلیز۔ قیمت ۶ر

یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ بچوں کی مخصوص زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک کیا ہے۔ دنیا میں کب آیا۔ اور دنیا والوں پر اس نے کیا اثر ڈالا۔ اس کی کس طرح حفاظت کی گئی۔ غرض۔ سہ زائد ذیلی سرخیوں کے ماتحت قرآن کی پوری تاریخ نہایت آسان زبان میں بیان کی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں اخلاق، عبادات، معاملات اور قرآن پاک کے آسمانی پیام کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ مسلمانوں کو مولوی عبدالواحد صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ان کے بچوں کے لئے ایک نہایت مفید کتاب لکھی۔ یہ کتاب بچوں کے نصاب میں شامل کرنے کے قابل ہے۔

لطائف غالب:۔ مولفہ مسز ایم۔ اے شاہ۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۳۲ صفحے کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ نفیس قیمت ۳؍

اردو ادب میں مرزا غالب کی بذلہ سنجی اور سنجیدہ ظرافت بہت مشہور ہے۔ ان کے لطائف ان کے مکاتیب میں اکثر ملتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ کوئی صاحب ذوق ادیب ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں منسلک کر دے، مسز ایم۔ اے شاہ مستحق ستائش ہیں کہ انھوں نے اس ادبی ضرورت کا احساس کیا۔ اور غالب کی بذلہ سنجیوں کے نمونے مختلف مقامات سے ڈھونڈ کر "لطائف غالب" کے نام سے ایک دلچسپ اور مفید کتاب کی صورت میں جمع کر دیئے ہیں۔ آج جبکہ اس طرح کی ستھری ظرافت کمیاب ہے اور مذاق عام روز بروز بگڑتا جاتا ہے، لوگوں کے لئے یہ کتاب نہ صرف تفریح کا باعث ہوگی بلکہ اس کے مطالعہ سے مذاق عام کی اصلاح بھی ہو سکے گی۔

انعامی مقابلہ:۔ مصنفہ مولوی محمد حسین حسان اڈیٹر پیام تعلیم۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۴۰ صفحے۔ کتابت و طباعت صاف و ستھری، کاغذ سفید دبیز۔ قیمت ۳؍

اس کتاب میں بچوں کے لئے دو قصے بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا قصہ ایک الو کا ہے۔ اور دوسرا مرغی کے ایک انوکھے بچے کا۔ دونوں قصے نہایت دلچسپ اور مزیدار ہیں۔ بچوں کو خالی اوقات میں مصروف رکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

۱۹۴۳ء کی چند مطبوعاتِ جدیدہ

دلی کا سنبھالا :- از خواجہ محمد شفیع دہلوی :- مرحوم دہلی کے ایامِ عروج کی مرقع نگاری اور کاملینِ فن کے تذکرے۔ دلی کی اس تہذیب کا نقشہ جو اب نابود ہے۔ اندازِ بیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ قیمت مجلد ؍

لطائفِ غالب :- مرتبہ [illegible] مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخ بیانی، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت ۳ ؍

شعلۂ طور :- لسان الغیب شاعرِ فطرت حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ۔ بالکل نئی ترتیب بہت کچھ نئے کلام کا مجموعہ۔ قیمت بھی کم کر دی گئی ہے۔ ۳ کے بجائے ۲ ؍

سبدِ چین :- مرزا اسد اللہ خان غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں ان کے وہ فارسی قطعات، ترجیع بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں جو ان کی کلیات میں موجود نہیں۔ قیمت ۸ ؍

ذکرِ غالب :- مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانح عمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ طلباء کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت ؍

قرآن کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ :- بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدنظر رکھ کر بتایا گیا ہے۔ مسلمان بچوں کے لئے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی۔ قیمت ۶ ؍

دہلی :- بچوں کے لئے دہلی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی ہے۔ بلاک کی ۶ تصاویر، ۲ نقشے۔ قیمت ۴ ؍

ملنے کا پتہ :- **مکتبہ جامعہ، دہلی، نئی دہلی، لاہور۔**

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی بہ فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعۂ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ پر عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق ہی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۳۰ صفحے۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۃ کافرون

اس میں ہجرت اور برات کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہوگئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴ر

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶ر

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

رجسٹرڈ نمبر ۵۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت آپ ہی کی خدمت و اعانت ہے، اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے، وہ دائرہ کے معاونین دائمی متصور ہوں گے، ان کو دائرہ کا رسالہ الاصلاح اور تمام مطبوعات بطور ہدیہ دی جاتی رہیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچیس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات بہ نصف قیمت دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح بلا قیمت جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے تو دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپئے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپئے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

محمد عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں چھاپ کر شائع کیا

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی، ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱-۵؍

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق۔ خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۴ صفحے قیمت :-۸؍

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابو لہب اور اس کی بیوی کے وجوہِ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت طباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۸ صفحے قیمت ۶؍

منیجر

| جلد ۲ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۸ء | نمبر ۶ |

فہرست مضامین

شذرات

مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی مرحوم: پچھلے مہینہ کے اہم واقعات میں سے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی وفات ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ اپنی قوم کی خدمت کا بڑا ولولہ رکھتے تھے۔ زندگی کا انداز بالکل مجاہدانہ تھا۔ یوں دیکھنے میں علم و تحقیق کی دنیا کے آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن طالب علموں کی طرح مطالعہ کے شائق تھے۔ تاریخ سے خاص ذوق تھا۔ قرآن مجید سے بھی دلچسپی تھی۔ مختلف عنوانات پر متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو، سب کی سب نہایت مفید اور قابل مطالعہ ہیں۔

خاص بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی عملی خدمت کے لئے ہمیشہ سرگرم رہتے تھے جن دنوں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں زوروں پر تھیں ایک شیدائی کی طرح شب و روز دیہاتوں میں چکر لگاتے تھے اور مسلمانوں کے دین و ایمان کی پاسبانی کرتے تھے۔ ان دنوں جب ملاقات ہوتی اور میں از راہ اخلاص عرض کرتا کہ آپ شمشیر و قلم دونوں کے دھنی ہیں تو ان کا اعتراف تقصیر قابل تماشا ہوتا۔ ان میں خاکساری تکلف کی حد تک تھی۔ مہمان کے سامنے بچھ جاتے تھے اور خدمت و محبت کی کوئی بات اٹھانہ رکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں اس چیز کی وجہ سے ان سے ملنے میں تکلف ہوتا تھا اور آج اس کی یاد سے دل کو نہایت قلق ہو رہا ہے کہ ہماری قوم کا کیسا شریف اور کارکن خادم اٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

بچوں کے دارالاقامہ کا سنگ بنیاد بچوں کے دارالاقامہ کی پہلی اینٹ جمعہ ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو رکھ دی گئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کا سامان فرمائے اور جس مقصد کے لئے اس کی تعمیر ہو رہی ہے وہ پورا ہو۔

یہ مبارک تقریب بانی مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیع صاحب کے ہاتھوں انجام پائی۔ مولانا حکیم احمد صاحب بصدر

کی وجہ سے ایک عرصہ سے خانہ نشین ہو چکے ہیں۔ اور معمولی نقل و حرکت سے بھی عاجز، لیکن سب کے اتفاق سے آخری رائے یہی قرار پائی کہ یہ کام انہیں کے ہاتھوں انجام پائے۔ چنانچہ مولانا کو اس کے لئے مدرسہ پر لایا گیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اساتذہ و طلبہ ان کو ایک کرسی پر بٹھا کر نیو کے پاس لے گئے۔ انھوں نے پہلی اینٹ اس حالت میں رکھی کہ آنکھیں اشکبار تھیں، زبان مشغول دعا، اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے بعد دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، اور طلبہ و اساتذہ نے آمین کہی۔ قبلہ جناب حاجی رشید الدین صاحب انصاری ناظم مدرسہ نے لوگوں کے اصرار سے اس عمارت کے اغراض و مقاصد پر کچھ کہنا چاہا لیکن گرد و پیش کی فضا اس قدر متاثر ہو چکی تھی، اور وہ خود اس اثر میں اس قدر ڈوب چکے تھے کہ زبان چند فقروں سے آگے یاوری نہ کر سکی۔

قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں ایسے ایام جشن و مسرت کے ہوتے ہیں۔ لیکن مومن کا نقطۂ نظر ہر گوشہ میں دوسروں سے کتنا مختلف ہے؟ وہ جب زیادہ سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں زیادہ سے زیادہ آنسو بہانا چاہتی ہیں کیونکہ ایسے ہی مواقع اس کی شکر گذاری کے احساس کو زیادہ ابھارنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہر کام میں ایک غیبی ہاتھ کو شریک کار دیکھتا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے سب اسی کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے سب میں اسی کی چارہ سازی اور تدبیر فرمائی کا منتظر ہے۔ پس کامیابیوں اور فتحمندیوں کی کسی منزل میں بھی وہ مغرور نہیں ہوتا۔

مولانا ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے آج سے ۳۰ سال پہلے سرائمیر کے اس چٹیل میدان میں ایک چھوٹے سے جھونپڑے کیلئے تنکے فراہم کئے تھے اور آج انہی کا ہاتھ تھا جو اس میدان کی پھیلی ہوئی وسیع عمارتوں کے اندر ایک نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک فتحمند سپہ سالار کی طرح اپنی کامیابیوں کی اس نئی منزل میں پہنچکر زیادہ سے زیادہ خوش ہو سکتے تھے کہ ان کی زندگی کے ساتھ انکی قوم کی تعلیمی خدمتوں کی ایک وسیع تاریخ وابستہ ہو رہی ہے۔ اور انکا اخلاص ان کے پروردگار کی نظروں میں اس قدر مقبول ہوا کہ ارباب علم و فن کی ایک بہت بڑی جماعت کو انکی کرسی اٹھانے میں عزت محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں

فرزندی کی نعمت کی جگہ جذبۂ شکر و سپاس کے آنسو چھلک رہے تھے، وہ اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرنے کیلئے الفاظ تلاش کرتے تھے مگر دل کے تاثرات نے زبان اور حافظہ دونوں کو مغلوب کر لیا تھا۔ اکھڑے ہوئے الفاظ اور آنسوؤں میں بھیگے ہوئے جملوں میں اپنے پروردگار سے انہوں نے جو کچھ کہا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کانوں میں اسکی گونج ہمیشہ باقی رہے۔ آج بھی جبکہ اس عمارت کی بنیادیں اٹھ رہی ہیں۔ اور کل بھی جبکہ یہ بن بنا کر تمام قسم کے علمی چرچوں اور ہنگاموں کا مرکز بن جائے۔

موزوں اسوقت تک حق مبارکباد ہے جب تک اس کے اعمال و افعال میں اسکی عظیم الشان روایات کی نمود باقی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے سرزمین بطحا میں ایک مقدس گھر کی بنیاد رکھی اور اپنے پروردگار سے اس کیلئے گڑگڑا کر دعا کی اور حضرت سرورِ کونین صلعم نے فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا جس کے لفظ لفظ سے عبدیت کا عجز اور حمد و سپاس کا جذبۂ تشکر ابل رہا ہے، مسلمان کی ہر تقریب تعمیر اور اس کا ہر جشن فتحمندی انہی مقدس واقعات کی یاد سے پُر رونق ہونا چاہیے۔

یہ تعمیر اب شروع ہو چکی ہے قوم کے ارباب کرم سے درخواست ہے کہ اس کی تکمیل کا بندوبست کریں۔ اس ہفتہ میں جناب حاجی حامد خانی صاحب سے اسی میں مار مزید وصول ہوئے۔

<u>ایک معزز مہمان</u> علامہ موسیٰ جار اللہ روس کے مشہور عالم ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی، روسی اور غالباً فرنچ بھی، غرض مختلف زبانیں جانتے ہیں بلکہ ان میں چار متقدم الذکر زبانوں کے جید اور مستند عالم ہیں۔ علوم مشرقیہ کی مختلف شاخوں میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ تفسیر، قرأت، ادب و نحو، فقہ اور اصول میں ان کو ماہرانہ اور مجتہدانہ بصیرت حاصل ہے۔ عالم اسلامی کی پچھلی چوتھائی صدی کی تمام سیاسی و مذہبی سرگرمیوں کو انہیں نہایت قریب سے دیکھنے اور بعض میں عملاً شریک ہونیکا شرف حاصل ہے۔ اس لئے ان گوشوں سے بھی وہ ایک محرم اسرار کی طرح باخبر ہیں۔ آجکل علامہ ہندوستان کی سیاحت فرما رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ آپ ہندوستان آچکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ علیگڑھ تشریف لائے تو استاذ مرحوم رحمہ اللہ کے معارف کی کشش اور مدرسہ کے دیکھنے کے شوق نے اس ویرانہ تک آپ کی رہبری کی۔ دو دن دلچسپ صحبتیں رہیں۔ یہاں کی فضا سے آپ کو کچھ انس ہو گیا ہے۔ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے دوبارہ تشریف لانے کا وعدہ فرمایا ہے اور اس مرتبہ ان شاء اللہ قیام کچھ طویل ہوگا۔

بعض تاثرات علامہ موسیٰ جاراللہ سے جن مسائل پر گفتگوئیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا عملی پہلو قابل غور اور غایت درجہ قابل غور ہے۔

علامہ نے مجھ سے سوال کیا کہ ہندوستان میں علوم عربیہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اور عربی مدارس جس ڈھرے پر چل رہے ہیں تمہارے خیال میں اسکا آخری انجام کیا ہونیوالا ہے؟ میں نے عرض کیا، عربی تعلیم، مدارس عربیہ اور ساتھ ہی مذہب کی تباہی! مجھے خیال تھا کہ علامہ یا تو اس خیال کی تردید کرینگے یا کم از کم اس ہولناک انجام کو اس سے کچھ ہلکا دکھانے کی کوشش کرینگے جتنا کہ میں دیکھ رہا ہوں اور یقیناً اگر ایسا ہوتا تو مجھے اس سے خوشی ہوتی لیکن انہوں نے اسکی حرف حرف تائید کی اور مزید قوت کے ساتھ۔

علامہ کے پیش نظر اس کے جو وجوہ و اسباب ہیں وہ دنیا کے وسیع حالات کے لحاظ سے نہایت وسیع و عمیق ہیں اور جدید انقلابات و تغیرات دوران کے مقابل میں مذہب اور مذہبی علم کی پسپائی نے ان کے ہر خیال کو حقیقت کی حیثیت دیدی ہے لیکن اسوقت ہم علامہ کی اس وسعت کے ساتھ غور کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کو ان حالات پر غور کرنا ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں اور جنکی روک تھام کا وقت اگرچہ شاید گذر چکا ہے لیکن ماتم کا وقت ابھی باقی ہے۔ ہندوستان میں عربی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے وہ دینی و دنیاوی اور علمی و عملی ہر پہلو سے بالکل ناقص ہے۔ اس نقص کی ذمہ داری کن لوگوں پر ہے؟ اس کے ابتدائی موجدین پر؟ زمانہ کے ناہموار و ناسازگار حالات پر؟ یا بعد میں اس لکیر کو آنکھ بند کرکے پیٹنے والوں پر؟ ہمارا خیال ہے کہ اب ان سوالات سے تعرض کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان میں سے جس پر بھی یہ ذمہ داری عائد کر دیجائے، ہماری ذمہ داری علیٰ حالہ قائم رہتی ہے اور چونکہ اس غلطی اور خوفناک غلطی کا دردناک انجام بدقسمتی سے ہمارے حصہ میں آیا ہے اسلئے فلک بخت و روزگار کو کوسنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ جلد سے جلد اسکو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ عربی تعلیم کے غیر مفید ہونیکا احساس ایک عرصے سے نہایت عام ہو چکا ہے۔ سر سید نے اپنے عہد میں عربی مدارس اور عربی تعلیم کے باب میں جو خیالات ظاہر کئے تھے عربی تعلیم کے حامیوں کی طرف سے انکی عملی تردید کیلئے کوئی موثر کوشش نہیں کی گئی۔ اس راہ میں سب سے زیادہ مشکور مساعی علامہ شبلی نعمانی کی ہیں لیکن آخر زمانہ میں انہوں نے اصلاح تعلیم و نصاب کی جو داغ بیل ڈالی تھی بعد والوں نے اس پر کوئی وسیع عمارت نہیں قائم کی۔ بنیاد کی اینٹوں کو بھی برہنہ چھوڑ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ گردش روزگار نے ان کو بھی تتر بتر کر دیا ہے۔

عفت الدیار محلها فمقامها

حالانکہ پچھلی نصف صدی کے اندر زمانہ کے انقلابات و تغیرات کی رفتار اس قدر تیز رہی ہے کہ ایک لمحہ غفلت کرنے والی قوموں کی بھاگ دوڑ کے میدان میں صدہا سال پیچھے رہ گئے ہیں ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

تعلیم کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس کا کوئی ایسا نظام جو جامد ہو باقی نہیں رہ سکتا۔ تعلیم کا مقصد انسانی ذہن و دماغ کی رہنمائی، افکار و خیالات کی قیادت، اور زمانہ کی ہر آن بدلنے والے اور ہر لحظہ گھٹنے بڑھنے والے حالات کے تقاضوں سے اسکو اس قابل بنانا ہے کہ وہ ہزار راہوں سے ایک متعین منزل تک پہنچ سکے اور وقت کی کوئی مشکل اس کیلئے ایسی نہ ہو جس کیلئے اس کے پاس تسلی بخش جواب نہ ہو جسم کو کوئی زخم لگے یا روح کو کوئی علت لاحق ہو، دونوں کیلئے اس کے شفاخانہ میں مرہم بھی ہو اور عقل ہر ایک کے لئے اس کے پاس غذا ہو۔ اور اسمیں مل جانے اور لچک جانے کی آپ ہی آپ اتنی صلاحیت ہو کہ ہر آن متحرک رہ سکے۔ اور ساتھ ہی اپنے مرکزی مقاصد و اساسی اغراض کے لحاظ سے اسکا نظام اتنا ٹھوس اور محکم ہو کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو ہلا نہ سکے۔ وہ ثابت بھی ہو اور سیارہ بھی، سمندر بھی ہو اور ساحل بھی۔ اس کو یا دوسرے صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہ ہر آن متبدل ہونے والا ہو لیکن کبھی نہ بدلا جا سکے۔

ممکن ہے تعلیم کے متعلق ان خیالات میں آپ کو کوئی غرابت محسوس ہو لیکن اسلامی نظام تعلیم کی اصل حقیقت و خصوصیت یہی ہے اگر آپ جدید ماہرین تعلیم کے نظریات میں یہ چیزیں پائیں تو مجھ پر اعتراض کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ آپکے سامنے اس تعلیم کے نظریات و افکار ہیں جو تاریخ کے ایک ایسی ہی پر غفلت دور میں، جیسا کہ شومیٔ قسمت سے آپ پر گذر رہا ہے اپنے مرکز سے کٹ کر انسانی اوہام و خرافات کی نہ جانے کن کن وادیوں میں ٹھوکر کھا رہی ہے۔ اور ایک انسان جو علم و بصیرت کی معمولی روشنی بھی رکھتا ہے بلا خوف تردید پیشنگوئی کر سکتا ہے کہ آپ کی غفلتوں کی بدولت اب آپ کی تعلیم بھی انہی وادیوں میں کھو جانے کیلئے بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اور یاد رکھئے کہ اب آپ میں یا تو اس کو تھام لینے کی صلاحیت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ یا باقی رہ گئی ہے تو آپ سنبھلنے میں اتنی تاخیر کر رہے ہیں کہ شاید جبتک آپ کپڑے سنبھالکر بستر سے الگ ہوں وہ آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے۔

بعض لوگ ان حالات کی ذمہ داری بعض مخصوص خیالات کے افراد یا بعض خاص مقاصد پیش نظر رکھنے والی جماعتوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان حضرات پر طعن و تعریض کے چند جملے لکھکر سمجھ لیتے ہیں کہ بس دشمنوں کا سر انھوں نے کچل دیا اور ماضی و مستقبل دونوں کا

باگ اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی حالانکہ ان حضرات نے حالات کو سرے سے سمجھا ہی نہیں ہے اور اگر سمجھا ہے تو نہایت درد کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے
کہ یہ لوگ حقیقت کے اعتراف سے شرماتے ہیں۔ ورنہ یہ بات کوئی بہت دقیق اور باریک بات نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو رجحانات و
خیالات پیدا ہو رہے ہیں انکی نوعیت محض شاعرانہ افکار و خیالات کی نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی اور موت کے لئے ہماری تحسین و تقبیح
کا انتظار کریں۔ وہ تو ضروریات زمانہ کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ چیزیں جو ضرورت کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہیں وہ بھوکے اژدہے
کی طرح خوفناک اور غضبناک شیر کی طرح بھری ہوتی ہیں۔ آپ ان کے سامنے چیخیں چلائیں عجز و مسکنت سے ناک رگڑیں یا آنکھیں بند کر کے
مردہ بن جائیں کسی حالت میں ان سے بچ نہیں سکتے۔ بہرصورت انکا لقمہ بننا پڑیگا۔ ایک آسودہ حال اور شکم سیر آپکا وعظ سن سکتا ہے
کہ کیا حرام ہے اور کیا حلال لیکن ایک مضطر کو اگر غذا نہیں ملتی تو مردار کھاتا ہے۔ ایک مردہ لاش کہیں پڑی ہوئی ہے تو اس پر گدھ اور کوے
ضرور گرینگے اور ایک لمحہ کیلئے بھی آپکے فتووں کا انتظار نہیں کرینگے۔ یہ ایک قانون الہی ہے جس کے تجربات روز ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔
دیوار کمزور ہے تو اسکو چونے گارے نئی اینٹوں اور پتھر کی سلوں سے مضبوط کرتے ہیں، صرف ابر و باد کی چیرہ دستیوں پر شکوے نہیں ہانکتے۔
طوفان جھکڑ اور سیلاب کے دریڑے تو آتے ہی رہیں گے سوال یہ ہے کہ آپ نے کرسی کا جالا کیوں تن رکھا ہے۔ ہمالیہ کی دیوار کیوں نہیں بنائی؟

ان مختلف مثالوں میں آپ وقت کی مختلف مشکلوں کی تصویر دیکھ سکینگے لیکن ہم اسوقت صرف عربی تعلیم کے نظام کی طرف اشارہ
کرنا چاہتے ہیں اسکے متعلق یاد رکھیے کہ یہ اندر اور باہر دونوں طرف سے کھوکھلا ہے۔ اسکی دیوار کی اینٹوں میں پہلے ہی سے لونی لگی ہوئی تھی اور
چھت کی کڑیاں اور شہتیر شروع ہی سے بوسیدہ تھے۔ اسسے زیادہ واضح لفظوں میں یوں سنئے کہ یہ ہماری اس دنیا کی ضرورتوں
انکی حاجات اور اسکی مقتضیات سے اسقدر ابعد ہے کہ اسکو دیکھکر آدمی کو دھوکا ہوتا ہے کہ شاید مذہب آخرت میں برتنے کی چیز ہے اس
دنیا سے اسکو کوئی علاقہ ہی نہیں۔ حالانکہ مذہب اسی دنیا میں برتنے کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اسکو ہماری تمام مشکلوں میں رہبر ہونا چاہیے۔
بالخصوص اسلام کی تو اصلی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہماری زندگی کے ہر گوشہ کیلئے ایک مکمل دستور العمل ہے۔ لیکن آج عربی مدرسوں کا ہر
طالب علم محسوس کرتا ہے کہ وہ جو چیزیں پڑھتا ہے انکا تعلق اس عالم سے نہیں ہے۔ اسکی تفسیر، اسکی فقہ، اسکا کلام، اسکی منطق، اسکا فلسفہ
کوئی چیز بھی اسکو ایسی نہیں معلوم ہوتی جو اس عالم میں کام دینے والی ہو۔ وہ جسوقت اپنے مدرسوں کی عقبیات کی یاد فرودشیاں
سنتا ہے تو اسکی حالت ایسی ہوتی ہے کہ گویا وہ خشکی کا جانور ہے اور سمندر کے عجائب پر کوئی خطبہ سن رہا ہے۔ اس حالت نے ہمارے عربی

مدارس کے طلبہ کی ہمتیں پست کر دی ہیں۔ وہ اندر اندر کڑھتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں؟ جو راہ ان پر تنگ؛ ہر دروازہ ان کیلئے بند، ہر معاملہ ان کے لئے معمہ، ہر مسئلہ ان کے لئے پر اسرار، اور ان تمام بوالعجبیوں پر سب سے بڑی بوالعجبی یہ ہے کہ تمام عالم کی سرداری اور قیادت کا حق بھی انہیں کو پہنچتا ہے۔ اور یہ چیز ان کو اس درد ناک کشمکش میں ڈال دیتی ہے جس کی طرف مرحوم ظفر شاہ نے اشارہ کیا ہے کہ

قسام نے قسمت میں مری لکھ کے غریبی فرمایا مزاج اس کا امیرانہ بنا دو

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان نادیدہ راہوں میں کود پڑتے ہیں جہاں ان کو علانیہ اپنی بے بسی محسوس ہوتی ہے اور انکی حالت بالکل وہ ہوتی ہے جسکی طرف ایک حماسی شاعر نے اشارہ کیا ہے ع من الناس من یقضی علیہ ولا یقضی۔

مثلاً عربی مدارس پر سرسید نے جب طعن کیا تو اسکا انتقام علماء نے تکفیر کے فتووں سے لیا حالانکہ اگر اسی وقت ہمارے علماء نے صحیح صورت معاملہ سمجھ لی ہوتی تو یقیناً آج حالات بالکل دوسرے ہوتے۔ لیکن انھوں نے خیال کیا کہ جب ہم ایک جگہ جم گئے ہیں تو سورج اور چاند بھی ہماری خاطر اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ زمانہ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات کے تغیر نے یہاں تک معاملہ پہنچا دیا کہ آج اس مسئلہ پر غور ہو رہا ہے کہ علماء ہمارے کلچر اور تمدن کی حفاظت کے بھی اہل ہیں یا نہیں؟ انگریزی اسکولوں کے وہ طلبہ بھی کہ جو مسکین سیاست و مذہب کی ابجد تک سے ناآشنا ہیں برملا کہتے ہیں کہ علماء سیاست و قیادت کے اہل نہیں، اور عوام تک کہ جنکی خوش عقیدگی کا اعتماد ہمارے علماء کا اصلی راس المال رہا ہے اس کو سنتے ہیں اور نہ صرف سنتے ہیں بلکہ خوش ہو ہو کر اس کو دہراتے ہیں۔

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

لیکن انصاف کیجئے کہ یہ قصور کس کا ہے؟ زمانہ کا یا آپ کا؟ زمانہ بدلا، لیکن اس نے کوئی نئی بات نہیں کی، وہ ہمیشہ بدلا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہے گا۔ ہاں آپ اپنی جگہ پتھر کی طرح جم گئے حالانکہ انسان جامد اور غیر متحرک نہیں بنایا گیا ہے۔

معارف قرآن

تفسیر سورہ قیامہ

(۲)

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

۵ - 'لا اقسم' میں 'لا' منفصل یعنی جملہ سے بالکل الگ ہے اور مخاطب کے خیال کی تردید کر رہا ہے یعنی انسان نے یہ جو خیال کر رکھا ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، بالکل غلط ہے۔ ضرور آئے گی۔ بعض لوگوں نے 'لا' کو زائد مانا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ مذہب نہایت ضعیف ہے۔ بعض اس کو متصل یعنی 'اقسم' سے لگا ہوا مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مذہب بھی صحیح نہیں۔ اولاً تو اس صورت میں آیت کے معنی بگڑ جاتے ہیں، ثانیاً قرآن کی تصریحات علانیہ اس مذہب کے خلاف ہیں۔ مثلاً فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ	پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مواقع کی
لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ	اور بیشک اگر تم جانو تو یہ بہت بڑی شہادت ہے۔

اگر اس کو متصل مانا جائے تو یہ کہنے کے بعد کہ 'میں نہیں قسم کھاتا' یہ کہنے کے کیا معنی کہ "اگر تم جانو تو یہ بہت بڑی شہادت ہے"! مزید تفصیل کے لئے آیت کی تفسیر پڑھنی چاہیے۔

قسم سے پہلے لا کا منفصل حالت میں آنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ 'کلا' بھی بالکل اسی نوعیت سے آیا کرتا ہے۔ مثلاً 'کلا والقمر' (کچھ نہیں چاند کی قسم) اور ان دونوں کی تکرار بھی بالکل یکساں نوعیت و حالت رکھتی ہے۔ مثلاً کلا، سوف تعلمون، ثم کلا سوف تعلمون

یہ اسلوب کلام عموماً اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی سابق خیال کی شدت کے ساتھ تردید کرنی ہو۔ چونکہ لا کا مقدم ہونا اس امر پر کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ کلام اس بات کی تردید کر رہا ہے جو پہلے کہی گئی ہے نیز یہ کہ اس بات کی شناعت اور لغویت اس درجہ واضح ہے کہ اس کی تردید میں ایک لمحہ کے توقف کی بھی موقع نہیں ہے۔ یہ نتیجہ یوں نکلتا ہے کہ قسم کے باب میں عام عادت یہ ہے کہ وہ ابتدائے کلام میں آئے، پس جب نفی کا لفظ اس پر بھی مقدم ہوا تو اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ مقصود غایت درجہ اہتمام و اعتنا ہے۔

یہاں ایک خاص نکتہ اور ملحوظ ہے کہ قسم بالعموم اثبات کی تاکید کے لئے آتی ہے۔ پس جب کبھی ایسا ہو کہ وہ انکار کی تاکید کے لئے آئے تو طبعاً اسلوب کلام یہی ہوگا کہ نفی کلام پر مقدم ہو۔ چنانچہ دیکھو، بولتے ہیں۔ لا واللہ، نہیں خدا کی قسم، والله لا، خدا کی قسم نہیں، نہیں کہتے، اگر یوں بولیں تو تاکید انکار کا سارا زور ختم ہو جائے۔ قرآن مجید کی آیت ذیل اسی اسلوب پر وارد ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ	پس نہیں، تیرے پروردگار کی قسم، وہ سچے مومن
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ	نہ ہوں گے تا آنکہ وہ تجھکو آپس کے اختلافات میں حکم
حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ	نہ پائیں وہ اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے کوئی تنگی۔

یہی اسلوب نابغہ ذبیانی نے استعمال کیا ہے۔

فلا لعمر الذی مسحت کعبته — وما هريق على الأنصاب من جسد

پھر نہیں اس ذات کی قسم جس کے کعبہ کا میں نے طواف کیا اور ان خونوں کی قسم جو تھانوں پر بہائے گئے

والمؤمن العائذات الطير تمسحها — ركبان مكة بين الغيل والسعد

اور اس ذات کی قسم جس نے پرندوں کو پناہ دی، کہ جانیوالے قافلے غیل و سعد کے درمیان ان پر گذرتے ہیں اور کوئی

ما قلت من سيء مما أتيت به — إذاً فلا رفعت سوطي إلي يدي

کہ جو بری باتیں تجھکو پہنچائی گئی ہیں میں نے ان میں سے ایک بھی نہیں کہی۔ اگر کہی ہو تو میرا ہاتھ مجھے کوڑا اٹھانے نہ دیگا۔

پھر وہی کہتا ہے۔

فلا عمر الذی اثنی علیہ وما رفع الحجیج الی الال

پس نہیں اس ذات کی قسم جس کی میں ثنا کرتا ہوں اور ان صداؤں کی قسم جن کو بلند کرتے ہوئے حجاج جبل الال کی طرف بڑھتے ہیں۔

لما اغفلت شکرک فانتصحی وکیف ومن عطائک جل مالی

میں نے تمہاری سپاس گذاری کے فرض کو کبھی نظر انداز نہیں کیا پس مجھے اپنا خیر سگال سمجھو۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ میرا سا جو کچھ مال متاع ہو بیشتر تمہارے عطیوں ہی سے ہوگا

امراء القیس کا شعر ہے

فلا وابیک ابنۃ العامری لا یدعی القوم انی افر

پس نہیں تیرے باپ کی قسم اے عامری کی بیٹی! بنو تمیم یہ دعوی نہیں کر سکتے کہ میدان جنگ چھوڑ کے بھاگ جاتا ہوں۔

قرآن مجید اور کلام عرب کے جو شواہد یہاں ہم نے نقل کئے ہیں، ان میں قسم محض انکار کے لئے ہے اس لئے جس بات کا انکار مقصود ہے اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب قسم ایک ہی ساتھ انکار اور اثبات دونوں پر مشتمل ہو تو وہاں اس کے بعد کوئی ایسی بات آتی ہے جو کلام کے اس دوطرفہ تقاضے کو پورا کر سکے۔ قرآن مجید نے ایسے مواقع پر دو صورتیں اختیار کی ہیں یا تو جواب میں اثبات وانکار دونوں کے پہلو جمع کر دئے ہیں۔ مثلاً قسم کھائی۔ فلا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے) پھر جواب میں فرمایا۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ	بیشک یہ ایک باعزت رسول کا قول ہے (یہ اثبات کا پہلو ہوا)
وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَ	اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے تم کم ترایمان لاتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا
لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ	قول ہے تم کم تر یاد دہانی حاصل کرتے ہو۔ (یہ انکار کا پہلو ہوا)
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ	پروردگار عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔

دیکھو جس طرح انکار مکرر ہے اسی طرح اثبات بھی مکرر ہے۔

یا دونوں کو حذف کر دیا ہے اور سلسلہ کلام کی کوئی ایسی بات کہدی ہے جو مقسم علیہ کو نمایاں کر رہی ہے یا موقع کلام اسقدر واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ مقسم علیہ آپ سے آپ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً

صٓ، وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ بَلِ الَّذِیْنَ — ص. شاہد ہے یاد دہانی بخشنے والا قرآن، بلکہ کافر

کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ — گھمنڈ اور جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں مقسم علیہ لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن کلام کا اسلوب ایسا ہے کہ صاحب نظر بادنیٰ وہلہ اس کو پہچان لیتا ہے۔

اسی اصول پر سورہ قیامہ کی آیت زیر بحث میں بھی مقسم علیہ کی پوری تصریح نہیں فرمائی ہے۔ اور اسکے چند وجوہ ہیں۔

الف بعد کی آیت اس کو خود بخود واضح کر رہی تھی۔

ب۔ مقسم بہ سے مقسم علیہ خود سمجھ میں آجاتا ہے

ج۔ زجر و توبیخ کا اسلوب بھی، جیسا کہ ہم چوتھی فصل میں بیان کر چکے ہیں، معاملہ کو بے نقاب کر رہا ہے۔

د۔ سابق سورہ بھی، جیسا کہ ہم نے فصل اول میں بیان کیا ہے، مقسم علیہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ہ۔ سورہ کے باقی الفاظ بالکل واضح ہیں۔ شاید دو لفظوں کے متعلق تمہارے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو۔

معاذیرہ ـــ اور ـــ فاقرہ ـ "معاذیر" معذرۃ کی جمع ہے اس کی اصل معاذر ہے۔ عربی زبان کی مشہور مثل ہے" المعاذر مکاذب" ی اس میں زیادہ ہو گئی ہے، جیسے کہ 'مناکیر' میں۔ میرے نزدیک لفظ کی صحیح اور واضح تحقیق یہی ہے اور موقع کلام سے پوری طرح مناسبت رکھتی ہے۔ بعضوں نے اس کو معذار کی جمع بتایا ہو جسکے معنی اہل یمن کی بولی میں ستر یعنی پردہ کے آتے ہیں۔ ہم کو اس سے اتفاق نہیں۔ آیت کی تاویل کے ذیل میں وجوہ معلوم ہو جائیں گے۔

'فاقرۃ' آفت اور مصیبت کے اسماء میں سے ہے۔ گویا وہ ایسی سخت و شدید آفت ہوگی کہ پشت

کی ہڈیوں کو توڑ دیگی۔ لفظ قارعۃ کی بھی یہی نوعیت ہے۔ آفت و مصیبت کی تعبیر کے لئے جو اسماء ہیں وہ قیامت کے لئے استعمال ہوتے ہیں کیونکہ سب سے بڑی مصیبت یہی ہے۔

۷۔ یہاں جو قیامت کی قسم کھائی گئی ہے اس میں جھڑکی اور تہدید کی انتہائی شدت و غلظت پیدا ہو گئی ہے گویا کلام کا خشمگیں تیور خود پکار رہا ہے کہ یہ کیوں جلدی مچائے ہوئے ہیں وہ ہولناک ساعت آ رہی ہے جو ان کے سامنے معاملہ کی تمام حقیقت بے نقاب کر دیگی، ٹھیک اسی کے مماثل کلام دوسری جگہ وارد ہے۔ فرمایا۔

" والیوم الموعود " (یوم موعود کی قسم) یہ قسم بھی اسی قہر و غضب کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جو الفاظ فرمائے ہیں ان میں لہجہ کی شدت پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ فرمایا۔ قتل اصحاب الاخدود (کھڈوں والے لوگ تباہ ہوں)

جو لوگ جلدی مچائے ہوئے ہوں ان کو مخاطب کرنے کے لئے یہ اسلوب کلام سب سے زیادہ بلیغ اور موثر و دلنشین ہے اور قرآن مجید نے ایسے مواقع پر بالعموم یہی انداز تخاطب اختیار فرمایا ہے۔ اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتھا کاذبۃ۔ یہ قسم اقسام قسم میں ایک مخصوص نوعیت و حالت رکھتی ہے۔ یہ ایک شے کو خود اس کے اوپر بطور شہادت پیش کرنا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بات اس قدر واضح، اس قدر جلی، اور اس قدر ابھری ہوئی معلوم و معروف ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود دعویٰ ہے اور خود دلیل، خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود۔ اس اسلوب کا ایک اور فائدہ بھی بہت نمایاں ہے۔ اس سے صبر اور فرصت کی قدر و قیمت کی تعلیم ملتی ہے۔ وہ جلدی مچائے ہوئے ہیں کہ اس دن کو معلوم کریں جس دن ان پر عذاب آئے گا، لیکن جواب میں اس دن کے بجائے ان کی وہ حالت بتائی جاتی ہے جو اس ہولناک دن کے آجانے کے بعد ہوگی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ موقع صبر، انتظار اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کا ہے، جلدبازی اور بے صبری کا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسے مواقع پر اکثر فرمایا ہے کہ ان سے اعراض کرو، اور ان کو مہلت دو۔ اس معاملہ کے اندر ایک نہایت اہم نفسیاتی حقیقت چھپی

ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جسم اور روح کے امراض میں ایک نہایت گہری مماثلت ہے۔ جس طرح جسم کے امراض کا علاج اس کے اضداد سے ہوتا ہے اسی طرح روح کے امراض میں بھی اضداد ہی کا نسخہ کارگر ہے۔ پس جو شخص جلد باز اور بے صبر ہے اس کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور نفع بخش دارو یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ صبر اور انتظار کی گھڑیاں جھیلے۔ قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ لِّلْكَافِرِينَ	مطالبہ کیا مطالبہ کرنے والے نے واقع ہونیوالے عذاب کا
لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ	جو کافروں کے لئے ہوگا، کوئی نہیں جو اسکو ٹال سکے۔
تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ	مدارج والے خدا کی طرف سے۔ فرشتے اور جبریل اسکی طرف
كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ	چڑھتے ہیں ایک ایسے دن میں جسکی مقدار پچاس ہزار سال ہے
فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ	پس صبر کرو خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ اسکو دور خیال کرتے
بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا	ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھتے ہیں۔

دیکھو یہاں سائل کو جواب نہیں دیا بلکہ آنحضرت صلعم کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھڑکی اور دھمکی اور تہویل و تخویف کے بعد دلیل و حجت کا پہلو نمودار ہوتا ہے۔ اور اس کے شواہد بھی قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً فرمایا۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ	کس چیز کی ان میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے؟ اس بڑی خبر کی
الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ كَلَّا	جسمیں کوئی کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ۔ کچھ نہیں ابھی انہیں معلوم
سَيَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ	ہو جائیگا ہاں کچھ نہیں ابھی انہیں معلوم ہو جائیگا۔

یہاں تک تمام تر زجر و تنبیہ اور تہدید و تخویف ہے۔ اس کے بعد دلیل نمودار ہوتی ہے۔ اور الم نجعل الارض مهادا سے لیکر "الفافا" تک دلائل قیامت بیان ہوئے ہیں (دیکھو سورہ کی تفسیر) اسی سے ملتا جلتا اسلوب زیر بحث سورہ میں اختیار فرمایا ہے پہلے بطور تہویل و تخویف قیامت کی قسم کھائی، اسکے بعد قیامت کی ایک ایسی

دلیل یہاں فرمائی جو انکی سب سے زیادہ واضح اور قریبی دلیل ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہاں چند لفظوں میں اسکی تشریح کردیں۔

۸۔ یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے ساتھ نفس لوامہ کی قسم کھائی ہے یعنی ہمارے نفس کو خود ہمارے نفس کے خلاف شہادت میں پیش کیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نفس پورے یقین کیساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ ایک ذمہ داری کے بوجھ سے گرانبار ہے اس پر ایک حاکم ہے جو اسکا محاسبہ کریگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض کام جو ہم کرتے ہیں اس پر ہمارا نفس ہم کو ملامت کرتا ہے۔ یہ حالت تو اس بات پر کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جزا و محاسبہ ایک دن ضرور پیش آنیوالا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ انسان کے نفس کے اندر ایک باطنی واعظ اور ناصح کی بولتی ہوئی زبان خود موجود ہے جو اس کو برابر ٹوکتی اور نصیحت کرتی رہتی ہے تاکہ نفس بالکل مطمئن و منقاد ہو کر راضی و خوشی اللہ کی جماعت میں داخل ہو جائے اور انکار و سرکشی کا کوئی داعیہ اس کے اندر باقی نہ رہ جائے یہی باطنی حس ہے جس کو قرآن نے بصیرت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ اور پھر تعجب کیا ہے کہ اس بصیرت کے ہوتے ہوئے وہ جزا کا منکر کیسے ہو سکتا ہے الا آنکہ اس بات کا انکار کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔۔۔ لیکن یہ خیال نہ صرف ایک انتہائی درجہ کی معصیت ہے۔ بلکہ ایک سخت و شدید حماقت بھی ہے۔ اور یقیناً یہی معصیت و حماقت داعی ہوئی کہ متمرد انسان حماقت و معصیت کی اس سے بھی زیادہ وسیع وادی میں قدم رکھدے یعنی اپنے پروردگار کے سامنے انکار کی جسارت ظاہر کرے۔ اور شک کی اس بیماری کو جو اس کے قلب کے اندر چھپی ہوئی ہے مذاق کی رعونت اور استہزا کے گھمنڈ کے ساتھ اگلنے لگے۔

(باقی)

اسباق النحو حصہ اول و دوم

ذبیح کون ہے؟

(۶)

دسویں دلیل

شریعت یہود میں اس عظیم واقعہ کی کوئی نشانی نہیں ہے

۳۴۔ اگر حضرت اسحاق علیہ السلام قربان ہوئے ہوتے، جیسا کہ یہود کا دعوی ہے، تو ان کے مذہبی رسوم و عبادات میں اس عظیم الشان واقعہ کی کوئی یادگار ضرور محفوظ رہ جاتی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ان کی تمامتر عبادت قربانی اور نذر سے عبارت ہے۔ بلکہ بغیر کسی شائبہ مبالغہ کے دعوی کیا جاسکتا ہے کہ قربانی کے سوا ان کے ہاں کسی عبادت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ انھوں نے اپنی بے شمار قربانیوں اور نذروں میں سے کسی نذر یا قربانی کو اس ابراہیمی قربانی کی طرف منسوب نہیں کیا۔ تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قربانی یا تو قوم فرعون کے پہلوٹھوں کے واقعہ ہلاکت کی یادگار ہے۔ یا فصح کی یادگار ہے۔ فصح کی یادگار یہودی سال کے پہلے مہینہ ابیب میں بطور عید منائی جاتی ہے۔ اور یہ عید درحقیقت سرزمین مصر سے خروج کی یادگار ہے۔ علاوہ ازیں (تثنیہ ۱۶: ۱۶۔ ۱۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ چوپایوں اور حاصل زمین کے شکریہ کے طور پر بھی وہ قربانی کرتے تھے۔ لیکن پوری تورات میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ ان کی کوئی قربانی حضرت اسحاق کے واقعہ ذبح کی یادگار ہو۔

اس کے بالکل برعکس حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت میں جو مذہبی رسوم و اعمال جاری ہوئے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اسی ابراہیمی قربانی کو حاصل ہوئی، چنانچہ عہد اسلام تک

ان میں جو مراسم دینی پائے جاتے تھے ان سب میں اس امر کی نہایت واضح شہادت موجود تھی۔ مثلاً تلبیہ یعنی لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھنا واقعہ قربانی سے ماخوذ ہے۔ اور اس کی تصدیق تورات سے بھی ہوتی ہے۔ تورات میں ہے کہ خداوند نے ابراہیم کا امتحان لیا اور پکارا کہ اے ابراہیم، حضرت ابراہیم نے جواب میں سات مرتبہ کہا "میں حاضر ہوں"۔ اسی طرح سعی کی رسم بھی اسی واقعہ قربانی ہی کے ایک معاملہ کی ایک یادگار تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صفا کی طرف سے آئے اور جوش اطاعت و بندگی میں پوری مستعدی اور سرگرمی سے مروہ کی طرف بڑھے پس سعی اس معاملہ کی یادگار کی حیثیت سے ذریت اسماعیل میں محفوظ رہ گئی، کیونکہ سعی عربی میں اس سرگرمی اور مستعدی کو کہتے ہیں جو بندہ اپنے آقا کی فرمانبرداری اور اطاعت اور اس کے حکموں کی تعمیل میں ظاہر کرتا ہے ایک شاعر کا مصرعہ ہے۔

یسعی علیہ العبد بالکوب

غلام اس کے سامنے شراب کے پیالے لیکر دوڑتے ہیں

اسی حقیقت کا اعتراف ہم دعائے قنوت میں کرتے ہیں والیک نسعی ونحفد نیز قرآن مجید میں ہے ویطوف علیھم ولدان مخلدون باکواب واباریق۔

طواف کے سات پھیرے بھی اسی واقعہ قربانی ہی سے ماخوذ تھے۔ چنانچہ نذر کے باب میں یہود کے ہاں بھی یہی رسم ہے۔ کہ وہ خداوند کے حضور یعنی بیت اللہ کے سامنے ہلائی جاتی ہے۔ دیکھو احبار (۸: ۲۷) اور (۱۴: ۲۲-۲۴)

سر مونڈنا بھی اسی سلسلہ کا ایک معاملہ ہے۔ یہود کے ہاں ان مراسم میں سے نذر کی قربانی کو ہلانے اور سر مونڈنے کی رسم موجود ہے لیکن نذر کی قربانیاں جیسا کہ گنتی (۶: ۵-۹) اور (۶: ۱۸) سے واضح ہوتا ہے صرف نفل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ قرآن مجید نے فریضہ حج کی پوری تاکید فرمائی اور بیان فرمایا کہ حج اور اس کے تمام مراسم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں اور ہماری ملت حضرت ابراہیم و حضرت

اسماعیل علیہ السلام کے اس اسلام پر مبنی ہے جس کے امتحان میں وہ پورے اترے نیز یہ بھی ظاہر فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے اپنی اس ذریت کے اندر جن کو مکہ کی سرزمین میں بسایا تھا، ایک نبی مبعوث ہونے کی دعا فرمائی اور اس کی امت کے لئے مسلم کا لقب پسند فرمایا۔

اس سلسلہ میں بعض اور باتیں بھی معلوم کرنی تھیں لیکن یہاں تفصیل کا محل نہیں۔ نیز اسی ذیل کے بعض ضروری گوشوں کی طرف خطبہ کتاب میں اشارہ ہو چکا ہے۔ اس کو سامنے رکھنا چاہئے۔

الغرض یہود کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی کوئی یادگار موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس خانہ کعبہ کے حج اور وہاں ہدیے اور قربانی پیش کرنے سے متعلق جتنی باتیں تھیں وہ سب انھوں نے مٹا ڈالیں اور تمام عزت و شرف صرف بیت المقدس کے لئے مخصوص کر دیا۔ اور عیسائی بھی اس معاملہ میں بالکل انہی کے نقش قدم پر چلے۔ ان مشترکہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم الشان قربانی کے تمام آثار و نشانات سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے چاہا کہ عزت و شرف کی جتنی باتیں ہیں سب صرف بیت المقدس کیلئے خاص ہوں اور معلوم ہے کہ بیت المقدس کو اس واقعہ قربانی سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا۔

یہود نے یہ تمام رد و بدل دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا لیکن اس سے اصلی نقصان در حقیقت خود انہی کو پہنچا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لئے کسی بات پر جمنا مشکل ہو گیا۔ وہ حیرانی اور تردد کی ایک مستقل کشاکش میں پڑ گئے۔ چنانچہ بعض حالتوں میں ان کو یہ تک اعتراف کرنا پڑا کہ قربانی کی کوئی اصل نہیں ہے یہ چیز موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ ان کے تمام صحیفے صرف قربانی کے ذکر سے لبریز ہیں۔ تورات میں اس ایک عبادت کے سوا کسی اور عبادت کا گویا ذکر ہی نہیں آتا یہاں تک کہ نماز کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ یہود کی ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ نماز فرض نہیں ہے۔ نفل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک اصلی عبادت صرف قربانی ہے لیکن قربانی کا حال یہ ہے کہ وہ ہیکل کے سوا کہیں ادا ہو نہیں سکتی (دیکھو لاوی ۱۷: ۹) چنانچہ جو زمانے ان پر ایسے گذرے کہ وہ ہیکل سے

جیزا بے تعلق کردیے گئے۔ ان زمانوں میں وہ اپنے دین سے بالکل محروم ہو گئے تھے کیونکہ نماز پہلے ہی نکل گئی تھی اور قربانی کو بیت المقدس سے متعلق کر دیا۔

اس مشکل سے بچنے کے لیے نصاریٰ نے یہ حیلہ تراشا کہ ہم اس مادی ہیکل کی طرف نہیں متوجہ ہوتے بلکہ سماوی ہیکل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی زبانی باتیں ہیں کیونکہ ان کو خوب معلوم ہے کہ ان کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے کہ خداوند کی رحمت ان کو اسی ارضی ہیکل سے ملے گی۔ اور اسی سے خداوند ان کی دعائیں اور فریادیں سنے گا دیکھو سلاطین اول (۸ : ۱۲ - ۵۳)

گیارہویں دلیل

یہود کو خانہ کعبہ کی طرف قربانی کا حکم دیا گیا

۱۵۔ توریت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ اپنی بڑی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ کی سمت کو قرار دیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قربانی کے لیے ضروری تھا کہ وہ معبد میں خداوند کے حضور پیش کی جائے۔ اور فصل ثانی حرف ی میں ہم بتا چکے ہیں کہ جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس الاقداس تھا۔ اس کا رخ جنوب کی سمت ہونا ضروری تھا۔ علیٰ ہذا۔ سالانہ قربانی جو ان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہوتا۔ یہود یا تو اس معاملہ کے اصلی راز سے بیخبر تھے جیسا کہ فصل ثانی حرف ی میں ہم اسکی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یا انھوں نے بالقصد اس معاملہ کو کریدنا نہیں چاہا۔ اور اپنی عادت کے مطابق چاہا کہ اس پہ پردہ پڑا رہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

حالانکہ یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان کے خیمہ عبادت کا رخ ابتدا سے جانب شمال تھا۔ دیکھو (سفر خروج ۲۸، ۹) نیز اسی کے باب ۴۰ آیت ۲۲ - ۲۵ میں ہے۔

" اور میز کو اس پردہ کے باہر مسکن کی شمالی سمت میں خیمہ اجتماع کے اندر رکھا۔" اور اس پر خداوند کے

روبرو روشنی پہنچا کرے جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمۂ اجتماع کے اندر ہی میز کے سامنے مسکن کی جنوبی سمت

میں شمعدان کو رکھا اور چراغ خداوند کے روبرو روشن کر دیئے جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا۔"

ہمارے نزدیک اس تمام ترتیب کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی قربان گاہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازہ کی طرف تھا۔ اس لئے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمال جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکن ربانی کی طرف ہو سکے جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ وہاں خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی بھی عزت حاصل ہے اور جس کے پاس ہی مسکن اسمٰعیل بھی ہے۔

بارھویں دلیل

مسکن اسمٰعیلؑ تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ تھا

۱۶۔ ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیم کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تشریح یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسکن کو قرار دیا۔ چنانچہ توریت سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵: ۱۸ میں ہے۔

"اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستہ پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے۔"

اور پیدائش ۱۶: ۱۲ میں ہے

" وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور

وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد ماسوا بنی اسمٰعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی پس حضرت اسمٰعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلہ کی سمت میں تھی۔ اور اس کو مان لینا بہت اقرب ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہوئے۔ قرآن مجید نے بھی اس معاملہ کی طرف بعض مخفی اشارات کئے ہیں

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ	اور جبکہ جانچا ابراہیم کو اس کے خداوند نے چند باتوں میں
قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ	(ان باتوں میں سب سے اہم بیٹے کی قربانی کا حکم تھا) پس
ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ	ابراہیم نے وہ پوری کر دکھائیں۔ فرمایا میں تمکو لوگوں کا
وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ	امام بناؤں گا پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا
وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ	عہد ظالموں سے متعلق نہیں۔ اور جبکہ ہم نے بنایا بیت اللہ
مُصَلًّى	کو لوگوں کا مرکز (یعنی مرجع جسکی طرف رخ کر سکیں) اور امن
....	کی جگہ اور حکم دیا کہ بناؤ ابراہیم کے ٹھہرنے کی جگہ کو نماز کی جگہ

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیم کی قربانیوں کا قبلہ قرار دینے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیم السلام کی عظیم الشان قربان گاہ وہیں تھی۔

تیرہویں دلیل

خانہ کعبہ ہی حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر اول کی قربان گاہ ہے

۱۷۔ تھوڑی دیر کے لئے ان تمام دلائل و وجوہ کو نظر انداز کر کے اگر ہم بیت اللہ کے محل و مقام اور حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی اس بیزاری و دوری کے معاملہ پر غور کرو جو مشرکین کے تمام حالات و اطوار سے ان کو تھی۔ اور جو ان کی پاک زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں اور ابھری ہوئی خصوصیت ہے تو تم پر یہ حقیقت بالکل روشن ہو جائے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر خانۂ کعبہ ہو سکتا ہے۔ اسی کو انھوں نے بنایا، اسی کو قبلہ قرار دیا، اسی کے پاس ان کی وہ مقدس قربان گاہ ہے جہاں انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی اور پھر اسی گھر کے جوار میں ان کو آباد کیا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بت پرستوں کی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے متعلق ضمیمہ بائبل کی مندرجہ ذیل عبارت کو پڑھ لو جو اس کے صفحہ ۱۶۴ و ۱۶۵ میں درج ہے۔

"یہ پہاڑیاں یا تو بلند ٹیلے تھے یا اونچی چوٹیاں۔ ان کو نذر پیش کرنے اور عبادت کے لئے اس غلط مقصد سے خاص کیا گیا تھا کہ یہ آسمان سے قریب ہیں، پس بخور سلگانے اور عبادت کے لئے بمقابلہ عام میدانوں اور وادیوں کے زیادہ مناسب ہیں۔ باوجودیکہ موسیٰ کے صحیفوں میں عبادت کے قصد سے پہاڑیوں اور ٹیلوں پر جانے کی ممانعت تصریح کے ساتھ وارد تھی لیکن حضرت سلیمان اور ان کے بعد کے زمانہ میں یہود میں، پہاڑیوں اور ٹیلوں پر عبادت کرنے کا عام رواج تھا اور یہ طریقہ صرف یوشیہ کے زمانہ میں پوری طرح مٹ سکا۔ اس زمانہ میں لوگوں نے اس طرح کے تمام ٹیلے گروا دیئے کیونکہ یہ یہوواہ کے عبادت خانے سے زیادہ بعل کے معبد سے اشبہ تھے۔ اور اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو جو تعلیم دی تھی اس کے منشا کے بالکل خلاف تھے"

اب اس روشنی میں بیت المقدس کی حالت پر غور کرو۔ اس کی تعمیر ایک بلند پہاڑی پر ہوئی اور زینت و آرائش اور ظاہری چمک دمک کے وہ تمام لوازم پورے اسراف کے ساتھ اس کیلئے فراہم کئے گئے تھے جو بت پرست قوموں میں مقبول تھے، خروج اور احبار میں تمام تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے نقرئی و طلائی اسباب و سامان، بیش قیمت ظروف، حریر کے پردے۔ کاہنوں کی زرکش عبائیں،

قیمتی پتھروں کی جگمگاہٹ، کروبیوں کی تصویریں، یہ سب چیزیں ابراہیمؑ کی بدویانہ اور فطری سادگی سے زیادہ بت پرست اقوام کے مذاق سے اشبہ تھیں۔ پھر قربانیوں کا جلانا اور ان کی خوشبو کو خداوند کی ناک تک پہنچانا یہ معاملہ تو اس دینِ قیم کی سادگی سے انتہائی حد تک بیگانہ تھا جس کو حضرت ابراہیمؑ لائے۔

ہاں ایک دوسرا گھر ہے، اس کو دیکھو تو اس کے ہر گوشے اور ہر کونے میں ابراہیمی سادگی کا جمالِ فطرت ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ وہ کون؟ بطحائے مکہ کا بیت اللہ الحرام۔ وہ بت پرستوں، آفتاب پرستوں اور ستارہ پرستوں کے معابد کے بالکل برعکس، نشیب زمین میں تعمیر ہوا اور گویا اپنی ہیئت ہی سے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ خدا کی قربت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان بلندیوں پر چڑھ جائے۔ بلکہ اس کی قربت زیادہ سے زیادہ جھک جانے اور پست ہو جانے میں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے مسکن و معبد کی جو خصوصیت بیان کی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ خود ان کی اس خصوصیت کو سمجھا جائے کہ ان کی زندگی کا ہر قول و فعل شرک سے بیزاری کا اعلان تھا اور تمام معاملات میں اہل شرک کے طریق و رسوم سے خلاف ان کا اسوہ رہا۔ اور یہ حقیقت ان کی مشہور دعا میں بھی جھلک رہی ہے۔ ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوة فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون۰

ان دلائل کے علاوہ ایک اہم امر بھی قابلِ غور ہے کہ یہ امر متفق علیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربان گاہ "بیت ایلؑ" (خداوند کے گھر) کے سامنے تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسا بیت اللہ اس قربان گاہ کے سامنے تھا۔ کیا یہی جس کو حضرت سلیمانؑ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صدیوں بعد تعمیر کیا؟ یا وہ بیت عتیق جس کے متعلق نہایت قدیم زمانے سے یہ بات معلوم و مشہور ہے کہ تمام سرزمین عرب کا محترم مرکز تھا۔ اور حضرت اسمٰعیل کی ذریت اس کو ہمیشہ اپنا قبلہ سمجھتی رہی!

ان چند اہم باتوں پر ہم یہاں اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ توریت میں اور بھی بہت سی دلیلیں موجود ہیں لیکن زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ خود ان برکتوں سے ایک بہت بڑی دلیل لائی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو بخشیں کیونکہ یہ قطعی ہے کہ یہ برکتیں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ذریت میں نمایاں نہیں ہوئیں۔ اگر نمایاں ہوتیں تو یقیناً وہ اپنے دشمنوں سے مغلوب نہ ہوتے اور زنجیروں میں بندھے ہوئے اپنے گھروں اور شہروں سے بار بار محروم نہ ہوتے۔ حالانکہ یہ سب کچھ ہوا۔ بہرحال چونکہ یہ سب معلوم و مشہور باتیں ہیں اس لئے میں نے زیادہ پھیلانا ضروری نہیں سمجھا صرف تیرہ دلیلوں کے بیان پر قناعت کی اور یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام قربان ہوئے تو ان کی عمر بھی تیرہ سال کی تھی۔

تفسیر سورہ فیل

(اردو)

مذاکرہ

"بلاغ الحق"

(۳)

از جناب مولوی حافظ سید محمد ظہور اشرف صاحب امتوی

قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک اس ذیل میں متبعین حدیث پر بہت سے الزامات قائم کئے گئے ہیں کہ محض اتباع حدیث کی وجہ سے تم بہتیری آیات کے نافرمان ہو، اور بہتیری آیات کا خون تمہاری گردن پر ہے۔ اگر میں بہت اختصار کے ساتھ بھی ہر الزام کے متعلق کچھ لکھوں، تو یہ مضمون حد سے زیادہ طویل ہو جائے گا۔ لہذا چند موٹے موٹے اور اہم الزامات، رجم، وصیت، حرمت، ذہب و حریر پر سرسری اکتفا کرتا ہوں۔

رجم جناب مصنف فرماتے ہیں:-

"خدا نے فرمایا "الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائة جلدة" زانیہ اور زانی کو سو سو درے مارو، خدا نے نہ محصن محصنہ کو مستثنیٰ کیا نہ ان کے لئے کوئی خاص حکم الگ سے دیا، نہ کہیں سنگسار کا حکم دیا۔ سنگسار کا کوئی حکم کسی جرم کے لئے قرآن مجید میں نہیں ہے، تم نے ظنیات سے قرآن کی اصلاح کی اور اس کے کھوٹ کو دور کر کے سنگسار کے حکم کا اختراع کیا، اور افسوس یہ کہ رسول کی طرف منسوب کر کے۔"

شاید جناب مصنف کو معلوم نہیں کہ حکم رجم ظنیات سے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ کثرت روایات و اسناد سے یہ حکم حد تواتر کو پہنچ چکا ہے۔ اور یقین و طمانیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رجم کا

حکم دیا اور عہد صحابہ سے لیکر اس وقت تک اس پر اجماع رہا، جس سے اختلاف قرآن سے اختلاف ہے، لہٰذا یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا کہ رسول کی طرف اس حکم کی نسبت غلط کی گئی، یا صحیح، بلکہ سوال اگر پیدا ہو سکتا ہے تو یہ کہ رسول نے "فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ" کو غیر محصن اور غیر محصنہ کے لئے کس طرح خاص کر دیا، اور محصن و محصنہ کے لئے حکم رجم معاذ اللہ کہاں سے اختراع کیا؟ اس سوال کے جواب کیلئے آپکے مقرر کردہ معیار عقل و قرآن، دونوں ترازو اور دونوں کسوٹیوں کو کام میں لانا ہوگا۔

یہ بات تو عقلاً ظاہر ہے کہ محصن اور محصنہ، اور غیر محصن و غیر محصنہ کے جرم کی نوعیت یکساں اور برابر نہیں۔ اس لئے کہ ایک شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کرے تو یہ اس کی محض ہوس پرستی ہے۔ وہ بندۂ نفس اور شیطان ہے، اسے اپنی آتش شہوت بجھانے کا موقع مل چکا۔ لذات جنسی کی فانی اور ناپائدار حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہو چکی۔ اس کے بعد یہ حرکت شنیعہ ایسی ہی ہے جیسے کوئی سیری اور آسودگی کے حال میں سور یا حرام کھائے لیکن غیر محصن اور غیر محصنہ کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کی لذات جنسی کو معلوم کریں۔ ان کی آتش شہوت کا التہاب انہیں مجبور کرتا ہے کہ یہ آگ پاک یا ناپاک، جائز یا ناجائز، غرض جس طریقہ پر ممکن ہو، جلد بجھائی جائے۔ ایسی صورت میں ان کی یہ حرکت زیادہ تر اضطراری ہے اور ظاہر ہے کہ اضطراراً حرام یا سور کھانے والا، اور سیری اور آسودگی کی حالت میں بے ضرورت حرام کھانے والا، دونوں کسی طرح مساوی نہیں ہو سکتے، اس لئے یہ ہرگز قرین انصاف نہیں ہو سکتا کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزائیں ایک ہوں، کہ ایک کا جرم مجرد نفس پرستی ہے اور بالکل اختیاری اور دوسرے کا بیشتر اضطراری اور بے اختیاری۔ چنانچہ قرآن نے بھی محرمات کے ذکر میں اضطراری حالت سے درگزر کیا ہے، "وقد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ" لیکن چونکہ حرام چیزوں کے استعمال کی برائیاں، استعمال کرنے والے کی ذات تک محدود رہتی ہیں۔ نیز ان کا استعمال اس وقت معاف ہے، جب دوسری حلال و طیب چیز نہ مل سکے اور زنا کی برائیاں زانی کی ذات سے متجاوز ہو کر اخلاقی

سوسائٹی اور معاشرت وغیرہ پر نہایت برا اثر ڈالتی ہیں۔ نیز وہ جس چیز کو حرام طریقہ پر استعمال کر رہا ہے، اس کو بطریق حلال استعمال کرنے پر بھی قادر ہے، لہٰذا زانی غیر محصن و زانیہ غیر محصنہ کے لئے بھی سزا مقرر کر دینا ضروری ہوا۔

اب ذرا ڈوب کر قرآن کا بھی مطالعہ کیجئے۔ سب سے پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ" میں الف لام کیا ہے۔ جنسی تو ہو نہیں سکتا کہ اس کی لغویت ظاہر ہے، اگر استغراقی مانا جائے، کہ بلا استثنا ہر زانی و زانیہ کے لئے یہی حکم ہے، تو اس میں زانی نابالغ، اور مجنون و لایعقل سب داخل ہو جائیں گے، حالانکہ یہ غیر مکلف اور مرفوع القلم ہیں، پس الف لام استغراقی بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب الف لام استغراقی نہیں ہے تو آپ کا مدعا بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اب رہا الف لام عہد تو میرے خیال میں یہ الف لام عہد ہی کا ہے اور اس سے مراد صرف زانی غیر محصن اور زانیہ غیر محصنہ ہیں جیسا رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سمجھا اور سمجھایا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ" مذکور ہے، اس کے بعد ہی ایک آیت ایسی ہے جس سے میرے پیش کردہ خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔ آیت یہ ہے "الزانی لاینکح الا زانیۃ او مشرکۃ و الزانیۃ لاینکحہا الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المومنین"۔ "لاینکح" کے لفظ سے یہ مضمون مترشح ہو رہا ہے کہ یہاں جس زانی و زانیہ کی سزا کا ذکر ہوا وہ غیر محصن اور غیر محصنہ ہیں کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بلا تفریق محصن و محصنہ، اور غیر محصن و غیر محصنہ ہر زانی کے لئے یہی حکم ہے، تو دشواری یہ پیش آتی ہے، کہ زانی محصن و زانیہ محصنہ کی بعض حالتیں ایسی ہیں جس میں نکاح کرنے نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً جبکہ زانی محصن کی چار بیویاں موجود ہوں یا زانیہ محصنہ کا شوہر موجود ہو ان صورتوں میں "الزانی لاینکح الا زانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لاینکحہا الا زان او مشرک" قطعاً بے معنی اور لغو ہوا جاتا ہے۔ لہٰذا اصول نحو، نظم کلام، دلالت نص کی روشنی میں فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ کے حکم کی تخصیص زانی غیر

و زانیہ غیر محصنہ کے لئے صاف صاف ثابت ہے۔

اب رہا یہ امر کہ زانی محصن اور زانیہ محصنہ کے لئے رجم کا حکم کہاں سے اختراع کیا گیا۔ تو یہ کوئی ایسی اہم اور پیچیدہ بات نہیں۔ جب کثرت روایات واسناد سے یہ بات پایۂ تواتر کو پہنچ چکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم دیا تو یقیناً اپنے دل سے نہیں دیا، بلکہ کسی دلیل محکم ہی سے آپ نے یہ اجتہاد فرمایا۔ احادیث صحیحہ سے اس کی دو وجہ معلوم ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ یہ حکم آیت منسوخ التلاوت "الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما نکالا من الله"[1] سے دیا گیا۔ دوسری وجہ یہ کہ یہود کے قضیہ زنا میں تورات کے بموجب آپ نے رجم کا حکم دیا، اور پھر اسی حکم کو ہم لوگوں کے حق میں بھی جاری رکھا، جس طرح مرتد کی سزا قتل بحوالۂ توراۃ ہم لوگوں میں قائم ہے۔ پہلی وجہ کو تسلیم کرنے میں چونکہ راویوں اور روایت پر ایمان لانے کی ضرورت ہے جو آپکے نزدیک حرام قطعی ہے، لیکن دوسری وجہ میں آپ کو کیا عذر ہو سکتا ہے کہ قرآن کو اور رسول کو کتب سابقہ کا مصدق کہا گیا ہے۔ کتب سابقہ کے بیشمار اوامر و نواہی کی قرآن نے اور رسول نے تصدیق کی۔ اسی طرح ایک حکم رجم کی بھی تصدیق کر دی تو کیا گناہ ہوا؟ ہاں اس کی تحقیق کر لیجئے کہ توراۃ میں حکم رجم، نزول قرآن کے زمانے میں یا اسوقت بھی موجود ہے یا نہیں۔ قرآن کریم کی آیت "وکیف

---

[1] (الاصلاح) حکم رجم کے ماخذ کے لئے اس منسوخ التلاوت آیت کے ممنون احسان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ آگے چلکر فاضل مضمون نگار نے مائدہ والی آیت سے جو استشہاد کیا ہے وہ اس باب میں ایک اصل عظیم ہے اور معاملہ کی تمام مشکلات کو حل کرنے کے لئے کافی ۔ اس آیت کے بعض مسائل و احکام متعلقہ کی طرف فاضل مضمون نگار نے اشارے کئے ہیں جن سے واضح ہے کہ حکم رجم کا اصل مصدر بھی یہی آیت کریمہ ہے۔ لیکن اگر آیت کے الفاظ پر زیادہ تحقیق کے ساتھ غور کیا جائے تو اس میں اس سے کہیں زیادہ یقین و طمانیت کی روشنی موجود ہے۔ علاوہ ازیں صحاح کی بعض روایا ت سے تصریح کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ حکم رجم کا ماخذ سورہ مائدہ کو سمجھتے تھے۔ والقصہ بطولہا۔

یحکمونک وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ ثم یتولون من بعد ذلک" سے احادیث صحیحہ کی روشنی میں قدرت کے اسی حکم رجم کیطرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

اس باب میں قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ بھی لائق غور ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ	یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو لڑتے ہیں خدا اور رسول
وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ	سے اور زمین میں فساد پھیلانے کو دوڑتے پھرتے ہیں۔
فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ	کہ وہ قتل کردیئے جائیں یا ان کو پھانسی دیدی جائے
اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ	یا ان کے ہاتھ پیر مخالف جانب سے کاٹ
اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ	دیئے جائیں۔ یا دور کردیئے جائیں اس
خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ	جگہ سے۔ یہ ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور
عَذَابٌ عَظِیْمٌ (مائدہ ع ۵)	آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اللہ اور رسول سے جنگ کرنے والوں کے لئے چار طرح کی سزائیں تجویز ہوئیں، قتل، پھانسی، جلاوطنی، اور مخالف جانب سے ہاتھ پیر کاٹ لینا، اور اس امر میں تو اختلاف کی مطلق گنجائش نہیں، کہ حدود الٰہی کو توڑنا بھی اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کرنی ہے۔ مثلاً سود خواروں کو حکم دیا گیا کہ اب سود کھانا چھوڑدو ورنہ" فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، اور زنا تو صرف حدود خداوندی کو توڑنا ہی نہیں، بلکہ ایک طرح کا فساد پھیلانا بھی ہے۔ اس لئے ممکن ہے، سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی محصن و زانیہ محصنہ کے لئے اسی آیت سے حکم رجم دیا ہو، کیونکہ قتل، پھانسی، رجم سب کا منشا ایک ہے۔ رجم سے فقط سزا کو ذرا بھیانک اور عبرتناک بنادینا مقصود ہے۔

اس خیال کی صحت پر قرینہ یہ ہے کہ آپ نے زانی غیر محصن کے لئے سو دروں کے علاوہ تغریباً ایک سال کی جلاوطنی کا بھی حکم دیا۔ اور اس آیت کریمہ میں" اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ" جلاوطنی کی سزا موجود ہے، چور کے لئے حکم تھا" السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما" لیکن دوبارہ چوری

چوری کرنے والے کے لئے آپ نے "تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف" کا حکم بعینہ جاری فرما دیا، جس کے معنی صاف یہ ہوتے ہیں، کہ اس آیت میں قتل و خونریزی، چوری و رہزنی، اور زنا سب کی سزا اجمالاً ذکر ہوئی ہے، رسول نے تعلیم ربانی، شرح صدر، اور اپنے مافوق البشری فہم و ادراک اور عقل و سمجھ سے اس کی تشریح یوں کی، کہ چوری کرنے والے کو پہلی دفعہ "فاقطعوا ایدیھما" کی رو سے صرف ہاتھ کاٹنے کی سزا، لیکن دوسری دفعہ چوری کرنے والے کے لئے "تقطع ایدیھم وارجلھم" کی رو سے مخالف جانب سے پیر کاٹ لینے کا حکم دیا، زانی غیر محصن کے لئے "فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ" کی رو سے سو درے اور اس آیت کی رو سے تعزیب عام ایک سال کی جلاوطنی، لیکن زانی محصن و زانیہ محصنہ کا جرم چونکہ زانی غیر محصن اور زانیہ غیر محصنہ کے اعتبار سے اہم و سنگین ہے، اس لئے ان پر آپنے "یقتلوا او یصلبوا" کے حکم کی عبرتناک طریقہ پر تعمیل کر دی، یعنی رجم کا حکم دیدیا۔

وصیت | جناب مصنف نے نہایت زور و شور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے، کہ "اللہ تعالیٰ نے وصیت ہی فرض فرمائی ہے، اور ترکہ کی آیتوں میں بھی وصیت ہی کی تائید ہے، کیونکہ مالک مال اپنے مال کا مالک ہے، اور وارث کی ضرورتوں سے واقف تر، لہٰذا وہ حسب ضرورت وصیت کر جائے" آپ کے استدلال کا تمام تر زور وصیت کی آیت پر ہے، اس لئے آیت وصیت پر ایک نگاہ غائر ضروری ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ	فرض کر دیا گیا ہے تم پر، جب تم میں سے کسی کی موت
الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ	آنے لگے بشرطیکہ کچھ مال چھوڑے، وصیت کرنا
لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے، انصاف کے ساتھ
حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ فَمَنْ بَدَّلَهٗ	یہ لازم ہے متقین پر، پھر جو کوئی سننے کے بعد وصیت
بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ	کو بدل ڈالے، تو اسکا گناہ انھیں پر ہے جنہوں
يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	نے بدل ڈالا بیشک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا	پھر جو کوئی وصیت کرنیوالے سے طرفداری یا گناہ
فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ	کا خوف کرے اور باہم صلح کرا دے تو اس پر کچھ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ ع ۲۲)	گناہ نہیں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس سے چند باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوئیں (۱) والدین اور اقربا کیلئے مرنے والے پر وصیت فرض ہے۔ (۲) وصیت میں بالمعروف کی قید ہے، یعنی عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہئے۔ (۳) وصیت میں تبدیلی کرنیوالا آثم ہے یعنی وصیت کی تعمیل ضروری ہے۔ لیکن اگر موصی کسی وارث کی بیجا حمایت و پاسداری کرے یا بے سبب کسی وارث کو محروم کردے جسے اثم کہا گیا ہے تو موصی اور ورثا کے درمیان صلح کی رُو سے وصیت میں ترمیم و تبدیلی ہو سکتی ہے۔

جب والدین اور اقربا کیلئے وصیت کی فرضیت بالمعروف کی قید کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ نے آیت وصیت میں سب کے حصے مقرر فرما دیئے تو گویا اس اجمال کی تفصیل ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا مطلب بالمعروف سے کیا تھا۔ اب اگر مورث نے والدین اور اقربا کیلئے وصیت، خدا کی وصیت کے مطابق کی تو مطلقاً اس کی حاجت ہی نہ تھی بغیر وصیت موصی بھی ہر ایک وارث کو اس کا مقررہ حصہ مل جاتا، اور اگر یہ وصیت خدا کی وصیت اور اس کے بتائے ہوئے اصول کے خلاف کی گئی تو وہ یا تو جنف ہو گی، یعنی کسی وارث کی بیجا حمایت و پاسداری، یا اثم، یعنی بے سبب کسی وارث کے محروم کردینے کیلئے، اور دونوں صورتوں میں اس کی تعمیل ضروری نہیں، اور ایسی وصیت کیلئے نص صریح سے تبدیلی و تغیر کی رخصت، اس لئے اب وصیت کو خداوند تعالیٰ کی وصیت کے بعد بھی فرض کہنا کلام الٰہی میں نعوذ باللہ ایک طرح کی لغویت پیدا کرنا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر ایسی چیز فرض کی جس کی مطلقاً حاجت ہی نہ تھی۔ یا ایسے کام کا حکم دیا جسے خود جنف اور اثم بھی کہا ہے۔ اور بالکل بے نتیجہ کہ اس کی تعمیل کو بھی غیر ضروری قرار دیدیا۔

اب دوسرا امر غور طلب یہ ہے کہ کیا حکم وصیت سے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ "مالک مال اپنے مال کا مالک ہے، اور وارث کی ضرورتوں سے واقف تر، اس لئے وہ حسب ضرورت وصیت کر جائے" اگر یہ صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربا کے لئے حصے ہی کیوں مقرر فرمائے، اور "فریضۃ من اللہ"

گنگر تاکید کیوں کی؟ آپ فرماتے ہیں کہ "وصیت سے مال بچ رہا، یا مورث وصیت نہ کر سکا، تو اللہ تعالیٰ کی وصیت
پر عمل کیا جائے گا"۔ لیکن اگر کسی موصی نے اپنا تمام وکمال مال ایک ہی وارث کو دیدیا، تو اس صورت میں وصیت الٰہی
بالکل لغو ہو جائے گی یا نہیں، اور دیگر ورثا کو "نصیبا مفروضا" نہ ملنے کی وجہ سے "فریضۃ من اللہ"
کی نافرمانی ہوگی یا نہیں؟ اور پھر وہ کیوں جاتے ہیں، خود آیت وصیت بھی اس خیال سے ابا کر رہی ہے
جس پر آپ کا دارومدار ہے کہ "فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینہم" یعنی موصی سے
بھی وصیت میں لغزش اور گناہ ہو سکتا ہے، اگر واقعی مالک مال اپنے مال کا مالک ہے، اور وصیت
میں مختار کامل، جس طرح چاہے وصیت کرے تو "فمن خاف من موص جنفا او اثما" کے کیا معنی ہونگے؟
اور باوجودیکہ تعمیل وصیت ضروری ہے، اور اس میں تغیر وتبدل اثم، لیکن اس طرح کی وصیت کی تعمیل
کو کیوں غیر ضروری قرار دیدیا گیا۔ لہذا مالک مال اپنے مال کا مالک نہیں، بلکہ جو خدا تمام جہاں کا مالک ہے
وہی مالک مال کے مال کا بھی مالک ہے۔ اور جو خدا علیم وخبیر ہے جس سے دنیا کے ذرہ ذرہ کا حال مخفی نہیں
وہی موصی کے ورثا کی ضرورت سے بھی واقف تر ہے، اور خدا کے مقابلہ میں موصی کو واقف تر کہنا کفر خریدنا
چنانچہ آیت میراث میں صاف صاف کہدیا گیا کہ "اٰباءکم وابناءکم لا تدرون ایہم اقرب لکم نفعا
فریضۃ من اللہ" تمہیں کچھ خبر نہیں کہ تمہارے آباء وابناء میں کون تمہارے لئے زیادہ سودمند ہیں، اسلئے
تم آنکھ بند کر کے اس فریضہ الٰہی کی تعمیل کرو، اور دل میں یہ خیال تک نہ لاؤ، کہ ہمیں فلاں وارث سے زیادہ
نفع پہنچتا ہے، اس لئے ہم اپنے مال سے اس کو کچھ زیادہ دیتے"۔

(باقی)

مقالات

سیرت شبلی

(۸)

از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم، اے ایل ایل بی

ایک عزیز کو بھی ساتھ لیجانا چاہتے تھے جن کو لکھتے ہیں:-

"میں انشاء اللہ مئی ۱۸۹۲ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا۔ اور غالباً چھ مہینے قیام کروں گا
چاہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو۔ صرف زاد سے تم کو کچھ تعلق نہیں، تم کو بلا تنخواہ چھ مہینے کی رخصت بھی مل سکتی ہے
اس تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے جواب لکھو۔ میرا سفر ہر طرح قطعی ہو چکا ہے"

مگر باایں ہمہ قطعیت اس سال خدا کو منظور نہ تھا۔ مختلف وجوہ سے سفر ملتوی رہا۔ البتہ اگلے سال قدرت نے خود سامان پیدا کر دیا۔ مسٹر آرنلڈ ولایت جانے والے تھے اور کل تین چار دن باقی رہ گئے تھے کہ مولانا کو اس کی خبر ہوئی۔ دفعۃً عزم دیرینہ کو تحریک ہوئی اور مسٹر آرنلڈ کی رفاقت میں خاک ہند کو کچھ دنوں کے لئے خدا حافظ کہنے پر آمادہ ہو گئے۔ آرنلڈ صاحب سے اس خیال کا اظہار کیا تو انھوں نے بھی تائید کی۔ اور ضروریات سفر میں امداد کا وعدہ کیا۔ احباب اور اعزہ کو اس فوری عزم کی اطلاع ہوئی تو سخت متعجب اور بعض معترض بھی ہوئے کہ اس بے سروسامانی میں اور عجلت میں اتنا لمبا سفر خلاف مصلحت ہے۔ مگر مولانا کا جواب فقرہ تھا۔

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً ۳ ماہ کی ہوا کرتی تھی۔ ۳ مہینے کی اور رخصت کا حق تھا اس طرح کل چھ مہینے کی رخصت لی اور ۲۶ / اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے روانہ ہو گئے۔

وقت کم تھا اس لئے اہل و عیال، اعزا اور اقربائے وطن سے مل بھی نہ سکے نہ طلب علم کے جنون شوق میں اس کی پرواہ کی۔ جو بمبئی میں آرنلڈ صاحب کا بھی ساتھ ہو گیا۔ پہلی مئی کو جہاز نے بمبئی سے لنگر اٹھایا تو عدن ٹھہر کا۔ وہاں یہ نظارہ دیکھا کہ مسلمان بچے جن کی زبان عربی ہے ایک ایک پیسہ کے لالچ میں سمندر کا غوطہ لگاتے ہیں اور مسافر جہاز پر سے یہ تماشا دیکھنے کے لئے پیسے پھینکتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس تماشا سے محظوظ ہوتا اور ان بچوں کی ہمت اور کمال غواصی کی داد دیتا۔ مگر مولانا کی مذہبی اور ملی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے لئے یہ سماں سخت روحانی اذیت کا باعث ہوا۔ عربی زبان کی بنا پر مولانا نے ان لوگوں کو نسلاً عرب سمجھا اور یہ دیکھ کر کہ اس غیور، شجاع اور بلند ہمت قوم کی اولاد آج اس قدر ذلیل ہو گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے گداگری کے لئے یہ کرتب دکھاتے ہیں۔ مولانا کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ قم یا عسر

چنانچہ اپنے منظوم سفرنامے میں فرماتے ہیں۔

می ندانم کز نژاد عرب و آل لوے ....

خیر بعد کو سیدھی جا کر جب تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ حقیقۃً نسل عرب نہیں ہیں، سمالی قوم کے ہیں تو کسی قدر تسکین ہوئی۔

پورٹ سعید سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ چھوٹا۔ اور تنہا سفر شروع ہوا۔ خوش قسمتی سے خدا نے ایک دوسرا رفیق مہیا کر دیا۔ شیخ علی ظبیان ایک شامی بزرگ بھی سفر کر رہے تھے اور اتفاق سے مولانا کے ابتدائی دور کی تصنیف اسکاۃ المعتدی ان کے مطالعہ میں تھی، جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ فاضل اجل جو اس کتاب کا مصنف ہے، خوش قسمتی سے ان کا ہمسفر ہے تو بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ مولانا کو ان کی بدولت اس سفر میں بہت سہولتیں ہوئیں۔

الغرض بیروت اور روڈس ہوتے ہوئے ۲۰ مئی کی صبح کو ازمیر پہنچے۔ یہاں دور وز تک جہاز رکا رہا۔ اس لئے سیر کا کافی موقع ملا۔ ۲۳ مئی کی صبح کو قسطنطنیہ پہنچے۔ اور تخمیناً ایک ہفتہ تک پہلے ایک سرا

میں رہے پھر باب عالی کے پاس ایک مکان لیا مگر مالک مکان بد معاملہ تھا اس لئے وہ مکان چھوڑ کر دوسرا مکان لیا جس میں آخر تک قیام کیا۔ اور اطمینان کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل شروع کر دی جس کے لئے زحمت سفر گوارا کی تھی۔

قسطنطنیہ کا ایک ایک کتبخانہ اور ہر کتبخانہ کی ایک ایک نایاب کتاب جو ان کے مقصد سے بواسطہ یا براہ راست متعلق تھی دیکھتے پھرتے۔ روزانہ تین چار میل کا چکر لگاتے اور ایک لمحہ بھی بیکار ضائع نہ ہونے دیتے یہاں تک کہ خط و کتابت کا بھی موقع مشکل سے ملتا۔ چنانچہ ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں۔

"اس وقت بلکہ زمانہ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتبخانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔"

علمی تحقیق کے علاوہ مولانا نے اس سفر میں ضمناً اور مسائل پر بھی توجہ کی۔ ترکوں کے اخلاق و عادات ان کی طرز معاشرت اور ان کے مذہبی اور قومی رسوم، ان کے مطابع و زوایا۔ اور جوامع تربیت و تعلیم، اور طریق درس پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ ڈالی۔ ایک چیز جو مخصوص طور پر انہیں پسند آئی وہ ترکی مدارس میں امراء و غرباء کی یکساں معاشرتی حالت تھی چنانچہ سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

"ہر کلاس میں مہذب لڑکوں کی معتدبہ تعداد ہے .... تا صفحہ ۹۵ سطر ۱

قسطنطنیہ کے قیام میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم و خود مختار ممالک کا تفاوت اور غلام و آزاد اقوام کی ذہنیت کا فرق تھا۔ وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے۔ اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے۔ ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اپنی زبوں حالی کا احساس اور قوی ہوگیا۔ تاہم جس اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر جو مسرت و نشاط حاصل ہوتا اور دل بیتاب سے جوش سرور کی جو موجیں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر چیز کو

بزم سلاطین کا دلفروز سامان اور عید کے موقع پر موکب سلطانی کا پرشکوہ منظر اس درجہ حیات آفریں تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بیخودی سی چھا جاتی۔ مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دلکش نظارے کی تصویر کی ہے۔ جس کا ہر لفظ صہبائے سرور کا ایک چھلکتا ہوا ساغر ہے۔ اپنی کیف وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

بگذر ازین حرف و مکرر مپرس　　　خواب خوشے دیدم و دیگر مپرس

تشنہ بود خسر ابم ہنوز　　　دیدن من باز و بخوابم ہنوز

مگر یہ کیفیت کیوں تھی۔ کیا محض اس لئے کہ دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ اس جاہ و حشم کے آئینہ میں ان کو اسلام کی حیات ملی کا تابناک چہرہ نظر آرہا تھا۔ عیدگاہ میں جہاں سلطان کی آمد کا سماں دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید　　　مہر جہانتاب خلافت دمید

قاعدۂ دولت و دیں را مدار　　　آئینۂ رحمت پروردگار

شاہ فلک کوکبہ عبدالحمید　　　اید اللہ بنصر مزید

قرۂ شاہی زجبین آشکار　　　حاشیہ بوسان بہ یمین و یسار

آگے چلکر دعائیہ اشعار میں ان کے جذبات اور نمایاں ہوجاتے ہیں۔

جز تو کہ ہست ای شہ انجم سپاہ　　　آنکہ بود شرع نبی را پناہ

تازگی بدر و حنین از تو ہست　　　زیب و طراز حرمین از تو ہست

چرخ بدان مایہ کہ گردندہ است　　　زندہ بجان کز تو جہاں زندہ است

یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی نہ ممدوح کو سنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا جو بے ساختہ زبان قلم سے تراوش کر گیا ہے۔

جس طرح مولانا کا سفر خالص علمی مقصد کے لئے تھا جس میں کسی طرح کی خود غرضی یا دنیا طلبی کا لوث نہ تھا، اسی طرح لطیفۂ غیبی نے ان کی وہ عزت افزائی کی جس کے حصول کی خواہش یا کوشش تو بڑی چیز ہے، وہم و گمان بھی مولانا یا کسی غریب الدیار کو نہیں ہو سکتا۔ اور جس کے عطا میں بجز اعتراف کمال کے معلی کی بھی، کوئی سیاسی مصلحت مضمر نہیں ہو سکتی۔ ایک شہرہ آفاق اسلامی جنرل کے شوق زیارت اور ان کے ذریعہ سے کتبخانوں اور مدارس کے مطالعہ میں حصول سہولت کے خیال سے مولانا نے غازی عثمان پاشا شیر پلونا سے ملاقات کی۔ پاشائے ممدوح نے پہلی ملاقات کے بعد دوبارہ ملنے کی خواہش کی۔ ایکی بار جب مولانا ملنے گئے، تو نہایت احترام سے استقبال کیا، بڑے تپاک سے ملے اور یہ خواہش کی کہ قسطنطنیہ سے واپسی کے قبل مولانا ان سے مل لیں۔ اسی اثنا میں حضرت سلطان المعظم سے انھوں نے مولانا کو تمغۂ مجیدی عطا کرنے کی تحریک کر رکھی تھی۔ جو منظور بھی ہو گئی۔ مگر مولانا کو اس کی خبر نہ تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اپنی قیام گاہ پر آرام فرما رہے تھے۔ کہ ان کے ایک دوست نے آکر جگایا اور یہ بشارت دی۔ یا شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان۔ مولانا کو اس پر تعجب ہوا۔ مگر قرآت خانے میں جا کر اخبارات دیکھے تو خبر کی تصدیق ہو گئی۔ دوسرے دن تمام احباب مبارکباد دینے آئے۔ احباب کے اصرار پر مولانا نے ایک مختصر سا جلسۂ دعوت ترتیب دیا۔ دعوت کی صبح کو مولانا غازی عثمان پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے عطائے تمغۂ مجیدی کی مبارکباد پیش کی۔ پاشائے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارک باد دی۔۔۔ تمغہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ بکس سے نکالکر پہلے آنکھوں سے لگایا۔ پھر مولانا کے حوالہ کیا۔ اور ایک فرمان سلطانی بھی اسی کے ساتھ عنایت کیا۔ رخصت کے وقت پاشائے ممدوح نے اپنی عکسی تصویر بھی مرحمت کی۔

قسطنطنیہ میں ۳ ماہ تک قیام کیا اور جب تمام کتبخانوں کی سیر کر لی تو چل کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ جشن جلوس کا بھی انتظار نہ کیا جو ہر سال صفر کی آٹھویں کو بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا اور جس کو صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔

قسطنطنیہ سے چلکر بیروت کی سیر کرتے ہوئے قدس پہنچے۔ وہاں کے علماء و فضلاء سے بحث و مذاکرہ کی علمی صحبتیں رہیں۔ قدس سے اسکندریہ ہوتے ہوئے قاہرہ آئے۔ یہاں ایک مہینہ تک قیام کیا۔ اور جدید و قدیم دونوں قسم کے طرزِ تعلیم کا مطالعہ کیا۔ مگر یہاں بھی ان کو وہی مصیبت نظر آئی جس کا ماتم ان کو ہندوستان میں تھا۔ یعنی جدید تعلیم یافتہ طبقہ مذہبی جوش اور قومی اخلاق سے معرا ہے۔ تو قدیم طبقہ زمانہ موجودہ کی ضروریات سے غافل اور اصلی مذہبی روح سے عاری۔ صرف ایک مدرسہ میں جو دار العلوم کہلاتا تھا جدید و قدیم کو شیر و شکر کرنے کی کوشش ہو رہی تھی مگر ابھی تک کامیاب نہ تھی۔ جامع ازہر کی شہرت اور مرکزی حیثیت کی بنا پر مولانا نے سب سے زیادہ توجہ اسی کے مشاہدہ پر صرف کی مگر جس نتیجہ پر پہنچے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مجکو اپنے تمام سفر میں جسقدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دار العلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں۔ جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو۔ جس کے طلبہ کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی لیکن افسوس کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے۔ اور کرتا جا رہا ہے۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔ میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز، چچا، ماموں وغیرہ خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چونکہ یہ طلبہ ازہر میں پڑھتے ہیں اس لئے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی۔ دناءت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ براس سیدنا الحسین۔ کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں ازہر ان سے بھی گیا گزرا ہے۔ اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے

یہاں مستقل اور عملی طور پر صرف فقہ و نحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لئے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں۔ منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی و بیان کی تعلیم ہے لیکن استعداد کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایان نہیں۔"

مصر کے کتب خانوں کو دیکھ کر البتہ مولانا کو بیحد مسرت ہوئی کتب خانہ خدیویہ کے نسبت فرماتے ہیں۔

"ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت، حسن انتظام اور خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے بہتر ہے۔"

مصر کے مشہور فاضل مفتی محمد عبدہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ ملاقات کی۔ انھوں نے بھی ازہر کی تعلیم پر اظہار افسوس کیا۔

مصر سے اس سفر کی منزل تمام ہو گئی اور عازم ہندوستان ہوئے۔ کالج میں پہنچے تو اس تقریب مبارک باد میں اسکول اسٹاف کی طرف سے دعوت ہوئی۔ مولوی بہادر علی مرحوم نے ایک مختصر تقریر میں مولانا کے مع الخیر مراجعت اور کامیاب سفر پر مبارکباد دی۔ اور قوم کو عموماً اور کالج کو خصوصاً اس سفر سے جن علمی فوائد کی توقع تھی اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو اس وقت بی، اے کے طالب علم تھے اور آج کشمیر کے گورنر ہیں ایک نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

باز وقت گرمی بزم سخن آید ہمی　　　بلبل گم گشتہ در صحن چمن آید ہمی

اس کے بعد ۶ دسمبر ۱۸۹۲ء میں کالج اسٹاف نے اس مسرت میں ایک شاندار ڈنر دیا جس میں مولانا نے یہ ترکیب بند پڑھا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد　　　کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید　　　یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد
دوستاں مژدہ کہ آن بلبل خوش لہجہ دگر　　　اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد
نقد کار آگہی و تجربت آورد کہ بعث　　　رفت بے مایہ و گنجینۂ صد راز آمد

گاہ با جمع نشینان ادب گشت قریں — گاہ با حاشیہ بوسان شہ انباز آمد

گاہ در بیت مقدس بہ برہمنی شد — از رخ شاہد فن پردہ بر انداز آمد

دیوان شبلی میں یہ پوری نظم چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے صرف انھیں اشعار پر اکتفا کیا گیا۔

شمس العلما کا خطاب | علامہ شبلی جیسے صاحب فضل و کمال کیلئے شمس العلما کا خطاب کوئی مخصوص قابل ذکر واقعہ نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں خطابات کی ارزانی اور ان کے حصول و عطا کے ذرائع و اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس تذکرے کا حذف کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا۔ مگر مولانا مرحوم کو جس طرح یہ خطاب بغیر کسی خواہش و کوشش، تملق و دربارداری کے ملا۔ اور جن قدرتی اسباب کے ماتحت غیر متوقع طور پر عطا ہوا یا سچ پوچھئے تو "آسمان سے برسا" وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ ان سے ایک طرف تو حکومت برطانیہ کی دور اندیشی، موقع شناسی اور سیاسی تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور دوسری جانب اس بات کا سبق ملتا ہے کہ اگر انسان میں صلاحیت اور دل و دماغ میں قدرتی توانائی ہو۔ اور خلوص للہیت عزم و استقامت کے ساتھ حق پر ثابت قدم رہ کر اپنا کام کرتا جائے تو ضمیر فروشی کے بغیر بھی ہر طرح کے اعزاز کو چھین سکتا ہے ؎

ساقی سبو بدوش ہو اے ذوق تشنہ کام — دست طلب میں جرأت رندانہ چاہیے

ورنہ گداگری و خوشامد سے تو بعض وقت (نعوذ باللہ) خدا بھی نہیں دیتا

آخر کلیم سننی پڑیں لن ترانیاں — اب بھی کہو گے عجز گدایانہ چاہیے"

علامہ شبلی مدت سے کالج میں پروفیسر تھے۔ علمی حیثیت سے ان کی قابلیت تسلیم کی جا چکی تھی مگر بایں ہمہ ان کے نامۂ اعمال میں ایک حرف بھی ایسا نہ تھا جو گورنمنٹ کے نقطۂ نظر سے حسنات میں شمار ہو سکے کالج کی ملازمت اور روشن خیالی دو گناہ ایسے بڑے تھے کہ عوام میں مولانا کو ایک مرشد یا پیشوائے مذہب کی حیثیت سے مقبولیت بھی حاصل نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ مولانا کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ صرف یہ تھا کہ

انھوں نے تاریخ اسلام کے متعلق یورپ کی فریب کاریوں کا راز افشا کر دیا تھا۔ کوئی مفید معاشرتی ناول تو لکھا نہیں تھا پھر ان کو خطاب دینے کی جانب گورنمنٹ کی توجہ کیونکر ہوتی اور کوئی دوسرا توجہ دلاتا تو کیوں اور کس بل پر لیکن تمغہ مجیدیہ کا حصول ایک ایسا واقعہ تھا کہ نہ چھپائے چھپ سکتا نہ معلوم ہو چکنے پر نظر انداز ہو سکتا تھا مولانا اواخر ۱۸۹۲ء میں سفر سے واپس آئے تو اس خیال سے کہ محض خدمات علمی کے اعتراف میں خلیفۃ المسلمین کا عطیہ ہے تمغہ مجیدی تبرکاً استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر مقامی گورنمنٹ کے مصالح یا ضوابط نے اجازت نہ دی۔ ان حالات میں سال بھر کے غور و خوض کے بعد گورنمنٹ کے ارباب حل و عقد نے علامہ مرحوم کو شمس العلماء کا خطاب و خلعت دینا ہی مناسب سمجھا۔

عطیہ شاہی اور وہ بھی بے طلب ملے تو کون ایسا ناشناس ہوگا کہ ناسپاسی کرے ؎

ہم ہوئے ۔ تم ہوئے کہ میر ہوئے ۔۔۔ انھیں زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک تو ہمارا کالج شروع ہی سے گورنمنٹ کے دامن دولت کا پروردہ دوسرے یہ خطاب کالج کے ایک پروفیسر کو پہلے پہل عطا ہوا تھا اور وہ بھی ایسے پروفیسر کو جس کی بے نظیر علمی قابلیت نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیائے اسلام میں ایک ناقابل انکار حقیقت بن چکی تھی۔ علاوہ بریں اس وقت تک یہ خطاب جن علما کو ملا تھا وہ بلا استثنا حقیقۃً بلحاظ فضل و کمال شمس العلما تھے۔ مثلاً مفتی میر عباس صاحب مولانا عبدالحق خیرآبادی مرحوم اور مولوی سید حامد حسین صاحب۔ اس لئے خطاب کی معنوی حیثیت برقرار تھی۔ اور گورنمنٹ نے یہ خطاب دیکر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو واقعۃً مسرور و ممنون کیا تھا۔ چنانچہ ۹ ار جنوری ۱۸۹۴ء کو کالج کی دو علمی مجلسوں یعنی انجمن اخوان الصفا اور لجنۃ الادب کی طرف سے مولانا کو مبارکباد دینے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اشخاص مثلاً سر سید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی۔ مولوی سید کرامت حسین جو اس وقت قانون کے پروفیسر مجلس اخوان الصفا کے رکن اور لجنۃ الادب کے صدر تھے۔ اور بعد کو جج ہائیکورٹ الہ باد ہوکر

وفات پائی۔ مسٹر بلنٹ پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ، ارکان اخوان الصفا، نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر وغیرہ شریک ہوئے۔ حاضرین نے بالاتفاق نواب محسن الملک مرحوم کو اس جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس جلسہ کی صدارت کے لئے اس سے بہتر انتخاب ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ دنیاوی وجاہت کے علاوہ نواب صاحب مرحوم علوم دینیہ کے متبحر عالم، وسیع النظر مصنف، نکتہ سنج ادیب اور جادو بیان خطیب تھے۔ مخالف سے مخالف احوال ان کی حق طلبی و حق پسندی میں سنگ راہ نہ ہو سکتا تھا۔ اور بڑی سے بڑی شخصیت ان کو حق گوئی سے روک نہ سکتی تھی، اور کمال یہ تھا کہ وہ حق کی تلخی کو بھی اپنے پیرایہ بیان کی حلاوت سے شیریں بنا سکتے تھے۔ اس جلسہ میں نواب صاحب نے بحیثیت صدر حسب ذیل افتتاحی تقریر فرمائی۔ تقریر کیا ہے گویا صداقت، خلوص، اور اعتراف کمال کا ایک دریا ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلکر موجیں مار رہا ہے اور دل ہی کے سمندر میں جا کر گر رہا ہے۔

"جناب سر سید و سید محمود صاحب و حاضرین۔ جو خوشی اس وقت اس جلسہ میں شریک ہونے اور اس صحبت کے دیکھنے سے ہوتی ہے۔ اس کا اظہار مشکل ہے۔ صاحبو آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا خود ایک ایسی دلخوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھکر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی پھر جبکہ وہ ایسے مقصود کے لئے ہو جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے اس پر مبارکباد دینے کے لئے تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ صاحبو! اس وقت میں جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں ایک طالبعلم جن کو مولانا مولوی شبلی صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، دوسرے وہ احباب جنکو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے۔ میں اگرچہ بظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں اور اس لئے میں اپنے آپ کو ایک طالبعلم سمجھ کر اپنے عزیز طالبعلموں کی طرح اس خوشی میں شریک ہوا ہوں۔ اے میرے عزیزو!

طالب علم کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ نوعمر لڑکا ونوجوان ہو۔ نہ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ بغل میں کتاب دبا کر مدرسہ میں پڑھنے کے لئے حاضر ہوتا ہو۔ بلکہ طالب العلم وہ ہے جو علم کا طالب ہو اور جسے علم کا شوق ہو۔ پس اے میرے عزیزو! میں کسی سے علم کی طلب اور علم کے حاصل کرنے کے شوق میں کم نہیں ہوں بلکہ جبقدر میری عمر زیادہ ہے اسی قدر تحصیل کے شوق میں تم سے بڑھکر ہوں اس لئے میں تمھارے فرقے میں داخل ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے اس دعوے کو تسلیم کروگے۔ اور اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار نہ کروگے۔ اے میرے عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمھارے ہی استاد نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف ونحو کے ان سے سیکھے ہیں یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف وتالیف اور تقریر وتحریر سے بڑے بڑے فائدے حاصل کئے ہیں۔ کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو اس لئے اے میرے عزیزو! نہ صرف بحیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالب العلم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں۔ اور میں مولانا شبلی کو اس معزز خطاب پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے مبارکباد دیتا ہوں۔ اے میرے عزیزو اے میرے دوستو: درحقیقت میں نے اس مبارکباد دینے میں ذرا جلدی کی۔ درحقیقت مجھے اول اپنی گورنمنٹ کو مبارکباد دینی چاہیے جس نے ایسے مستحق شخص کو خطاب دیکے درِ اصل اس خطاب کو عزت بخشی اور اپنے تمیز کی اس قوت کو ثابت کیا جو اس انتخاب میں اس نے ظاہر کی ہے۔ درحقیقت مولانا مولوی شبلی صاحب کو خطاب دینا وضع الشئ فی محلہ ہے اس لئے سب سے پہلے چاہئے کہ میں گورنمنٹ کو مبارکباد دوں۔ اس کے بعد قوم اس مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس میں ایسے لوگ موجود ہیں جو درحقیقت علم کے آفتاب ہیں اور جن کو شمس العلما کہنا ایک امر واقعی ہے۔ پھر مدرسۃ العلوم کو مبارکباد دینا چاہیے کہ اس میں ایسے کامل اور قابل استاد جمع ہیں کہ گورنمنٹ ایسے معزز خطاب کی مستحق سمجھتی ہے۔ اور جن کے

علم کی روشنی دور دور پھیل رہی ہے۔ پس فی نفسہ گورنمنٹ اور قوم اور کالج مبارکباد کے مستحق ہیں اور مولانا کو مبارکباد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہرداری کی تکمیل ہے۔ وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے۔ صاحبو! جس طرح آفتاب اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ اس کو کوئی آفتاب کہے بلکہ آفتاب کا اقرار کرنے والا خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خیرہ چشم نہیں ہے نہ اس کی آنکھ بند ہے بلکہ اس میں بینائی کی قوت اور دیکھنے کی طاقت بے کسی قسم کے خلل اور عارضہ کے موجود ہے۔ اسی طرح ہمارے مولانا مولوی شبلی صاحب کو خطاب دینے سے گورنمنٹ نے ثابت کر دیا کہ وہ علم و کمال کی قدر کرنے والی ہے اور اہل علم کی پہچاننے والی اور استحقاق پر لحاظ رکھنے والی ہے۔ صاحبو! مولانا مولوی شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے۔ جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی ہے وہ ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھرے ہیں اور جن کو ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور ان کا علم کتنا وسیع اور ان کے خیالات کیسے بلند اور ان کا ذہن کیسا تیز اور ان کی تحریریں کیسی پرزور۔ ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہے۔ وہ ہمارے زمانے کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان، اور سلاست عبارت اور تحریر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور بلا کسی شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع کے بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور وقائع کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔ اور واقعات تاریخی کی تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور تاریخ کے اسباب بیان کرنے اور اخبارات و روایات کے صدق و کذب کو دریافت کرنے کا راستہ بتایا۔ اور ایسے زمانہ میں جبکہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جبکہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے۔ ہمارے

مولانا ممدوح ان دو تین مصنفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا جس نے مشاہیر روزگار کے حالات زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصود بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈالدی۔ فللہ درہ و علی اللہ اجرہ

صاحبو! ہمارے دوست مولانا شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا۔ بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے۔ اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔ وہ ان چند اعتراضوں کا دور کرنا ہے جو مذہب اسلام کے عدو ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب انسانیت، انصاف اور علم و تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا۔ وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتبخانہ کا جلانا تھا۔ سو برس سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتبخانہ جلانے کا الزام لگا کر پیشوایان اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر رکھا تھا۔ اس ذی ہمت عالی دماغ محقق نے جو مدرسۃ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈالدیا اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا۔ اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی۔ حقیقت میں ہمارے مولانا نے یہ کام ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اسکی داد دیتا ہے۔ اور خدا اس پر آفریں کرتا ہے۔ میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتبخانہ پر لکھے ہیں ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدے کا انہوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی۔ تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت و لیاقت اور علم پیشہ اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لئے کافی اور ان کے شمس العلماء ہونے پر شاہد تھے۔

صاحبو! ہماری قوم میں ہزاروں عالم گزرے اور اب بھی خدا کی مہربانی سے سیکڑوں موجود ہیں مگر ہم تو

اس کے قائل ہیں جو کچھ کر دکھائے اور اپنے علم و فضل سے مسلمانوں یا اسلام کو فائدہ پہنچائے ۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اے میرے عزیزو! اور اے مدرسۃ الاصلاح کے طالبعلمو! تم نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد

تم کو ملے ہیں اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچی ہے۔ تم اس زمانے کو غنیمت سمجھو جبکہ تم کالج میں ہو

اور ایسے استادوں کی تعلیم و صحبت سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔ اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور

اپنے استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو۔ تمھارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود

ہے۔ تمھارے دلوں کو منور کرنے کے لئے ایک آفتاب روشن ہے۔ تم ایسا وقت ہاتھوں سے نہ دو

اور اپنے استاد کے خصائل اور صفات سیکھنے اور علم حاصل کرنے اور پھر اسے کام میں لانے کی

کوشش کرو۔ تاکہ ہم اپنی قوم میں صرف ایک آفتاب کو دیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سیکڑوں

چاند اور ستارے نظر پڑیں ۔ خدا کرے ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے اور اس کا

سایہ تم پر پڑے ۔　　　(باقی)

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں نئے طلباء کا داخلہ ۱۲ جولائی سنہ ۳۸ء سے ۱۳ جولائی سنہ ۳۸ء تک ہوگا۔ درخواست

داخلہ ۸ جولائی تک پرنسپل طبیہ کالج کے دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔ اور دفتر کی جانب سے مقرر کی ہوئی تاریخ

پر امیدوار کو کالج میں حاضر ہونا چاہیے۔ تعداد مقررہ کے پورا ہونے کے بعد کسی طالب علم کا داخلہ نہ کیا جائیگا۔

قواعد داخلہ مفت طلب کئے جا سکتے ہیں۔

عطاء اللہ بٹ، پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حکمتِ غرب
مارکس اریلیس کے خیالات

(۷)

از جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے

موت کو پیدائش سے نسبت ہے کیونکہ دونوں فطرت کے اسرار ہیں ایک تعمیر کا مظہر ہے دوسری تخریب کا۔ دونوں میں ابتدائی اور آخری عناصر ایک ہی ہیں۔ بہرصورت موت ہرگز باعث شرم نہیں کیونکہ اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو عقل اور ہمارے آئین زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو۔

مخصوص فطرت کے لوگ بہ تقاضائے فطرت وضرورت اپنی حرکت سے باز نہیں آتے۔ اس سچی بات کو یاد رکھو کہ جیسا عام قاعدہ ہے تھوڑے زمانہ میں تم اور وہ دونوں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ تھوڑے دنوں میں تمھارا نام بھی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اگر تم رائے کے عنصر کو خارج کر دو تو پھر تم کو کوئی شکایت ایذا و نقصان کی نہیں رہ جائے گی۔ اور اگر تم کو شکایت ہی نہ رہ جائے تو پھر نقصان کا کوئی سوال ہی نہیں۔

جو شے انسان کو اس کے درجہ سے فروتر نہیں بنا سکتی وہ اس کی زندگی کو بھی اندرونی یا بیرونی طور سے

ال یہ پستی یا برائی نہیں کر سکتی۔

یاد رکھ کہ انسان پر جو افتاد پڑتی ہے وہ جائز و مناسب ہوتی ہے۔ اس قول پر جانفشانی کے ساتھ عمل کر
س کی حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے گی اور تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ واقعات نہ صرف ایک لازمی سلسلہ
کے نتائج ہوتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد انصاف پر ہوتی ہے۔ گویا واقعات ایک ایسی ہستی کی مصلحتوں کے
ظاہر ہوتے ہیں جو ہم کو وہی انعام دیتی ہے جس کے ہم مستحق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ تیرا معمول ہو گیا ہے اب تک
عمل کر جو کچھ بھی تو کرے اس کو اسی نیکی کے ساتھ کر جس کو ہم اپنے تخیل شرافت کے مطابق ایک شریف انسان کا
جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور اپنے ہر عمل میں اس اصول پر سختی سے پابند رہ۔

اپنے خیالات کو اس شخص کے خیالات کے مانند نہ ہونے دے جو تیرے ساتھ برائی کرتا ہے۔ نہ تو
ایسے خیالات قبول کر جس کو وہ قبول کرانا چاہتا ہے بلکہ ہر چیز کی حقیقت پر نگاہ ڈال۔

ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں ضابطوں پر کاربند ہونے کے لئے ہم ہمیشہ ان کو پیش نظر رکھیں۔
پہلا اصول یہ ہے کہ ہمارے لئے صرف انھیں احکام کی بجا آوری لازمی ہے جن کو حکمراں اور قانون ساز
جماعت، مفاد عامہ کی خاطر نافذ کرتی ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم کو اپنا میدان عمل اس وقت بدل دینا چاہیئے
جب کوئی شخص ہماری صحیح ہدایت اور بہتر رہنمائی کر سکے۔ لیکن۔ اس تبدیلی کی بنیاد اس یقین پر ہونی چاہیئے
کہ تبدیلی مناسب یا باعث مفاد عامہ ہے۔ صرف یہ یا اسی قسم کی نیت قابل قبول ہونی چاہیئے۔ لطف و تفریح
یا شہرت کے خیال سے اس طرف کوئی توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔

کیا تو عقل رکھتا ہے؟ تو کہے گا، ہاں رکھتا ہوں۔ پھر سوال یہ ہے کہ تو اس کو استعمال کیوں نہیں کرتا

کیونکہ جب عقل کی کارفرمائی ہے تو پھر تجھے اور کیا چاہیے؟

تو دنیا میں کل کے ایک جزئی حیثیت سے آتا ہے تو جہاں سے آیا ہے وہیں واپس ہو کر لاپتہ ہو جائے گا۔ بلکہ بہترین قالب میں ڈھل جائے گا۔ اور کائنات عالم اپنے بار بار پیدا کرنے والے اصول کے مطابق تجھکو دوبارہ قبول کرے گی۔[۵۱]

خوشبودار سفوف کے بہت سے ذرات ایک ہی قربان گاہ پر چڑھائے جاتے ہیں۔ ایک ذرہ دوسرے ذرے سے ایک لحظہ بعد گرتا ہے۔ اس کی کیا اہمیت ہے؟

دس روز کے اندر ہی اندر وہ لوگ جو آج تجھے ایک قسم کا وحشی جانور یا بندر سمجھتے ہیں، تیرا خیر مقدم اس طور سے کریں گے گویا تو ایک دیوتا ہے بشرطیکہ تو اپنے فلسفہ کو قبول کرے اور عقل کے سامنے سربسجود ہو۔

ایسا طرز عمل اختیار کر گویا تیری عمر دس ہزار سال کی ہے۔ مقدر تیرے سر پر مسلط ہے۔ قبل اس کے کہ پانی سر سے گذر جائے نکوکار بنجا۔ ایسا شخص کوفت سے محفوظ رہتا ہے، جو اپنے پڑوسی کے قول فعل عمل سے بے نیاز صرف اپنے عمل صالح کی فکر رکھتا ہے۔ نکوکار کا دوسروں کے اخلاق پر تجسس کی نگاہیں نہ ڈالنا ہی اس کے شایان شان ہے بغیر دائیں بائیں دیکھے ہوئے اس کو مقصود کی طرف بخط مستقیم تیز گام ہونا چاہیے۔

۵۱؎ الاصلاح۔ حیات بعد الممات کے باب میں اس حکیم کے خیالات نہایت مبہم ہیں۔ تاہم وہ اس نادیدہ راہ میں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں سے بمراحل آگے ہے۔ لیکن ایک عامی سے عامی مسلمان بھی کتنا خوش قسمت ہے کہ وہ بفیض قرآن ان وادیوں میں دنیا کے بڑے سے بڑے حکیم کیلئے نشان منزل کا کام دے سکتا ہے والحمد للہ۔

ایسا شخص جس کی امیدیں ابقر یدی کے ساتھ آیندہ کی شہرت پر لگی ہوں وہ اس بات کو محسوس کرنے سے معذور ہے کہ ساری چیزیں جو اس کی یادگی حامل ہیں جلد فنا ہو جائیں گی اور بعد کو دوسری چیزیں ان کی جگہ لیتی رہیں گی تا آنکہ بالآخر اختتام ہو صلہ مندی۔ مختصر یاد اور فوری فنا کی نذر ہو کر یہ یاد یکسر مٹ جائے گی۔ اور فرض کیا کہ یاد اور یاد کرنے والے دونوں ایک ہی طرح غیر فانی ہیں۔ لیکن ان سے ہم کو کیا واسطہ، صرف یہی سوال نہیں ہے کہ اس کے مردوں کو کیا فائدہ؛ سوال یہ ہے کہ شہرت زندوں کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے؛ زیادہ سے زیادہ یہ کسی مقصد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان کے لئے کیا یہ موزوں و مناسب ہے کہ وہ فطرت کی فیض بخشیوں سے جو اسے عطا کی گئی ہیں، غافل ہو اور دوسروں کی رائے و بیان پر اس کا مدار ہو۔

حسن کا ہر مظہر اپنے حسن کی ابتدا، وانتہا، کا خود حامل اور تعریف و تحسین سے بالکل بالاتر ہوتا ہے۔ پس کوئی چیز تعریف و تحسین کی وجہ سے بہتر یا بدتر نہیں ہو جاتی۔ میرے خیال میں بالکل یہی بات اس صورت میں بھی صادق آتی ہے جہاں کہ حسن کا تخیل پست ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مادی اشیاء اور فنون لطیفہ کے نمونوں کو لو۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی حقیقی حسن تعریف کا محتاج ہے؟ بالکل نہیں۔ یہ تعریف سے اسی طرح بالاتر ہے جس طرح قانون، صداقت، لطف و کرم اور عفت۔ ان میں سے کون تعریف کی وجہ سے حسین اور مذمت کی وجہ سے بدصورت بن جائیگا۔ کیا زمرد کی قیمت گھٹ جاتی ہے جبکہ اس کی خوبی پر ہم سر نہ دھنیں؟ کیا سونے، ہاتھی دانت، اور پھول کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے اگر ان کو دیکھکر واہ واہ نہ کی جائے؟ کیا تلوار، شگوفہ یا پودے کی خوبی و کشش زائل ہو جاتی ہے اگر ان کی پذیرائی نعرہ تحسین سے نہ کی جائے؟

اگر روح کو بقائے دوام حاصل ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہوا میں ازل سے ساری روحوں کے لئے جگہ باقی ہے؟ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ زمین قرنوں سے اپنے مردوں کے لئے کیسے جگہ مہیا کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس طرح اس زمین میں ہمارا جسم کچھ دنوں قائم رہتا ہے اور پھر تبدیل ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور دوسرے مردہ جسموں کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ اسی طرح روحیں جو ہوا میں شامل ہو گئی ہیں کچھ دنوں تک باقی و موجود رہتی ہیں، پھر ان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ جلکر شعلہ بنجاتی ہیں اور کائنات فطرت کی بار بار پیدا کرنے والی قوت ان کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس طرح نو واردوں کے لئے ایک عالم جا و دانی موجود ہے۔ یہ کافی نہیں ہے کہ ہم صرف لاتعداد مدفون مردوں ہی کے معاملہ پر غور کریں ہم کو ان جانوروں کے بارے میں بھی غور کرنا ہے جو روزانہ انسانوں اور حیوانوں کے لقمہ بنجاتے ہیں انکی کتنی کثیر تعداد لقمہ دہن ہو کر ان جسموں میں دفن ہو جاتی ہے جن کے لئے وہ غذا بہم پہنچاتی ہے۔ ان سب کے لئے جگہ کافی ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فطرت ان کو ہمارے خون میں جذب کر دیتی ہے یا ان کو عناصر ہوا و آتش میں تبدیل کر دیتی ہے۔ [1]

اب ہم کو مادہ کی حقیقت کہاں تلاش کرنا چاہئے۔ ؟ ہر چیز کے مادی ظاہری تجزیے یہ ہیں۔

---

[1] الاصلاح :- انسانی فکر و نظر کے جس تنگ پیمانہ سے ناپ کر سوال اٹھایا گیا تھا، حکیم نے ٹھیک اسی تنگ پیمانہ سے جواب بھی ناپ دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سوال و جواب دونوں مضحکہ انگیز ہو کر رہ گئے ہیں۔ قرآنی بصیرت نہ ان کانٹوں سے کوئی خلش محسوس کرتی اور نہ ان مرہموں کی شفا بخشی کی ممنون ہوتی۔

ادبیات

آج بھی

از جناب فراق گورکھپوری

دل شکستہ قریب تمنا ہے آج بھی
اس کی نگاہ اک نئی دنیا ہے آج بھی

دیکھا تھا جس نے مجھکو زمان و مکاں سے دور
وہ آنکھ بیقرار تماشا ہے آج بھی

پھر سرخی نشاط جہاں شوخ ہو چلی
غم نیشترزنِ رگِ دنیا ہے آج بھی

مست ازل ہے عشق مگر اس نگاہ سے
جیسے کوئی پیام سا آتا ہے آج بھی

افسردگی عشق کو مدت ہوئی مگر
شعلہ سا کچھ دلوں سے لپکتا ہے آج بھی

اک رنگ پردہ رنگی عالم ازل سے ہے
اک جام صبح و شام چھلکتا ہے آج بھی

اب بھی اچھل رہا ہے لہو سا فضا میں کچھ
دار و رسن پہ عشق کا قبضہ ہے آج بھی

اک لرزشِ خفی سرِ نشتر ہے عشق میں
کاوش میں نشتر غم فردا ہے آج بھی

ہمدم میں خود نگاہ ٹھٹا نہیں مگر
اس نو بہار ناز کو دیکھا ہے آج بھی

اب وہ متاع درد ہو یا کیف یا نشاط
اس بزم میں خزانہ سا لٹتا ہے آج بھی

جوش جنوں سے قطع نظر کرکے عشق کا
سنتے ہیں قصد جانب صحرا ہے آج بھی

رنگینیوں میں غفلتِ دل کی کمی نہیں
ہستی تمام خواب زلیخا ہے آج بھی

خواب عدم، سکون ابد مل چکا مگر
شورش حیات عشق سے پیدا ہے آج بھی

یوں تو جہاں شناس وہ صبح ازل سے ہے — کھوئی ہوئی سی نرگسِ رعنا ہے آج بھی

گو ہو چکا ہے خاتمہ گفت و شنید کا — دل بیقرارِ شکوۂ بیجا ہے آج بھی

پھر شورِ انقلاب اٹھا چار سمت سے — اچھا اسی نگاہ کا قصہ ہے آج بھی

بدلے نگارخانۂ ہستی نے لاکھ رنگ — اندازِ حسنِ یار نرالا ہے آج بھی

گو جیسے دل کو زمانہ گذر گیا — وہ رہ کے خارِ عشق کھٹکتا ہے آج بھی

کہنے کا کچھ کسی سے زمانہ نہیں رہا — اک حرف سا زبان تک آتا ہے آج بھی

یوں تو فنا بقا کے منازل گذر چکے — دل ذکرِ عاشقی سے جھجکتا ہے آج بھی

اے چارہ گر سمجھ نہ سکا میں ترا سوال — زخمِ کہن وہی نہ جو دکھتا ہے آج بھی؟

نومیدیوں کی مدتِ دیرینہ پر نہ جا — اے چشمِ یار تیرا بھروسا ہے آج بھی

ہر دو ایک منزلِ معراجِ عشق ہے — درد اس نگاہِ ناز سے اٹھتا ہے آج بھی

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے — کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی!

سچ جھوٹ کی خبر تو کسے لیکن اے فراق

وہ داستان درد سناتا ہے آج بھی؟

تفسیر سورہ کافرون

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ کافرون کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین کاغذ عمدہ تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۸۴ صفحے۔ قیمت ۴ر

منیجر

تلخیصات

مسلمان برطانوی عہدِ حکومت میں

از جناب مولوی عبدالحکیم صاحب اعظمی ایم اے

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ابتداء سے مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں تباہ و نامراد رہے ہیں۔ ان کی شکایتوں اور ان کے احتجاج پر بھی کبھی دھیان نہیں کیا گیا۔ اسلامی اخبارات و رسائل اور اسلامی انجمنوں نے مسلمانوں کے احساسات کی ہمیشہ ترجمانی کی لیکن برطانوی حکام نے اس طرف سے ہمیشہ تغافل برتا۔ اور اگر کبھی کچھ کیا تو اس لئے کہ برطانوی مفاد اس کے لئے متقاضی تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسلامی مفاد کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ فرقہ وارانہ فیصلہ، جداگانہ انتخاب، نشستوں کا تحفظ، فرقہ وارانہ حق نمایندگی سب مسلمانوں سے کہیں زیادہ برطانوی اغراض و مقاصد کے لئے عمل میں آئے ہیں۔

جنگ آزادی کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے سرسید مرحوم اور ان کے ہمنواؤں نے مسلمانوں کو ہمیشہ برطانیہ کے اخلاص و ہمدردی کا یقین دلایا لیکن مسلمانوں کی شکایتیں آج بھی ٹھیک وہی اور ویسی ہی ہیں جیسی کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تھیں۔ برطانوی حکام کے مسلسل غیر ہمدردانہ رویہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ۱۸۵۷ء میں ہماری شکایتیں کیا تھیں۔

ہندوستانی مسلمان ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر (بنگال سول سروس) کی مشہور کتاب "انڈین مسلمان" شائع ہوئی۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں برطانوی حکومت اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات

پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا قطعی لاحاصل ہے کہ مسلمان ہمارے خلاف سنگین الزامات کی ایک طویل فہرست رکھتے ہیں، اتنے سنگین اور گراں وزن جو شاید ہی کسی حکومت پر عاید کئے گئے ہوں۔

فہرست شکایات ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کی شکایات اس طرح گنتے ہیں " وہ (مسلمان) ہم پر الزام رکھتے ہیں کہ ہم نے زندگی کی تمام معزز اور شاندار راہیں ان پر بند کر دی ہیں، ہمارے نظام تعلیم میں ان کی جماعت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم نے انہیں ذلت اور افلاس کا شکار بنا دیا ہے۔ قضاۃ کا عہدہ منسوخ کرکے ہم نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو ہلاکت و بربادی کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ قاضی نامعلوم زمانہ سے نکاح و طلاق کے معاملات میں شرعی فیصلے صادر کرتے اور مسلمانوں کے خانگی اور منزلی معاملات میں شرع کے آئین و ضوابط کے امین اور منتظم ہوتے۔ مذہبی فرائض کی ادائگی کے سلسلہ میں جو مشکلات ہم نے پیدا کر دی ہیں ان سے انہیں روحانی اذیت پہنچتی ہے اور سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ ان کے مذہبی مرکزوں کے ساتھ ہم نے انتہائی عیارانہ اور فریب کارانہ طرز عمل روا رکھا ہے اور ان کے تعلیمی اوقاف اور رقوم میں تصرف بیجا اور ناجائز خورد برد سے کام لیا ہے۔"

ڈاکٹر ہنٹر کو اعتراف ہے کہ (۱۸۵۷ء کے بعد) ان کے علاوہ اور بہت سی شکایتیں مسلمانوں کو پیدا ہوئیں وہ کہتے ہیں کہ انگریز جو بنگال میں ایک اسلامی حکومت کے ملازمین کی حیثیت سے اثر و رسوخ حاصل کر سکے تھے۔ اپنی فتحمندیوں اور کامرانیوں کے نشے میں کم ظرف انسانوں کی طرح اپنے آقاؤں کے حقوق فراموش کر گئے۔ القصہ مسلمان برطانوی حکومت کو ہمدردی سے تہی۔ عالی ظرفی سے محروم اور تعلیمی رقوم و اوقاف کے معاملات میں بے حد عیار و فریب کار بتاتے ہیں۔" ڈاکٹر ہنٹر آگے چلکر فرماتے ہیں کہ ایک سو ستر برس پہلے بنگال میں کسی شریف مسلمان کا مفلس و بے مایہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن اب اس کا دولتمند اور امیر ہونا غیر ممکن ہو گیا ہے۔

مسلمانوں کے وسائل دولت | برطانوی حکومت سے پہلے مسلمانوں کو عموماً فوج اور محکمۂ مال کے اعلیٰ عہدوں کی سرفرازی حاصل تھی لیکن برطانوی عہد میں یہ سارے عہدے ان سے اس لئے خالی کرائے گئے کہ ایسا کرنا ڈاکٹر ہنٹر کے خیال میں برطانوی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھا گیا۔ فوج سے مسلمانوں کا نکالا جانا ان کے نزدیک بہت بڑا معاوضہ ہے اور محکمۂ مال کے تدبیر و انتظام میں تغیر و تبدل بہت بڑی بددیانتی ہے۔ برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں سلطنت کے تمام شعبوں پر مسلمانوں ہی کا قبضہ تھا اور اسلامی شریعت کے مطابق تمام ملک میں عمل درآمد ہوتا رہا۔ سلطنت کے سارے عہدے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کے پہلے پچاس سال کے زمانہ حکومت میں اور سلطنت میں مسلمانوں کا حصہ کثیر کا تھا لیکن حالات بدلتے گئے اور اس انقلاب کی رفتار کم دنوں کی سست رفتاری کے بعد اس قدر تیز ہوگئی کہ بالآخر وہ تھوڑی کے حصہ کے بھی قابل نہیں سمجھے گئے۔

مسلمانوں کا مکمل اخراج | "سو سال گذرے" ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں "سلطنت کے تمام عہدے مسلمانوں کی ملکیت تھے ہندوؤں کا یہ حال تھا کہ ان کے مسلمان آقا جو کچھ ان کی طرف پھینک دیتے تھے شکر گذاری کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ اور انگریزوں کو صرف کلرکی کی کچھ جگہیں حاصل تھیں۔ لیکن اب کیا حال ہے؟ یہ حال ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی نسبت ½ عہدے حاصل ہیں، ہندوؤں کو انگریزوں کے مقابلہ میں اضعاف اور مسلمانوں کو انگریزوں کے مقابلہ میں ½ سے بھی کم۔ یہ ہے عہدوں کا تناسب۔ سو برس پہلے جو قوم اپنے ہاتھوں میں زمام حکومت رکھتی تھی آج دوسری اقوام کے مجموعی مقابلہ میں صرف حصہ کی مالک ہے۔ یہ تناسب بھی صرف گزٹڈ عہدوں کا ہے جہاں اس کا خاص خیال رکھا جاتا ورنہ ضمنی عہدوں میں مسلمانوں کو یہ تناسب بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ ہے مسلمانوں کے اخراج کی حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ میں مشکل سے کوئی ایسا گورنمنٹ آفس ہوگا کہ جس میں کوئی مسلمان، بیروں، دوات میں روشنائی بھرنے والوں، قلموں کے درست کرنے والوں کی جگہ سے بہتر جگہ حاصل کر سکے

فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تغیر و انقلاب کے اسباب کیا ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں کہ تعلیم عامہ سے متعلق ہمارا نظام، جس نے ہندو سوسائٹی کو صدیوں کے خواب گراں سے بیدار کر کے ان کے دلوں کو قومیت کے شریفانہ جذبات و احساسات سے معمور کر دیا ہے، مسلمانوں اور مسلمانوں کے مذہب کے نزدیک سخت ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔ برطانوی حکومت سے پہلے مسلمان ہندوستان میں اپنا ایک مخصوص نظام تعلیم رکھتے تھے جو علمی درجے کی علمی قابلیت اور ذہنی نشو و نما کے لئے بالکل کافی تھا۔ اگرچہ نظام بالکل بے عیب نہ تھا تاہم تمام پرانے نظام تعلیم کے مقابلہ میں برتر اور افضل تھا۔ برطانوی اقتدار کے ابتدائی بچھتر سالوں میں یہی نظام برقرار رکھا گیا۔ مقصد صرف تھا کہ امور سلطنت کی انجام دہی کی خاطر افسر مہیا ہو سکیں لیکن اسی اثنا میں ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں کہ تعلیم عامہ کا ایک خاص نظام ہم نے بطور خود تیار کر لیا اور جونہیں جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک گروہ ہمارے سامنے آیا ہم نے قدیم نظام سے جان چھڑائی اور مسلمان نوجوانوں نے دیکھا کہ پبلک لائف کے سارے دروازے ایک ایک کر کے ان پر بند ہو گئے۔

تعلیمی اوقاف میں تصرف بیجا نہ صرف یہ بلکہ پرانے نظام کو قطعی طور پر ختم کر دینے کے لئے وہ تمام اوقاف اور گراں قدر رقمیں جو مسلمانوں نے تعلیمی مقاصد کے لئے مخصوص کی تھیں، ضبط کر لی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں مسلمان خاندان برباد ہو گئے اور اسلامی نظام تعلیم کی بنیاد تک اکھڑ گئی اور ضبط شدہ رقوم اور اوقاف پوری بیدردی کے ساتھ جدید نظام تعلیم اور غیر مسلموں کی تعلیمی ترقی میں صرف ہونے لگے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے اصل حقیقت پر کسی قدر روشنی پڑے گی۔

دردناک داستان ۱۸۰۶ء کا واقعہ ہے۔ ہگلی میں ایک کروڑپتی مسلمان کا انتقال ہوا اس نے اپنی جائداد مذہبی اور دینی مقاصد، مسجدوں کی مرمت، طلبہ کی اعانت، اور علما کے وظائف کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اپنی زندگی ہی میں وقف کے دو معتمد بنا دیئے تھے۔ اور جائداد کے علاوہ کثیر دولت ان کے حوالے کر گیا تھا۔ لیکن یہ معتمد باہم لڑ گئے۔ شدہ شدہ بات انگریزی عدالت تک پہنچی۔ ۱۸۱۶ء میں حکومت نے

دونوں معتمدوں کو برخاست کر دیا۔ ایک معتمد کی جگہ انگریزی حکومت نے خود لے لی اور دوسرے کی جگہ
ایک شخص کو نامزد کر دیا۔ ڈاکٹر ہنٹر فرماتے ہیں "لیکن دوسرے ہی سال حکومت نے پوری جائداد ٹھیکہ
پر دے ڈالی اس طرح ایک کثیر رقم بطور معاوضہ کے ٹھیکہ داروں کو ملنے لگی۔ ۱۸۰۶ء سے لیکر ۱۸۱۶ء
کی آمدنی ایک لاکھ پانچ ہزار سات سو پونڈ تھی (۱۰۵۷۰۰۰ روپے) علاوہ ازیں سالانہ خرچ
کے بعد بارہ ہزار پونڈ ۱۸۱۶ء میں بچ رہتے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے اس وقف میں اس طرح
گڑبڑ کی کہ سرے سے اس کے تمام مقاصد ہی فوت ہو گئے۔ حکومت نے اس رقم سے ایک انگریزی
کالج کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر ہنٹر فرماتے ہیں کہ ایک ایسی جائداد سے جو دینی مصارف کے لئے وقف کی جا چکی
تھی حکومت نے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھی جو بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات سے مختلف تھا۔ اس طرح
مسلمان اس وقف کے فوائد سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے گئے"

ڈاکٹر ہنٹر کے یہ الفاظ یاد رکھنے کے لائق ہیں کہ برطانوی حکومت کے بیجا تصرفات کی داستان
کو طول دینا درد انگیز اور سخت تکلیف دہ ہے اس لئے کہ حکومت کی ہیبت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا
جا سکتا۔ یہ ہے ہندوستان میں اسلامی مفاد پر برطانوی نگاہِ کرم کی داستان !!

(ماخوذ از جریدہ اسلام انگریزی)

سندھ کے اسلامی آثار

ماہرین طبقات الارض کی تحقیقات نے سندھ کی اسلامی حکومت کے زمانہ کے بعض قیمتی ذخیروں کا پتہ لگایا ہے۔
اگرچہ عرب فاتحین کا چھوڑا ہوا ذخیرہ مقدار میں کچھ بہت زیادہ نہیں ہوتا ہم تاریخی نقطۂ نظر سے جدید معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے
ٹھٹھہ اور میکلی کے درمیان جو کتبات دستیاب ہو سکے ہیں انکی مجموعی تعداد ۱۵۶ ہے۔ ان کتبات میں تقریباً ان
تمام مسلمان خاندانوں کا ذکر آیا ہے جنکا دار السلطنت ٹھٹھہ رہا ہے اور جنھوں نے چودھویں صدی عیسوی کے وسط

سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک سندھ پر حکمرانی کی ہے۔ انتظام کیا جارہا ہے کہ ان کتبات کو مناسب تاریخی ترتیب کے ساتھ ساتھ شائع کر دیا جائے، محکمۂ طبقات الارض کا خیال ہے کہ ان کتبات کے متعلق ایک الگ کتاب بھی لکھوائے۔

پچاس سے زیادہ کتبات کی نقل یا فوٹو دوسری جگہوں سے حاصل کئے گئے ہیں، روہڑی اور حیدرآباد میں زیادہ سے زیادہ ہیں۔ کارپردازان محکمۂ آئندہ جاڑے کے موسم میں دوبارہ اسلامی کتبات کی تلاش و تحقیق کا کام شروع کر دینگے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سندھ کی اسلامی حکومت سے متعلق ۱۰۰ کتبات تک دستیاب ہو سکیں گے۔ یہ بھی امید ہے کہ متوقع تعداد کی نصف ٹھٹھہ اور مکلی کی پہاڑیوں ہی سے حاصل ہو سکے گی۔ جہاں تک سندھ کے آثار قدیمہ کا تعلق ہے سندھ کی تاریخ تین دوروں میں تقسیم کی جا سکتی ہے، جن میں بجائے خود ہر ایک عظیم الشان اور نہایت درخشاں ہے اور ہر ایک سے متعلق نہایت قیمتی اور بیش بہا آثار روشنی میں آچکے ہیں۔

سندھ کی تاریخ میں عربوں کی فتح سے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۸۷۹ء میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے سندھ کے ابتدائی مسلم حکمرانوں سے متعلق وہ تمام کتبات شائع کر دیئے جو سکر، ٹھٹھہ اور دوسرے مقامات سے حاصل ہو سکے تھے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں آرکیالوجیکل سروے کی طرف سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سندھ کے قدیم دارالخلافوں، منصورہ اور برہمن آباد میں جو کھدائی کا کام ہوا ان سے سندھ کے عرب فاتحین اور مقامی باشندوں کی طرز تمدن اور معاشرت پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد ایک کتاب سندھ کے آثار قدیمہ کے نام سے شائع ہوئی اس کتاب سے بھی سندھ کی اسلامی حکومت پر ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے سندھ کے ابتدائی عرب فاتحین کو مغلوں کی طرح عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر کا شوق نہ تھا۔ اسی لئے ان کے آثار چند مقبروں کے کتبات کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔ ٹھٹھہ کے پاس مکلی کی پہاڑی میں بھی سروے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اور متعدد کتبات کی نقل حاصل کر لی گئی ہے۔ اس طرح تحقیق کا کام ابتدا سے اب تک برابر جاری رکھا گیا ہے۔

(لائٹ)

تقریظ وتبصرہ

یار ثانی:- مؤلفہ خاں صاحب محمد ظفر ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی وکیل تقطیع جیبی۔ ضخامت ۱۸ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ معمولی۔ قیمت مع مصارف ڈاک صرف ار۔ پتہ:- انجمن رفیق الاسلام گوڑگانوہ، پنجاب

انجمن رفیق الاسلام چند برس سے، خاموشی کے ساتھ مسلمانوں کی نہایت مفید اصلاحی وتبلیغی خدمت انجام دے رہی ہے سلک مروارید کے نام سے سال کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے مفید رسالے شائع کرتی ہے۔ بعض کا تعارف ان صفحات میں ہو چکا ہے۔ یار ثانی اسی سلسلہ کی سولھویں کڑی ہے۔ اس میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے حالات زندگی کو صحت وجامعیت کے ساتھ عام فہم اور دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو لوگ حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت کے ضخیم اور قیمتی نسخوں سے فائدہ اٹھانے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اس کتاب کی قدر کریں اور مناسب ہوگا کہ ذی مقدرت حضرات اس کی زیادہ سے زیادہ کاپیاں منگوا کر غریبوں اور غیر مسلموں میں مفت تقسیم کریں۔

طلوع اسلام:- اڈیٹر جناب حکیم زکی احمد خاں وجناب محمد عثمان۔ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۸۰ صفحے۔ کتابت وطباعت، کاغذ عمدہ سرورق جاذب نظر" بدل اشتراک" عہ سالانہ۔ پتہ:- دفتر طلوع اسلام دہلی۔

یہ رسالہ پہلے لاہور سے جناب سید نذیر نیازی جامعی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کے حقوق اشاعت دہلی کی ایک اہل علم جماعت کے ہاتھوں میں آگئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب یہ کامیابی کے ساتھ نکل سکے گا اور ترقی کریگا۔

نئے اہتمام میں رسالہ کے دو نمبر شائع ہوئے ہیں۔ اس دور جدید کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت

یہ ہے کہ اب یہ رسالہ "مرکز ملت" کا نقیب اور "جماعت" کا ترجمان ہے۔ اس کے سرورق پر اطیعو اللہ واطیعوا الرسول کی تشریح "مرکز ملت" سے کی گئی ہے ہم اب تک ان الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ شاید آہستہ آہستہ یہ اسرار روشنی میں آئیں۔ لیکن کبھی کبھی جی ڈرتا ہے کہ مبادا یہ اس آواز کی صدائے بازگشت ہو جو کچھ عرصہ ہوا پنجاب سے اٹھی تھی۔ اگر ہمارا گمان صحیح ہے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ شروع کے سریلے نغمے بعد میں بہت ہولناک چیخ میں بدل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارا یہ گمان غلط ثابت ہو۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ نئی جماعت رسالہ کی ترقی پر کافی محنت صرف کر رہی ہے۔ بعض .... مضامین اچھے ہوتے ہیں۔ البتہ مضامین پر موسم کا اثر بہت ہے۔ ترتیب میں بھی خامیاں ہیں اور بعض عنوانات مثلاً "تکلف برطرف" وغیرہ تو صرف اخباری کالموں کے لئے موزوں ہیں۔ رسائل کو اس طرح کی خردہ گیریوں اور اس قسم کے انداز تحریر سے بلند ہونا چاہئے ورنہ اخبارات کیلئے کیا بچ رہے گا!

پیام اسلام:- اڈیٹر جناب عبدالحق عباس و محمد احمد خاں ذاکر۔ تقطیع $\frac{20\times 30}{16}$ حجم ۲۰ صفحے۔ کتابت و طباعت، کاغذ متوسط۔ چندہ سالانہ ۱ روپے۔ پتہ: انجمن اشاعت اسلام، جالندھر۔

یہ ایک تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ ہے اس میں عموماً چھوٹے چھوٹے مفید اصلاحی مضامین اور موثر قومی نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے اندر کوئی خاص ترتیب نہیں ہے۔ صرف یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ مضامین اصلاحی اور نظمیں قومی ہوں۔ نظموں میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ آخر میں رسالہ کے مخصوص صفحات کے علاوہ تقریباً ۲۰ صفحے میں ترجمہ قرآن مجید ایک نئی اور نہایت مفید ترتیب سے لکھا جاتا ہے۔ جس سے عام مسلمان اور عربی زبان سے ناواقف طلبہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرآن مجید کے ترجمہ کے سمجھنے میں بڑی دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ان کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس لفظ کے کیا معنی ہیں۔ اس رسالہ میں اس مشکل کو حل کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے پوری آیت بخط جلی لکھی جاتی ہے۔ پھر آیت کے تمام ٹکڑے خطوط کے اندر ذرا خفی لکھے جاتے ہیں اور اسی ترتیب سے سب کا الگ الگ ترجمہ بھی۔

سکے آخر میں آیت کا مکمل اور رواں ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ امید ہے قرآن سے ذوق رکھنے والے مسلمان اس سلسلے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

الارشاد :- اڈیٹر جناب سید عبد المجید شاہ بخاری۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۴۰ صفحے کتابت و طباعت صاف ستھری، کاغذ معمولی رف۔ قیمت سالانہ ۱۲؍ طلبہ کے لئے ۱۰؍ پتہ:- دائرۃ الارشاد، امرتسر (پنجاب)

یہ رسالہ بھی تبلیغ و اصلاح کی غرض سے جاری ہوا ہے، اس کے پیش نظر دو مقصد ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کو کتاب و سنت کے ساتھ تمسک اور اتباع سلف صالحین کی دعوت دینا۔

۲۔ اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے حملوں کی مدافعت اور مسلمانوں کو مغربیت کے جراثیم سے بچانے کی کوشش کرنا۔

اس وقت تک اس رسالہ کے جتنے نمبر شائع ہوئے ہیں۔ ان سب میں ان بلند مقاصد کو باحسن طریق پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کی توجہ بیرونی دشمنوں سے زیادہ اسلام کے اندرونی دشمنوں پر ہے۔

خالد :- اڈیٹر مولوی سید احمد (فاضل دیوبند) تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۴۰ صفحے۔ کتابت و طباعت روشن کاغذ متوسط۔ قیمت سالانہ ۱۲؍ پتہ :- دفتر خالد دیوبند۔ ضلع سہارنپور۔

یہ رسالہ دارالعلوم دیوبند کے بعض اکابر کی نگرانی میں جاری ہوا ہے۔ اس وقت تک اس کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مضامین کا معیار اتنا بلند ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانا مشکل ہو نہ اتنا پست کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ایسے مذہبی و اصلاحی مضامین لکھے جائیں جسے عام و خاص دونوں پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں۔ بعض باتیں قابل اصلاح ہیں جو اس کے محترم سرپرستوں کی توجہ سے انشاء اللہ دور ہو جائیں گی۔ خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ لائق توجہ بات یہ ہے کہ اس کے تینوں نمبروں میں بعض مضامین ایسے شائع ہوئے ہیں جو اس سے پیشتر بارہا شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً

ایک مضمون ہے "انسانیت موت کے دروازہ پر"۔ یہ مضمون الہلال کے دوسرے دور میں شائع ہو چکا ہے کارکنان خالد نے اس کے ایک جز کو اپنا لیا ہے اور باسم ادارہ شائع کر دیا ہے۔ یہ طریقہ اچھا نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے نمبر میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا وہ مکتوب جو الکشن کی ہما ہمی کے اختتام اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ سے علیحدگی کے بعد عام طور سے تمام اخبارات میں شائع ہو چکا تھا۔ ڈیڑھ دو مہینہ کے بعد ایک ایسے نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتوب کی اشاعت سب سے پہلے خالد کے حصہ میں آئی ہے۔ حالانکہ یہ بات نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

تیسرے نمبر میں حضرت امام الہند مولانا آزاد کا مضمون "تذکار ولادت نبوی صلعم" تقریباً پورے رسالہ پر محیط ہے۔ یہ مضمون بھی ایک ایسے مبہم نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ جس سے ایک ناواقف اس دھوکہ میں پڑ سکتا ہے کہ مولانا آزاد نے خاص خالد کے لئے اس زمانہ میں اس کے لکھنے کی زحمت برداشت کی ہے۔ حالانکہ یہ مضمون ۱۹۱۲ء کے الہلال سے لیکر آج تک نہ معلوم ہندوستان کے کتنے اخبارات و رسائل میں کتنی بار شائع ہو چکا ہے۔ بلکہ رسالہ کی شکل میں علیحدہ بھی چھپکر بازاروں میں بکتا ہے۔

مطبوعہ مضامین سے اخذ و اقتباس یا ان کی دوبارہ اشاعت میں چنداں مضائقہ نہیں ہے لیکن صحافت کی ذمہ داریوں سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے لوگوں کی نظروں میں رسالہ کا وقار نہیں قائم ہوتا ہے۔ امید ہے کارکنان خالد ان باتوں کا خیال رکھیں گے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ رسالہ پر دار العلوم دیوبند کے بعض اساتذہ کا نام ہوتا ہے۔

محدث اڈیٹر جناب مولوی نذیر احمد املوی رحمانی۔ تقطیع ۲۲×۲۹/۸ حجم ۴۴ صفحے۔ کتابت و طباعت پاکیزہ، کاغذ متوسط، قیمت سالانہ ہے/ پتہ :- دار الحدیث رحمانیہ دہلی۔

یہ رسالہ دار الحدیث رحمانیہ کا ماہوار آرگن ہے۔ دار الحدیث کے طلبہ و اساتذہ اس کو بڑی محنت سے مرتب کرتے ہیں اور ہر ماہ ملک کے سامنے علمی و مذہبی مضامین کا اچھا خاصہ مجموعہ پیش کرتے ہیں

اس رسالہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کم قیمت مضامین کے باوجود سب سے سستا رسالہ ہے۔ ملک میں ادبی کم قیمت رسائل ہیں لیکن ان کے اندر مضمون ڈھونڈنے تو مشکل ہی سے ایک آدھ فرسودہ مضمون نکلے گا۔ ان کی ساری بساط پردہ داروں کے اشتہارات پھیلے ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ اس طرح کے حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے۔ اور اس لحاظ سے کارکنان دار الحدیث کا یہ ایثار نہایت حیرت انگیز ہے۔

الاصلاح مصور اڈیٹر جناب علی جان۔ تقطیع ۲۰x۳۰ حجم ۴۰ صفحے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر کاغذ معمولی۔ قیمت مرقوم نہیں۔ اسماعیل پرنٹنگ پریس۔ ڈونگری بمبئی۔

یہ ہفت روزہ اخبار تقریباً تین مہینے سے نہایت باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ فرقہ اسماعیلیہ کا ترجمان ہے اور سیاست میں "صلح کل" پالیسی کا حامی۔ ابتداً اردو کے ساتھ ساتھ چند صفحے انگریزی کے بھی ہوتے تھے۔ اب انگریزی کے بجائے گجراتی کے ہیں۔ مضامین کا معیار بمبئی کے اور ہفتہ وار اخبارات سے بلند نہیں ہے۔ لیکن جدت و تنوع کافی ہے۔

جنگو کی بلی مصنفہ مولوی عبد الواحد سندھی۔ استاذ مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ تقطیع ۲۰x۲۶/۱۶ ضخامت ۴۰ صفحے کتابت و طباعت عمدہ۔ کاغذ سفید دبیز۔ قیمت ۲ر۔ پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مصنف نے اس کتاب میں چھوٹے بچوں کی خاص زبان اور ان کے مخصوص لب و لہجہ میں ایک بلی کی نہایت دلچسپ کہانی بیان کی ہے۔ تیلی کا نام گنگو تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ زنگو، منگو، جنگو۔ گنگو نے مرتے وقت تینوں کو بلایا۔ اور زنگو کو کولھو، بیل، منگو کو گدھا۔ اور جنگو کو ایک خوبصورت سی بلی دی۔ سب نے باپ کے مرنے کے بعد اپنے اپنے کام میں خاطر خواہ ترقی کی۔ لیکن جنگو کی بلی نے جنگو کو جس مرتبہ پر پہنچایا اور اس نے جو جو کارنامے دکھلائے وہ بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔ چھوٹے بچے اس کو پڑھکر بہت خوش ہونگے۔

رجسٹرڈ نمبر ۹۰۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اسکی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہونگے ان کو دائرہ کا رسالہ الاصلاح اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچیس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح بشکریہ پیش کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپئے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپئے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

محمد لاحسن طابع و ناشر نے الاصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں چھاپ کر شائع کیا